آج

۶۵

لیلیٰ العلمی
افضال احمد سید

ژاں ماری گستاو لکلیزیو
معین ربانی

خالد طور
علی اکبر ناطق
اصغر وجاہت

ترتیب

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آج

ادبی کتابی سلسلہ شمارہ 65

نومبر 2009

سالانہ خریداری:

پاکستان: ایک سال (چار شمارے) 500 روپے (بشمول ڈاک خرچ)

بیرون ملک: ایک سال (چار شمارے) 60 امریکی ڈالر (بشمول ڈاک خرچ)

رابطہ:

پاکستان: آج کی کتابیں، 316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400

فون: 35650623 35213916

ای میل: ajmalkamal@gmail.com

دیگر ممالک:

Dr. Baidar Bakht, 21 White Leaf Crescent, Scarborough,
Ontario M1V 3G1, Canada.
Phone: (416) 292 4391Fax: (416) 292 7374
E-mail: bbakht@rogers.com

Scanned with CamScanner

ترتیب

لیلیٰ العلمی

7

امید اور دوسرے خطرناک مشاغل

(ناول)

❁

افضال احمد سید

153

بونیر اسٹریٹ کی رقاصہ

اہم جغرافیائی محل وقوع

زمین کا نمک

پائریز یعنی ہم

❁

معین ربانی

159

ایک نئے فلسطین کا جنم

❁

Scanned with CamScanner

ژاں ماری گستاو لکلیزیو

181

پیراڈاکسوں کے جنگل میں

⊛

خالد طور

181

ڈھانچہ

⊛

علی اکبر ناطق

213

قائم دین

⊛

جودھ پور کی حد

227

اصغر وجاہت

235

اوسر میں ببول

Scanned with CamScanner

ساری تعلیمات
246

بچوں والی گاڑی
254

Scanned with CamScanner

نئی کتابیں

آج
(پہلی جلد)
ترتیب: اجمل کمال
Rs.795

ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ
ارشد محمود
Rs.200

منتخب مضامین
(تنقید و تحقیق)
نیر مسعود
Rs.280

کافکا کے افسانے
(افسانے)
نیر مسعود
Rs.70

شہزادہ احتجاب
(ناول)
ہوشنگ گلشیری
فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال
Rs.70

مٹی کی کان
(کلیات)
افضال احمد سید
Rs.500

درخت نشین
(ناول)
اتالو کلوینو
انگریزی سے ترجمہ: راشد مفتی
Rs.175

خودکشی کے موسم میں
(شاعری)
زاہد امروز
Rs.120

Scanned with CamScanner

لیلیٰ العلمی

امید اور دوسرے خطرناک مشاغل

انگریزی سے ترجمہ

محمد عمر میمن

Scanned with CamScanner

لیلیٰ العلمی (Laila Lalami) کا تعلق مراکش سے ہے۔ وہ رباط میں پیدا ہوئیں اور مراکش، برطانیہ اور امریکہ میں تعلیم پائی۔ اب امریکہ کی ریاست اوریگون میں رہتی ہیں اور انگریزی میں کہانیاں لکھتی ہیں۔ Hope and Other Dangerous Pursuits ان کا پہلا ناول ہے جس کا ترجمہ آئندہ صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ ناول 2005 میں شائع ہوا اور اس کا اردو ترجمہ محمد عمر میمن نے کیا ہے جن کے نام اور کام سے آج کے پڑھنے والے بخوبی واقف ہیں۔ امید اور دوسرے خطرناک مشاغل میں لیلیٰ العلمی نے چار مراکشی باشندوں کی زندگی کی کہانیاں سنائی ہیں جو مختلف محرکات کے زیر اثر اور بہتر زندگی اور آزادی کی امید میں بڑے جوکھم اٹھا کر غیر قانونی طور پر مراکش سے اسپین نقل مکانی کا فیصلہ کرتے ہیں۔ ان چار کرداروں کی کہانیوں کے ذریعے مراکش کے موجودہ معاشرے، اس کے تضادات اور آمریت، معاشی بدحالی اور سماجی انتشار کے نتیجے میں تباہ ہوتی ہوئی انسانی زندگیوں کا ایک مرقع سامنے آتا ہے۔ آپ کو اس مرقعے میں بہت سی چیزیں مانوس محسوس ہوں گی۔

Scanned with CamScanner

سفر

چودہ کلومیٹر۔ گزشتہ سال میں مراد اس عدد پر سینکڑوں بار غور کر چکا ہے، اس فیصلے کی کوشش میں کہ آیا خطرہ مول لینے کے قابل ہے۔ بعضے دن وہ اپنے سے کہتا کہ فاصلے کی کوئی اہمیت نہیں، بس ایک ذرا سی زحمت ہی تو ہے، اگر موسم اچھا ہوا تو پار کرنے میں تیس منٹ جتنی کم مدّت لگے گی۔ وہ گھنٹوں اس پر غور کرتا کہ دوسری طرف پہنچنے کے بعد کیا کرے گا— کام دھندے، کار، اور گھر کا تصور کرتا۔ بعض دوسرے دن وہ صرف ساحل پر پہرا دینے والوں، برف جیسے سرد پانی، رقم جو اسے قرض لینی پڑے گی، انھیں کے بارے میں سوچ پاتا اور اس پر حیرت کرتا کہ چودہ کلومیٹر کس طرح صرف دو ملکوں ہی کو نہیں، بلکہ دو کائناتوں کو بھی ایک دوسرے سے جدا کر سکتے ہیں۔

آج رات سمندر پُرسکون نظر آ رہا ہے، صرف کبھی کبھار ہلکی سی ہوا چلتی ہے۔ کپتان نے حکم دیا ہے کہ تمام روشنیاں بجھا دی جائیں، لیکن چاند کی موجودگی اور مطلع صاف ہونے کی بنا پر مراد اپنے اردگرد پھر بھی دیکھ سکتا ہے۔ چھ میٹر کی ربڑ کی مدوّر زوڈیک (Zodiac) پھولن کشتی میں صرف آٹھ آدمیوں کی گنجائش ہے۔ اس وقت اگرچہ اس میں تیس افراد ٹھنسے ہوئے ہیں، مرد، عورت، اور بچے؛ ان سب کے چہروں پر تشویش کا وہی رنگ ہے جو ان لوگوں کے چہروں پر ہوتا ہے جن کی تقدیر کسی اور — کپتان، ساحل پر ایستادہ سنتری، خدا— کے رحم و کرم پر ہو۔

مراد کے جسم پر کپڑوں کی تین تہیں چڑھی ہیں: بنیان، ٹرٹل نیک، جیکٹ، حرارت روک زیر جامہ، جینز، اور کریچ کے جوتے۔ صرف تین گھنٹے کی پیشگی اطلاع پر اسے اتنا وقت نہیں مل سکا کہ پانی روک پتلون مہیا کر سکے۔ وہ اپنی گھڑی کا ایک بٹن دباتا ہے، ایک نقلی رولیکس جو اس نے طنجہ (Tangier) میں ایک پھیری والے سے خریدی تھی، اور پردے پر 3.15 AM کے ہندسے روشن ہو جاتے ہیں۔ وہ کلائی پر جہاں دھات کے کڑے کا نشان ہے کھجاتا ہے، پھر آستین گرا کر گھڑی کو

Scanned with CamScanner

ڈھانپ لیتا ہے۔ اپنے اردگرد دیکھتے ہوئے وہ اس پر حیرت کیے بغیر نہیں رہتا کہ اس سفر سے کپتان رحال اور اس کے گھ جوڑیوں کی ٹولی کی کتنی کمائی ہوگی۔ اگر دوسرے مسافروں نے بھی اتنی ہی رقم دی ہے جتنی مراد نے، تو ایک ہی بار میں کل تقریباً چھ لاکھ درہم ان کے ہتھے چڑھ جائیں گے، جو مراکش کے کسی ساحلی شہر، جیسے اصیلہ یا کابو نیگرو، میں ایک اپارٹمنٹ یا ایک چھوٹے سے مکان کے لیے کافی ہوں۔

وہ ہسپانوی ساحل کی لکیر کو دیکھتا ہے جو ہر سانس کے ساتھ قریب تر آتی جا رہی ہے۔ موجیں سیاہی کی طرح کالی ہیں، سوائے کہیں کہیں سفید جھاگ کے شاہے کے، جو چاندنی کی چھوٹ سے قبرستان کی الواحِ مزار کی طرح دمک اٹھتا ہے۔ مراد اس شہر کے آثار پہچان رہا ہے جس کی طرف ان کا قصد ہے — طریفہ (Tarifa)۔ خشکی کے قطعے کا وہ نقطہ جہاں سے مُور (Moors) سنہ 711ء میں حملہ آور ہوئے تھے۔ مراد تفریحی سیر و سیاحت کرنے والوں کو توضیح کے طور پر طارق ابن زیاد کے چٹکلے سناتا تھا: کس طرح وہ ایک زبردست مُور فوج کی قیادت کرتا ہوا اسے آبنائے کے پار لے گیا اور جبل الطارق (Gibraltar) پر اترنے کے بعد حکم دیا کہ ساری کشتیاں جلا دی جائیں۔ اس نے اپنے سپاہیوں سے کہہ دیا تھا کہ آگے بڑھ کر دشمن کو شکست دیں یا پسپا ہو کر بزدل کی موت مریں۔ لوگوں نے اپنے جرنیل کا اتباع کیا، ویزی گوتھ (Visigoths) کا تختہ الٹ دیا، اور ایک سلطنت کی بنا ڈالی جو ہسپانیہ پر سات سو برس سے زیادہ عرصے تک حکمراں رہی۔ انھیں اس کا سان گمان بھی نہ ہوگا کہ ایک دن ہم پھر لوٹ آئیں گے، مراد سوچتا ہے۔ بس اس فرق کے ساتھ کہ جنگی بیڑے کے بجائے اب ہم ربڑ کی پھولن کشتی میں سوار ہیں — صرف مُور ہی نہیں بلکہ سابقہ نوآبادیوں کا اچھا خاصا معجونِ مرکب — نہ ہاتھ میں توپ تفنگ یا زرہ بکتر، نہ قیادت کو کوئی ولولہ انگیز سردار۔

بایں ہمہ، مراد اپنے سے کہتا ہے، یہ جوکھم اٹھانے کے قابل ہے۔ کچھ وقت اس بودی کشتی پر، بعد ازاں نوکری چاکری۔ شروع شروع میں کافی زحمت اٹھانی پڑے گی۔ وہ کھیتوں میں اور دوسروں ہی کی طرح کام کرے گا، ساتھ ساتھ کوئی بہتر کام بھی ڈھونڈتا رہے گا۔ وہ اوروں جیسا نہیں — اس کے پاس منصوبہ ہے۔ وہ ہسپانیوں (Spagnol) کی خاطر اپنی کمر نہیں توڑے گا، اپنی بقیہ زندگی ان کے لیے نارنگیاں اور ٹماٹر چننے میں نہیں گنوائے گا۔ وہ ایک پکا کام ڈھونڈے گا، جہاں وہ اپنی مشق اور

تجربے کا استعمال کر سکے۔ اس کے پاس انگریزی کی ڈگری ہے۔ اس کے علاوہ وہ بڑی روانی سے ہسپانوی بھی بولتا ہے، بعض غیر قانونی تارکین وطن (harragas) کے برخلاف۔

اس کی ٹانگیں سن پڑنے لگی ہیں۔ وہ اپنے ٹخنے کو گول گول حرکت دیتا ہے۔ اس کے بائیں طرف لڑکی (اس کے خیال میں اس کا نام فاطن ہے) تھوڑا سا پہلو بدلتی ہے۔ اس طرح کہ اس کی ران اب اس کی ران کو نہیں دبا رہی۔ وہ اٹھارہ سال کی لگتی ہے، شاید انیس کی ہو۔ "میری ٹانگ سو گئی تھی،" وہ سرگوشی میں کہتا ہے۔ فاطن سر ہلا کر تسلیم کرتی ہے لیکن اس کی طرف دیکھتی نہیں۔ وہ اپنے سیاہ کارڈیگن کو اپنے سینے کے گرد تختی سے کستی ہے اور اپنے نیچے اپنے جوتوں کو گھورنے لگتی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اس قسم کے سفر پر اپنے سر پر حجاب کیوں ڈالے ہوئے ہے۔ کیا اس کا خیال ہے کہ وہ لوگوں کی توجہ میں آئے بغیر طریقہ میں سڑک پر حجاب باندھے چل سکتی ہے؟ پکڑی جائے گی، مراد سوچتا ہے۔

پیچھے ریتیلے ساحل پر، دور جاتے کہ وہ سب رحال کے تیار ہونے کے منتظر تھے، فاطن اکیلی بیٹھی رہی، سبھوں سے دور، جیسے بسور رہی ہو۔ کشتی میں وہ سب کے آخر میں سوار ہوئی تھی، اور مراد کو اس کے لیے جگہ بنانے کے لیے کھسکنا پڑا تھا۔ وہ اس کے تذبذب کی وجہ نہ سمجھ پایا۔ یہ ممکن نہیں کہ اس نے اتنی بہت سی رقم ادا کی ہو اور اس کے باوجود وقت آنے پر کوچ کرنے کی مشتاق بھی نہ ہو۔

مراد کے سامنے عزیز بیٹھا ہوا ہے۔ وہ بلند قامت اور مریل سا ہے اور یوں کمر جھکائے بیٹھا ہے کہ اپنے حصے میں آنے والی تنگ سی جگہ میں سما سکے۔ آبنائے جبرالٹر کے پار جانے کی یہ اس کی دوسری کوشش ہے۔ اس نے مراد کو بتایا کہ سفر کی لاگت کے سلسلے میں اسے رحال سے خاصا مول تول کرنا پڑا تھا: اس نے حجت کی کہ دوسری بار ٹکٹ بنتے پر رعایت ملنی چاہیے۔ مراد نے بھی بھاؤ تاؤ کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن آخر میں اسے اپنے چچا سے تقریباً بیس ہزار درہم قرض لینے ہی پڑے، اور یہ قرض اب پھر اس کی سوچ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ خیر، بس کام ملنے کی دیر ہے، وہ چچا کا قرض جلد از جلد اتار دے گا۔

عزیز تھوڑا سا پانی مانگتا ہے۔ مراد اپنی سیدی حرازم (Sidi Harazem) کی بوتل حوالے کر دیتا ہے اور اسے ایک گھونٹ لیتے دیکھتا ہے۔ جب بوتل اسے واپس ملتی ہے تو وہ بچا کھچا پانی فاطن

کو پیش کرتا ہے، لیکن وہ انکار میں سر ہلا دیتی ہے۔ مراد سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنے جسم کو آبیدہ رکھے، اس لیے وہ سارا دن پانی پیتا رہا ہے۔ اسے پیشاب کرنے کی فوری حاجت محسوس ہوتی ہے اور وہ اسے دبانے کے لیے آگے کو جھکتا ہے۔

عزیز کے برابر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی بیٹھا ہے جس کے بال تیل سے چپڑے ہوئے ہیں اور گال پر ایک سرے سے دوسرے تک زخم کا نشان ہے، فلم اسکار فیس (Scarface) میں اداکار ایل پچینو کی طرح۔ وہ جینز اور آدھی آستین کی قمیص پہنے ہوئے ہے۔ مراد نے اسے کسی کو یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ وہ ٹینس سکھاتا ہے۔ اس کے بازو کسرتی ہیں، پٹھے خوب ابھرے ہوئے ہیں، لیکن اس کے جسم سے مترشح توانائی خاصی اجڈ ہے، جیسے کسی ایسے آدمی کی ہوتی ہے جس کا قانون سے اکثر سابقہ پڑتا رہا ہو۔ یہ بات مراد کی توجہ میں آتی ہے کہ اسکار فیس اس کے برابر بیٹھی ہوئی لڑکی کو مسلسل ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے۔ وہ کوئی دس سالہ نظر آ رہی ہے، لیکن اس کے چہرے پر اس سے بڑی عمر کی بچی کا تاثر ہے۔ اس کی آنکھیں، جو چاندنی میں دمک رہی ہیں، اس کے پورے چہرے پر غالب ہیں۔ اسکار فیس اس کا نام پوچھتا ہے۔ "سنی،" وہ بتاتی ہے۔ وہ اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتا ہے اور اسے چیونگ گم پیش کرتا ہے، لیکن لڑکی تیزی سے سر ہلا کر انکار کر دیتی ہے۔

اس کی ماں حلیمہ نے کشتی پر سوار ہونے سے پہلے مراد سے وقت دریافت کیا تھا، جیسے اس کا وقت مقرر ہو اور اس کی پابندی ضروری ہو۔ وہ اسکار فیس کو تاریک، درشت نظر سے دیکھتی ہے، اپنا ایک بازو اپنی لڑکی کے گرد ڈال دیتی ہے اور دوسرا اپنے دو لڑکوں کے گرد جو اس کے دائیں طرف بیٹھے ہوئے ہیں۔ حلیمہ کی نگاہ بالکل سیدھی ہے، فاطمی کی نظروں کی طرح ادھر ادھر بھٹکتی ہوئی نہیں۔ اس کی شخصیت سے خاموش عزم کی فضا ہویدا ہے جس سے مراد کو اپنے اندر اس کے لیے تعظیم و تکریم کا جذبہ محسوس ہوتا ہے، اس کے باوجود کہ وہ اسے غیر ذمے دار، یا کم از کم غایت درجے کی احمق ضرور سمجھتا ہے کیونکہ وہ اس قسم کے سفر کو اختیار کر کے اپنے بچوں کی جانوں کو خطرے میں ڈال رہی ہے۔

عزیز کے دائیں طرف ایک نازک اندام افریقی عورت بیٹھی ہے، اس کے بالوں کی کنگی جیسی لڑیاں ڈھیلی پونی ٹیل چوٹی کی شکل میں جھول رہی ہیں۔ جس وقت وہ ساحل پر روانگی کا انتظار کر رہے تھے، اس نے ایک نارنگی چھیل کر آدھی مراد کو پیش کی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ گنی کی رہنے والی

Scanned with CamScanner

(Guinean) ہے۔ وہ اپنے جسم کے گرد بانہیں حمائل کر کے دھیمے دھیمے ہلکورے لینے لگتی ہے۔ رحال غرا کر اسے اس حرکت سے باز رہنے کے لیے کہتا ہے۔ وہ نظر اٹھا کر اوپر دیکھتی ہے، بے حرکت رہنے کی کوشش کرتی ہے، اور پھر فاطن کے جوتوں پر قے کر دیتی ہے۔ فاتن اپنے سنے ہوئے جوتے دیکھ کر چیخ اٹھتی ہے۔

"چپ رہ،" رحال تڑاق سے کہتا ہے۔

گنی کی عورت فرانسیسی میں معذرت کرتی ہے۔ فاطن سر ہلاتی ہے، کہتی ہے کہ کوئی بات نہیں، کہتی ہے کہ وہ سمجھتی ہے۔ چھوٹی سی کشتی سے جلد ہی قے کی عفونت کے بھبکے اٹھنے لگتے ہیں۔ مراد اپنی ناک ٹرنل نیک جرسی سے ڈھانپ لیتا ہے۔ اس میں سے صابن اور پودینے کی مہک آ رہی ہے اور وہ بدبو کو باہر ہی رکھتی ہے، لیکن چند ہی منٹوں میں وہ سڑاند اس مدافعت کا بند توڑ کر اندر گھس آتی ہے۔ اب حلیمہ کمر سیدھی کر کے زور سے سانس چھوڑتی ہے، اس کے بچے اس کے برابر ابھی تک سکڑے سمٹے بیٹھے ہیں۔ رحال بڑی قہر آلود نظر سے اسے گھورتا ہے، کہتا ہے کہ وہ نیچے جھک کر بیٹھے تاکہ کشتی کا توازن برقرار رہے۔

"اس کی جان چھوڑو،" مراد کہتا ہے۔

حلیمہ اس کی طرف مڑ کر پہلی بار مسکراتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اس کا منصوبہ کیا ہو سکتا ہے، کیا وہ وہاں اپنے خاوند یا بھائی سے ملنے جا رہی ہے یا اس کی قسمت میں بھی گھروں کی صفائی یا کھیتوں میں کام کرنا لکھا ہے۔ اسے ان غیر قانونیوں کا خیال آتا ہے جو کشتی میں جانے کے بجائے مراکش سے ہسپانیہ جانے والے ترکاریوں کے ٹرکوں میں چوری چھپے دبک کر اس پار جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پچھلے سال سرحدی محافظوں (Guardia Civil) نے الجسیرہ میں ٹماٹروں کے ایک ٹرک کو راستے میں روک لیا تھا اور اس میں سے تین غیر قانونیوں کی لاشیں برآمد کی تھیں، جو کھوکھوں پر دم گھٹ کر مرے ہوئے پڑے تھے۔ کم از کم کشتی پر اس قسم کی واردات کا امکان نہیں۔ وہ کسی اور چیز کی طرف خیال لے جانے کی کوشش کرتا ہے، کوئی چیز جو اس تصویر کی یاد کو محو کر سکے جو اس نے اخباروں میں دیکھی تھی۔

کشتی کے عقب میں لگا ہوا موٹر کام کرنا بند کر دیتا ہے لیکن پھر بھی گھومتا رہتا ہے۔ اس اچانک

خاموشی میں ہر شخص پلٹ کر رحال کو دیکھنے لگتا ہے، سب کے سب اپنا سانس روکے ہوئے ہیں۔

''وحشت تیرے کی!'' وہ بڑبڑاتا ہے۔ وہ موٹر کو چالو کرنے والی رسّی چند بار کھینچتا ہے لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔

''کیا ہوا؟'' فاطن پوچھتی ہے، اس کی آواز تشویش سے بوجھل ہے۔

رحال کوئی جواب نہیں دیتا۔

''ایک بار اور کوشش کرو۔'' حلیمہ کہتی ہے۔

رحال رسّی کو پھر جھٹکا دے کر کھینچتا ہے۔

''اس سفر پر پہلے سے ہی پھٹکار ہے،'' فاطن سرگوشی میں کہتی ہے۔ ہر کوئی اسے سن لیتا ہے۔

رحال موٹر پر زور سے اپنا ہاتھ مارتا ہے۔ فاطن قرآن کی دوسری سورت کی ایک آیت تلاوت کرتی ہے: ''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ زندہ ہے، سب کا سنبھالنے والا ہے۔ اسے نہ اونگھ آ سکتی ہے نہ نیند—''

''چپ کر،'' اسکارفیس زور سے ڈانٹتا ہے۔ ''چپ رہو تاکہ ہم کچھ سوچ سکیں۔'' وہ کپتان کی طرف دیکھ کر پوچھتا ہے، ''کیا اسپارک پلگ خراب ہو گیا ہے؟''

''خدا جانے۔ میں تو نہیں سمجھتا،'' رحال جواب دیتا ہے۔

فاطن اپنی دعا جاری رکھتی ہے، اس بار بے حد خاموشی کے ساتھ، اس کے ہونٹ بڑی تیزی سے حرکت کر رہے ہیں۔ ''اُسی کی مِلک ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔۔۔''

رحال پھر زور سے رسّی کھینچتا ہے۔

عزیز چلا کر کہتا ہے، ''ٹھہرو، ذرا مجھے دیکھنے دو۔'' وہ چاروں ہاتھ پاؤں پر ہو جاتا ہے اور سب کے اوپر سے ہوتا ہوا بڑی آہستگی سے آگے کی طرف بڑھنے لگتا ہے تاکہ کشتی کو متوازن رکھ سکے۔

فاطن رونے لگتی ہے، ایک طویل اور شکایتی بلک۔ ساری آنکھیں اسی پر جمی ہوئی ہیں۔ اس کا شدید جذباتی ہیجان متعدی ثابت ہوتا ہے اور مراد کشتی کے دوسرے سرے پر کسی اور کو سوں سوں کرتے سن سکتا ہے۔

''کیوں رو رہی ہو؟'' اسکارفیس پوچھتا ہے، آگے کو جھک کر، تاکہ اس کا چہرہ دیکھ سکے۔

"ڈر لگ رہا ہے،" وہ روہانسی آواز میں بین کرتی ہے۔

"بزکہ [بس]!" وہ حکم دیتا ہے۔

"اسے مت ڈانٹو،" حلیما اپنے بچوں کو ابھی تک اپنے سے چمٹائے ہوئے کہتی ہے۔

"اگر یہ سب برداشت نہیں کر سکتی تھی تو آئی ہی کیوں تھی؟" وہ فاطمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چیخ کر کہتا ہے۔

مراد اپنے چہرے سے قمیص نیچے کھسکاتا ہے۔ "کیا سمجھتے ہو اپنے آپ کو؟" اپنے غصے پر سب سے پہلے خود اسے حیرت ہوتی ہے۔ اس کے جسم میں تناؤ کی کیفیت ہے اور وہ تو تو میں میں کے لیے تیار معلوم ہوتا ہے۔

"اور جناب کی تعریف؟" اسکارفیس کہتا ہے۔ "اس کے محافظ؟"

ایک مال بردار کشتی اپنا بھونپو بجاتی ہے، جس سے سب سراسیمہ ہو جاتے ہیں۔ وہ فاصلے میں بہتی چلی جاتی ہے، اس کی روشنیاں ٹمٹما رہی ہیں۔

"یہ چیخ بند کرو،" رحال چلاتا ہے۔ "کوئی سن لے گا!"

عزیز موٹر کا معائنہ کرتا ہے، اسے ٹینک سے منسلک کرنے والی نلی کو کھینچ کر دیکھتا ہے۔ "یہاں ایک رخنہ پڑا ہوا ہے،" وہ رحال کو مطلع کرتا ہے اور کنکٹر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ "تمہارے پاس تھوڑا سا ٹیپ ہے؟" رحال اپنا ضروری اشیا کا ڈبا کھولتا ہے اور ڈکٹ ٹیپ کا رول نکالتا ہے۔ عزیز جلدی سے تھوڑی سی ٹیپ نلی کے گرد لپیٹتا ہے۔ کپتان رسی کو ایک بار کھینچتا ہے، پھر دوسری بار۔ آخر کار موٹر اذیت سے خرخراتا ہے اور کشتی حرکت میں آ جاتی ہے۔

"الحمدللہ،" فاطمہ کہتی ہے، اسکارفیس کی قہر آلود نظروں کی پروا نہ کرتے ہوئے۔

رونا پیٹنا بند ہوتا ہے اور کشتی پر ایک گمبھیر سکون چھا جاتا ہے۔

اب طریفہ دو سو پچاس میٹر دور ہے۔ صرف چند منٹ لگیں گے۔ گنی کی عورت کاغذ کا ایک پرزہ کشتی سے پانی میں اچھال دیتی ہے۔ مراد قیاس کر لیتا ہے کہ یہ اس کا شناختی کارڈ ہے۔ وہ سیرالیون (Sierra Leone) سے آنے کا سوانگ رچائے گی تاکہ سیاسی پناہ مل جائے۔ وہ سر ہلاتا ہے۔ خود

Scanned with CamScanner

اس کی تقدیر بھلا ایسی کہاں۔

پانی ہنوز پرسکون ہے، لیکن مراد آتنی آسانی سے بحیرۂ روم پر بھروسا کرنے والا نہیں۔ وہ اس سمندر کو اپنی ساری زندگی سے جانتا آیا ہے، اور اس کے تھپیڑوں کی طاقت کا اسے خوب اندازہ ہے۔ ایک مرتبہ، جب وہ دس سال کا تھا، وہ اپنے باپ کے ساتھ الحسیمہ کے ساحل پر سمندری گھونگھے بیننے گیا تھا۔ وہ اپنے کام میں تندہی سے منہمک تھے کہ مراد کی نظر گھونگھوں کے سیاہ، خوش نما گچھے پر جا پڑی جو ایک کھوکھلی چٹان کے اندر اپنی داڑھیوں سے لٹکے ہوئے تھے۔ اس نے خود کو نیچے اندر اتارا اور انھیں نوچنے میں مصروف تھا کہ ایک موج کھو میں بھر گئی اور اسے زور سے باہر پھینک دیا۔ مراد کے باپ نے، جو ابھی تک بالٹی سنبھالے ہوئے تھا، اسے پکڑ کر پانی سے باہر نکالا۔ بعد میں مراد کا باپ اپنے قہوہ خانے کے دوستوں کو یہی قصہ بڑھا چڑھا کر سنایا کرتا، اور یوں یہ کنبے کی کہانیوں کے اس ذخیرے میں شامل ہو گیا جن کی قصہ گوئی وہ فرمائش پر کیا کرتا۔

''اب سب کشتی سے باہر نکلو!'' رحال چلاتا ہے۔ ''باقی رستہ تمھیں تیر کر طے کرنا ہوگا۔''

عزیز فوراً پہلو کے بل قلابازی کھا کر پانی میں کودتا ہے اور تیرنے لگتا ہے۔

مراد، دوسرے مسافروں کی طرح، ہکا بکا ہو کر اپنے سامنے تکتا رہ جاتا ہے۔ اسے توقع تھی کہ انھیں ٹھیک کنارے تک لے جایا جائے گا، جہاں وہ آسانی کے ساتھ منتشر ہو کر لاپتا ہو جائیں گے۔ باقی راستے تیر کر جانے کا خیال ناقابلِ برداشت تھا، خاص طور پر ان مسافروں کے لیے جو طنجہ کے نہیں تھے اور اس کے سمندر کے عادی نہیں تھے۔

حلیمہ رحال کی طرف ہاتھ اٹھاتی ہے۔ ''چور، اچکے! ہم نے تجھے ساحل تک لے جانے کی رقم دی تھی۔''

رحال کہتا ہے، ''تم ہم سب کو گرفتار کرانا چاہتی ہو، ہرا گا؟ اگر وہاں پہنچنا چاہتی ہو تو کشتی سے باہر نکلو۔ زیادہ دور نہیں ہے۔ میں یہیں سے واپس جاؤں گا۔''

یک بارگی کوئی حرکت کرتا ہے تا کہ رحال کو قائل کرے، اسے ساحل تک جانے پر مجبور کرے، لیکن کشتی کا توازن بگڑ جاتا ہے، وقت ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ مراد اب پانی میں ہے۔ اس کے کپڑے ایک لمحے میں بھیگ جاتے ہیں۔ وہ ڈبکیاں لینے لگتا ہے، سانس لینے کی کوشش کرتا ہے، اور اسے

Scanned with CamScanner

احساس ہوتا ہے کہ اب تیرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔ وہ اپنے بازوؤں کو حرکت کرنے کا حکم دیتا ہے، جو بھیگے ہوئے کپڑوں کے بوجھ سے شل ہیں۔

اس کے اردگرد لوگ آہستہ آہستہ بکھرتے جا رہے ہیں، دھارے انھیں اپنے ساتھ بہائے لیے جا رہے ہیں۔ رحال اپنی کشتی کو سیدھا کرنے کی جدوجہد کر رہا ہے اور کوئی شخص، مراد ٹھیک سے نہیں کہہ سکتا کہ کون، کشتی کے پہلو سے لٹکا ہوا ہے۔ اسے آہ و بکا اور چیخیں سنائی دیتی ہیں، چند لوگ بڑے عزم سے تیرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ عزیز، جو کشتی سے نکلنے والوں میں سب سے پہلا تھا، باقیوں سے بہت آگے، مغرب کی سمت بڑھ رہا ہے۔ مراد ساحل کی طرف تیرنے لگتا ہے، اس سے خوفزدہ کہ کہیں لہریں اسے دور نہ کھینچ لے جائیں۔ اسے اپنے پیچھے کسی کے پکارنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ مڑتا ہے اور فاطن کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے۔ وہ اچک کر اسے دبوچ لیتی ہے اور اگلے لمحے اس کے دونوں شانے جکڑے ہوئے ہے۔ وہ اس کی پکڑ سے آزاد ہو جانا چاہتا ہے، لیکن وہ اور بھی سخت ہو جاتی ہے۔

''ایک بازو ہلا کر آگے بڑھو،'' وہ چلا کر کہتا ہے۔

فاطن کی آنکھیں اور زیادہ کھل جاتی ہیں لیکن اس کے ہاتھ حرکت نہیں کرتے۔ وہ زور لگا کر اس کا ایک ہاتھ اپنے سے الگ کر دیتا ہے اور دو چار ہاتھ تیرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ مراد پر لدا ہوا اس کا جسم خاصا وزنی ہے۔ ہر بار جب دونوں ڈبکی لیتے ہیں، وہ اسے اور زور سے جکڑ لیتی ہے۔ اس کے کانوں میں پانی گھس آیا ہے اور اس کی چیخیں اب اتنی اونچی نہیں لگ رہی ہیں۔ وہ اس کی گرفت ڈھیلی کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ ڈھیلی نہیں پڑنے دیتی۔ وہ چلاتا ہے۔ وہ اسے دبوچے ہی رہتی ہے۔ اگلی بار جب وہ ڈبکی لیتے ہیں، پانی مراد کی ناک میں داخل ہو جاتا ہے اور اسے کھانسی اٹھتی ہے۔ اگر اس نے اپنی گرفت ہلکی نہ کی اور اس کے ساتھ تیرنے کی کوشش نہ کی تو وہ کبھی ساحل تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ وہ اسے دھکا دے کر خود سے دور کر دیتا ہے۔ آخر آزاد ہو کر، وہ تیزی کے ساتھ اس کی پہنچ سے باہر ہو جاتا ہے۔ ''پانی پر اپنے بازو مارو،'' وہ چلا کر کہتا ہے۔ وہ بڑی دیوانگی سے ہاتھ پاؤں ادھر ادھر پھینکنے لگتی ہے۔ ''ذرا آہستہ،'' وہ اس سے کہتا ہے، لیکن اسے نظر آ رہا ہے کہ یہ بے کار ہے، وہ نہیں تیر سکتی۔ ایک سسکی اس کے حلق میں اٹھنے لگتی ہے۔ کاش اس کے پاس کوئی چھڑی ہی ہوتی

یا کوئی تیرتا (buoy) کہ وہ اسے تھام کر اپنے ساتھ کھینچ سکتا اور دونوں ڈوبنے کے خطرے سے بچ جاتے۔ اب وہ اس سے دور ہوتا جارہا ہے، لیکن اسے پکارے جاتا ہے، اس سے کہے جاتا ہے کہ اپنے حواس قائم رکھے اور تیرنا شروع کرے۔ مراد کے ہاتھ اور پیروں کی انگلیاں شل ہوگئی ہیں، وہ اسے اب تیرنا شروع کردینا ہے ورنہ وہ ٹھٹھر کر مرجائے گا۔ وہ اپنا رخ ساحل کی طرف کرلیتا ہے۔ آنکھیں میچ لیتا ہے، لیکن پپوٹوں کے پیچھے فاطمہ کا پیکر اس کا منتظر ہے۔ آنکھیں دوبارہ کھل جاتی ہیں اور وہ اپنے بازوؤں کی حرکت پر دھیان مرکوز کردیتا ہے۔

فضا میں عجیب سی خاموشی ہے۔ وہ اس وقت تک تیرتا رہتا ہے جب تک اسے ریت اپنے پاؤں کے نیچے محسوس نہیں ہونے لگتی۔ وہ اپنے سانس پر، کانوں میں گونجتی اپنے دل کی دھڑکن پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے۔ دور ریتیلے ساحل پر پسر جاتا ہے، پانی اس کے جوتوں کو چاٹ رہا ہے۔ سورج بلند ہورہا ہے، ریت اور بہت آگے کی عمارتوں پر نارنجی رنگ کی سنہری چھوٹ ڈال رہا ہے۔ ایک آہ بھر کر مراد اپنا مثانہ خالی کرتا ہے۔ اس کے اردگرد ریت بڑی تیزی سے گرم ہوجاتی ہے لیکن پھر چند ہی ثانیوں میں ٹھنڈی بھی پڑ جاتی ہے۔ وہ کچھ دیر وہاں آرام کرتا ہے، پھر دھیرے دھیرے اپنے گھٹنوں کو آگے سرکاتا ہے۔

وہ کھڑا ہوتا ہے، اس کی ٹانگیں لرز رہی ہیں۔ وہ پیچھے مڑ کر تاریک پانیوں کا جائزہ لیتا ہے، فاطمہ کی تلاش میں۔ اسے چند پیکر تیرتے ہوئے، سخت کشمکش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن یہ کہنا دشوار ہے کہ کون کون ہے۔ عزیز کا کہیں نام و نشان نہیں، لیکن چند میٹر کے فاصلے پر گنجی سی عورت پانی سے باہر نکل رہی ہے۔

کہیں دور کوئی کتا بھونکتا ہے۔

مراد کو معلوم ہے کہ گارڈ یا بول کے سپاہیوں کے ان کے پیچھے آنے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ وہ چند قدم اٹھاتا ہے اور پھر اپنے گھٹنوں کے بل ریت پر گر جاتا ہے جو پانی کے مقابلے میں زیادہ گرم محسوس ہوتی ہے۔ وہ لرزتے ہاتھ سے اپنی کارگو پتلون کے پہلو کی جیب کھولتا ہے اور اس میں سے ایک پلاسٹک کا تھیلا نکالتا ہے۔ اس کے اندر ہسپانوی سم کارڈ والا ایک موبائل فون ہے۔ وہ روبیو کو فون کرتا ہے، اس ہسپانوی کو جو اسے شمال میں کیٹالونیا گاڑی میں لے جانے والا ہے۔

Scanned with CamScanner

"میں مراد ہوں، سدحال کا دوست۔"

"کتوں کے پاس میرا انتظار کرو۔"

"اچھا۔"

وہ چند قدم آگے بڑھتا ہے، لیکن اسے وہ کتے کہیں نظر نہیں آتے جن کا ذکر رو بیو نے کیا تھا۔ بہر کیف، وہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ افق پر ایک ہوٹل نمودار ہوتا ہے۔ ایک اور کتا بھونکتا ہے، اور جلد ہی بھونک درد بھری چیخ میں بدل جاتی ہے۔ وہ اسی کی سمت میں چلتا ہے اور کتے نظر آ جاتے ہیں۔ ایک تنگ سا راستہ بائیں طرف نمودار ہوتا ہے اور وہ اس کے سرے پر آ کر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ اپنے جوتے اتار دیتا ہے، بھیگے ہوئے موزوں میں اپنے پیروں کی یخ انگلیوں کو موڑ موڑ کر ان کی مالش کرتا ہے۔ دوبارہ جوتے پہن کر چت لیٹ جاتا ہے اور اطمینان کا گہرا سانس لیتا ہے۔ اسے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آ رہا۔ وہ یہاں پہنچ ہی گیا۔

اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ اپنے کو اسی مانوس شخص سے تسلی پہنچاتا ہے جس نے پیچھے گھر پر اسے سہارا دیا تھا، ان تمام راتوں میں جب وہ سونے سے عاجز رہا تھا، اس بات سے پریشان کہ مکان کا کرایہ کہاں سے ادا ہو گا اور اس کی ماں اور بھائیوں کے کھانے پینے کا انتظام کیسے ہو گا۔ وہ اس دفتر کا تصور کرتا ہے جہاں وہ ملازمت کرے گا؛ اپنی انگلیوں کو کی بورڈ پر سرعت اور قطعیت سے حرکت کرتا دیکھ سکتا ہے؛ اپنے فون کی گھنٹی بجتے ہوئے سن سکتا ہے۔ وہ اپنے کو ایک جدید، آراستہ اپارٹمنٹ میں گھر لوٹتا ہوا دیکھتا ہے، اس کی بیوی اس کے لیے دروازہ کھول رہی ہے، پس منظر میں ٹی وی ہے۔

ایک روشنی اس پر پڑتی ہے۔ رو بیو نے بڑی چستی دکھائی۔ کیا عجب کہ اس کی خدمات حاصل کرنے کے لیے بھاری معاوضہ دینا پڑا۔ مراد سیدھا ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ روشنی اس سے لمحے بھر کے لیے ہی دور ہوئی ہے، لیکن کتے کو، جو ایک جرمن شیپرڈ ہے، اور اس انتہائی ڈراؤنی شکل کو جس نے اس کی رسی پکڑ رکھی ہے دیکھنے کے لیے بہت کافی ہے۔

گوارڈیا سول کا آفیسر وردی پہنے ہے اور سیاہ ٹوپی (beret) ایک طرف سے اس کے گھنے

Scanned with CamScanner

سر پر جھکی ہوئی ہے۔ اس کی جیب پر لگے بلے پر اس کا نام مارتینیز (Martinez) پڑھا جاتا ہے۔ وہ وین میں مراد اور دوسرے غیر قانونیوں کے ساتھ بیٹھا ہے، کتا اس کے پاؤں میں پڑا ہے۔ مراد اپنا جائزہ لیتا ہے۔ گیلے جوتے، میل سے اٹی پتلون جو اس کی ٹانگوں سے چپکی ہوئی ہے، ناخنوں کے نیچے کی بلکوں جلد۔ وہ اپنے دانت بھینچے رکھتا ہے تاکہ اس کمبل کے نیچے جو آفیسر نے اسے دیا ہے اپنے کو کپکپانے سے باز رکھ سکے۔ صرف چودہ کلومیٹر کا فاصلہ ہی تو تھا، وہ سوچتا ہے۔ اگر انھیں مجبوراً پانی ہی میں نہ اتار دیا گیا ہوتا، اگر وہ ذرا اور تیزی سے تیرا ہوتا، اگر مشرق کے بجائے مغرب کا رخ کیا ہوتا، تو وہ بچ نکلا ہوتا۔

جب مراد وین سے نیچے اترتا ہے تو اس کی توجہ میں چند ہی میٹر کے فاصلے پر پہاڑی پر درختوں سے بھرا پرا ایک علاقہ آتا ہے، اور اس کے آگے ایک سڑک۔ پہرے دار ایک عورت کی مدد کرنے میں مشغول ہیں جو سردی کے باعث ڈھیر ہو گئی ہے۔ مراد سرپٹ دوڑ پڑتا ہے، حتی المقدور تیزی سے۔ اسے اپنے پیچھے سیٹی کے بجنے اور بوٹوں کی آواز سنائی دیتی ہے، لیکن وہ درختوں کے بیچ میں سے دوڑے جاتا ہے، تڑخی ہوئی زمین کو اس کے پاؤں بمشکل چھو رہے ہیں۔ جب وہ سڑک کے اور نزدیک پہنچتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ یہ ایک چار لین کی ہائی وے ہے، جس پر کاریں زناٹے سے دوڑی جا رہی ہیں۔ اس کے باعث اسے توقف کرنا پڑتا ہے۔ مارتینیز اس کی قمیص پکڑ کر اسے دبوچ لیتا ہے۔

گوارڈیا سول کی چوکی میں دیواری گھڑی صبح کے چھ بجا رہی ہے۔ مراد، جھگڑیاں پہنے، ایک لوہے کی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ مرد اور عورتیں سبھی اس کی طرح کمبلوں میں لپٹے ہوئے، حرارت پانے کے لیے ایک دوسرے سے چپکے بیٹھے ہیں۔ ان میں سے بہت سوں کو وہ نہیں پہچانتا؛ زیادہ تر دوسری کشتیوں میں آئے تھے۔ اسکارفیس سب سے الگ، ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے، ایک جوتا غائب، بیٹھا سگریٹ پھونک رہا ہے۔ عزیز کا کہیں نام نشان نہیں۔ وہ ضرور بچ نکلا ہوگا۔ تصدیق کرنے کے لیے وہ گنی کی عورت سے جو اس سے چند نشستیں دور بیٹھی ہے پوچھتا ہے۔ ''مجھے تو نظر نہیں آیا،'' وہ بتاتی ہے۔

عزیز خوش قسمت نکلا۔ مراد اپنی بدقسمتی کو کوستا ہے۔ اگر صرف سو میٹر مغرب کی جانب وارد ہوا

ہوتا، گھروں اور ہوٹل سے دور، تو شاید بچ نکلا ہوتا۔ اس کے پیٹ میں گڑگڑاہٹ اٹھتی ہے۔ وہ بدقت اسے دبانے کی کوشش کرتا ہے۔ طنجہ لوٹ کر وہ کیا منہ دکھائے گا؟ وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور لڑکھڑاتا ہوا گرد آلود کھڑکی کی طرف پہنچتا ہے۔ اسے فاطن نظر آتی ہے، کھلے سر، کشتی کے چند ہم سفروں کے ساتھ قطار میں کھڑی ہوئی، جو سرجیکل ماسک پہنے ہوئے ڈاکٹروں کے منتظر ہیں، تاکہ آ کر ان کا طبی معائنہ کریں۔ اسے دیکھ کر مراد کو تسلی کی ایک لہر محسوس ہوتی ہے، اور وہ جھکڑی لگے ہاتھوں سے جس قدر بھی ممکن ہوتا ہے اس کی طرف اشارے کرتا ہے اور اس کا نام لے کر پکارتا ہے۔ وہ اس کی آواز سن نہیں پاتی، پھر بھی سر اوپر اٹھا کر اسے دیکھتی ہے، اور اس کی طرف سے رخ پھیر لیتی ہے۔

گہرے رنگ کے کاروباری سوٹ میں ملبوس، ٹائلوں کے فرش پر اپنے جوتے ٹک ٹک کرتی ایک عورت۔ ''میں ان کی وکیل ہوں،'' وہ ان کے سامنے آ کر کہتی ہے۔ وہ انھیں بتاتی ہے کہ وہ یہاں غیر قانونی طور پر آئے ہیں اور گوارڈیا سول جو کاغذات انھیں دے گی ان پر انھیں دستخط کرنے ہوں گے۔ جب وہ باری باری دستخط کر رہے ہوتے ہیں، عورت ایک آفیسر سے بات کرنے کے لیے کاؤنٹر پر جھکتی ہے۔ دورانِ گفتگو، وہ اپنی ایک ٹانگ اپنے پیچھے اٹھاتی ہے، کسی ننھی بچی کی طرح۔ آفیسر رجھانے والے انداز میں کچھ کہتا ہے، اور وہ اپنا سر پیچھے کی طرف پھینک کر ہنسنے لگتی ہے۔

مراد ایک جعلی نام لکھ دیتا ہے، حالانکہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ اسے حوالات میں لے جایا جاتا ہے، ساحل کی ریت ہنوز اس کی پتلون سے چپکی ہوئی ہے۔ اپنے راستے میں اسے ایک باڈی بیگ زمین پر نظر آتا ہے۔ ایک کھٹا ذائقہ اس کے منہ میں گھل جاتا ہے۔ وہ اسے دباتا ہے لیکن قابو میں رکھنے سے عاجز ہے۔ وہ دوہرا ہو جاتا ہے اور آفیسر اسے گرفت سے آزاد کر دیتا ہے۔ مراد لڑھکتا پڑھکتا عمارت کے پہلو میں جاتا ہے اور قے کر دیتا ہے۔ اس باڈی بیگ میں وہ خود ہو سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے عزیز ہو، یا حلیف۔

پہرے دار اسے ایک سیلن زدہ کوٹھڑی میں لاتا ہے جہاں پہلے سے دو قیدی موجود ہیں، جن میں سے ایک گدے پر پڑا سو رہا ہے۔ مراد فرش پر بیٹھ جاتا ہے اور کھڑکی کے اوپر آسمان کے نیلے ٹکڑے کی طرف دیکھتا ہے۔ سمندری بگلے عمارت کے ایک طرف سے پھڑ پھڑا کر اٹھتے ہیں اور قطار کی صورت میں پرواز کرنے لگتے ہیں، اور لمحے بھر کو وہ ان کی آزادی پر رشک کرتا ہے۔ لیکن کل پولیس

اسے واپس بھیج دے گی۔ وہاں اس کا مستقبل اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے، ناقابلِ تغیر، اس کی کوششوں کے باوجود، اس کے مول لیے ہوئے خطرے اور ادا کی ہوئی قیمت کے باوجود۔ اسے چار و ناچار اسی پرانے اپارٹمنٹ میں لوٹنا ہوگا، اپنی ماں اور بہن کی کمائی کھاتا ہوا، روزگار کی کسی خوش آئند توقع یا امکان کے بغیر۔ اسے عزیز کا خیال آتا ہے۔ شاید اب وہ کسی ٹرک پر سوار کیا لوٹایا جا رہا ہوگا اور سوچتا ہے— اگر عزیز کامیاب ہو سکتا ہے، تو وہ کیوں نہیں؟ کم از کم اب اسے معلوم ہے کہ کس چیز کی توقع کر سکتا ہے۔ ماں کو راضی کرنا دشوار ہوگا، لیکن اسے معلوم ہے کہ آخر میں وہ اسے اپنے سونے کے کڑے فروخت کروا لینے پر راضی کر ہی لے گا۔ اگر وہ ساتوں کے سات کڑے بیچ دے تو اس سے ایک اور سفر کا خرچ نکل آئے گا۔ اور اس اگلی بار وہ ضرور کامیاب ہوگا۔

پہلا حصہ: قبل

جنون

لعربی [العربی] عرانی اپنے کو توہم پرست نہیں سمجھتا تھا، لیکن جب اس کے ریئر ویو آئینے سے جھولتی ہوئی تسبیح ٹوٹی، تو وہ مضطرب ہو گیا کہ یہ کسی بدشگونی کی علامت نہ ہو۔ صندل کے دانوں والی یہ تسبیح اس کی ماں نے اسے کالج ختم کرنے پر دی تھی — اپنی وفات سے کچھ دن پہلے، اس ہدایت کے ساتھ کہ اس کا بہ کثرت استعمال کیا کرے۔ شروع شروع میں لعربی تسبیح اپنی جیب میں لیے لیے پھرتا تھا، اور ہر نماز کے بعد اس کے دانوں کو انگلیوں سے پھراتا تھا، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ اس کا کم باقاعدگی سے استعمال کرنے لگا تھا، تا آنکہ ایک روز یہ اس کی کار کی ایک سجاوٹ بن کر رہ گئی۔ اور اب یہ بکھری پڑی تھی، فرش کی سایہ رنگ چٹائیوں پر عنبریں بوندکیاں۔ ان میں سے جتنی بھی مل سکیں اس نے چن لیں اور انھیں کپ ہولڈر میں ڈال دیا، اس امید کے ساتھ کہ بعد میں اسے جڑوا لے گا۔ اس نے مرسیڈیز کو ڈرائیو وے سے آہستگی کے ساتھ نکالا اور پرسکون، دورویہ درختوں کی قطار والی سڑک پر ڈال دیا۔ گاڑیوں کی آمد و رفت غیر معمولی طور پر ہلکی تھی، اس وقت بھی جب وہ باب الرواح کی کنگرے والی فصیل سے گزرا۔

مراکش کی وزارت تعلیم کے اپنے دفتر میں، اس نے اس دن کا العالم کھولا اور شاوش [چپراسی] سے پودینے کی چائے کا ایک گلاس لانے کے لیے کہا۔ ایک منٹ بعد وہ عرضی گزارنے والوں کے ذاتی کوائف کے انبار سے نبٹتا رہے گا، یہ فیصلہ کرے گا کہ تازہ فارغ التحصیل اساتذہ کہاں کہاں اپنی سرکاری ملازمت انجام دیں گے، لیکن اب بہر حال وہ آرام کے ساتھ چائے کی چسکیاں

Scanned with CamScanner

لیتے ہوئے اخبار پڑھتا رہا۔ سرخیوں نے ریل گاڑی کے مزدوروں کی ہڑتال کی خبر دی اور دودھ اور آٹے کی قیمت میں ایک اور اضافے کی، چنانچہ وہ ان کو چھوڑ کر کھیلوں والے صفحے پر چلا آیا۔

قبل اس کے کہ وہ ویک اینڈ پر کھیلے گئے فٹ بال کے اسکور کی بابت پڑھتا، اس کی سیکرٹری نے بزر پر اسے مطلع کیا کہ کوئی ملاقات کے لیے آیا ہے۔ لعربی نے اخبار ایک طرف سرکایا اور سی توفیق کی پذیرائی کے لیے کھڑا ہو گیا، جو اس کا پرانا دوست تھا لیکن ادھر پندرہ سال سے (یا چودہ سال سے؟) جس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ رباط کے مرکزی علاقے میں واقع ایک نئے تعمیر شدہ اپارٹمنٹ کامپلیکس میں ایک دوسرے کے پڑوسی ہوا کرتے تھے، لیکن مضافات میں نقل مکانی کے بعد ان کا ایک دوسرے سے ربط منقطع ہو گیا تھا۔ سی توفیق، ستمبر کے اس گرم دن کے باوجود، اپنے سفید برنس میں ملبوس اندر داخل ہوا۔ سلام علیک اور دیگر رسمیات کے بعد توفیق نے اپنا گلا صاف کیا اور کہا، ''میری بھتیجی کا معاملہ ہے۔ اگلی گرمیوں میں وہ اپنی سند مکمل کر رہی ہے۔'' تھائی رائنڈ کی شکایت کی وجہ سے باہر کو نکلی ہوئی اس کی آنکھیں لعربی کو بے چین کیے دے رہی تھیں

''مبارک ہو،'' لعربی نے کہا۔

''اور وہ رباط میں نوکری چاہتی ہے۔'' توفیق جان بوجھ کر مسکرایا۔

لعربی نے اپنی خفگی کو چھپانے کی کوشش کی۔ پڑھانے والوں کی سب سے زیادہ ضرورت نسبتاً چھوٹے شہروں اور کوہ اطلس کے دیہاتوں میں تھی۔

''مجھے امید ہے کہ ہم اس کی مدد کر سکو گے،'' توفیق نے اضافہ کیا۔

''کاش کر سکتا، سی توفیق،'' لعربی نے آغاز کیا۔ ''لیکن ان دنوں شہر میں اتنی کم آسامیاں ہیں۔ انتظار کرنے والوں کی فہرست اتنی موٹی ہے۔'' اس نے اپنی انگلیاں پھیلائیں، جیسے ٹیلیفون کی ڈائریکٹری کی بات کر رہا ہو۔

''میں سمجھتا ہوں،'' توفیق نے کہا۔ ''بیشک، آپ کو مدد پہنچانے کی ہم ہر کوشش کریں گے۔''

لعربی نے اپنی باریک مونچھیں تھپتھپائیں، اور انھیں اوپر کی طرف مل دیا۔ کبھی کبھار رشوت لینے سے وہ باز نہیں تھا، لیکن اسے صبح کا شگون یاد آ گیا۔ ''براہ مہربانی،'' وہ اپنی ہتھیلیاں سامنے کھڑی کر کے بولا، ''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔'' اس نے اپنا گلا صاف کیا اور کمزوری آواز میں اتنا بڑھا دیا،

''مجھے تمام مدرسین کی خدمت کر کے خوشی ہی ہوتی ہے۔ ایسا ہے کہ جب بہت سارے لوگ ایک ہی چیز کے خواہاں ہوں، تو ان سب کو ان کی مرضی کا کام دلانا مشکل ہو جاتا ہے۔''

توفیق مایوس نظر آنے لگا، اور اس نے کچھ دیر تک لعزبی کو گھور کر دیکھا۔ ''سمجھتا ہوں،'' وہ بولا۔ ''اسی لیے تو تمھارے پاس آیا ہوں۔''

لعزبی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ اپنے دوست کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا، اور پھر قومی تحفظ کے ادارے کے ایک شعبے کے سربراہ کی فرمائش کو رد کرنے کی کوئی تک بھی تو نہیں تھی۔ ''دیکھوں گا کہ کیا ممکن ہے،'' وہ بولا۔ توفیق کی بھتیجی کو فہرست میں آگے کرنے کے لیے کاغذات کو بڑی استادی سے برتنا پڑے گا۔ اور اسے بڑی احتیاط سے بھی کام لینا ہوگا۔

اس کے جانے کے بعد، لعزبی اپنی کرسی پر گھوما اور اپنے پیر ڈیسک کے اوپر دراز کر دیے، اور ٹخنوں کے پاس انھیں ایک دوسرے پر آڑا کر کے رکھا۔ اس نے کھڑکی کے باہر یوکلپٹس کے درختوں کی قطار پر نظر ڈالی اور دوبارہ اپنی ماں کے بارے میں سوچا۔ اس کا مہربان چہرہ اس کی چشم خیال میں ابھرنے لگا۔ اس نے ایک مارلبرو سگریٹ سلگایا اور آہستہ آہستہ کش لیا۔ اب زمانہ بدل چکا تھا۔ موجودہ نظام اس نے نہیں بنایا تھا، وہ تو بس گزارہ کر رہا تھا، ہر دوسرے آدمی کی طرح۔ اس نے رخ عرضیوں کے انبار کی طرف کر لیا۔

اس رات جب لعزبی گھر لوٹا، تو میز پر ایک اچنبھے کی چیز اس کی منتظر تھی — اس کے بیٹے نادر کی جانب سے آیا ہوا نایاب خط جو کیبیک (Quebec) میں الیکٹریکل انجینئرنگ پڑھ رہا تھا۔ لعزبی لونگ روم میں داخل ہوا اور، یک گلابی اور سفید ریشمیں کشن کو ہٹا کر چرمی صوفے پر بیٹھ گیا۔ دو سال پہلے، لعزبی کی بیٹی نورا نے ریشم پر نقش و نگار بنانا سیکھنا شروع کیا تھا اور، کشنوں کے علاوہ، گلوبند، رومال، اور واٹر کلر تصویریں بنائی تھیں۔ اس کی محنتوں کے نتیجے سارے گھر میں پھیلے ہوئے تھے۔ لعزبی کا خیال تھا کہ آرائشی لنون سے اس کی دلچسپی خاصی مستحکم ہے، لیکن یہ ہائی اسکول کے وقتی شوق سے زیادہ نہ نکلی، اور رنگوں کی ساری بوتلیں اور برش، جو اس نے اصرار کے ساتھ خریدے تھے، اب باورچی خانے کے سنک کے نیچے ایک پلاسٹک کے تھیلے میں پڑے تھے۔

لعربی نے خط کھولا۔ ان دنوں نادر صرف جلد بازی میں گھسیٹے ہوئے ای میل ہی بھیجتا تھا جن میں کالج کی زندگی کے کوائف بڑی تعزدلی سے لکھے گئے ہوتے۔ لیکن جب وہ سچ مچ کا خط لکھتا، تو اس کا مقصد والدین سے پیسے مانگنا ہوتا۔ اور یہ خط ان سے مختلف نہیں تھا— اس نے ایک لیپ ٹاپ کمپیوٹر خریدنے کے لیے دس ہزار درہم مانگے تھے۔ لعربی نے اپنا سر ہلایا۔ نادر شاید یہ رقم سی ڈی خریدنے یا شہر سے باہر ویک اینڈ منانے پر خرچ کرے گا۔ اسے اس پر تردد نہیں تھا، اگر لڑکا اسکول میں ٹھیک ٹھاک کام کر رہا ہو، اور وہ ہمیشہ ہی ٹھیک ٹھاک کام کرتا تھا۔ لعربی کو اپنے لڑکے کے مستقبل کے بارے میں سوچنے کا بڑا شوق تھا اور اس عہدے کے بارے میں بھی جو انجینئرنگ کی، اور وہ بھی غیر ملکی، ڈگری کے باعث نادر کو مل سکتا تھا۔

لعربی راہداری سے ہوتا ہوا نورا کے کمرے تک آیا۔ ایک لمحے کے لیے اسے خیال گزرا کہ وہ گھر میں نہیں ہے، کیونکہ اس کا اسٹیریو راک میوزک بے آواز بلند نہیں بجا رہا تھا جیسا کہ ہمیشہ بجاتا تھا، لیکن اسے اندر سے آوازیں آتی سنائی دیں، چنانچہ اس نے دستک دی۔ نورا نے دروازہ کھولا۔ وہ جینز اور کالے رنگ کی ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھی جس پر چمکیلے حرفوں میں کسی راک بینڈ کا نام نقش تھا۔ اس کے گھونگھریالے بال آبشار کی صورت اس کے شانوں پر برس رہے تھے۔ اس نے اپنی گھڑی کی طرف نظر ڈالی۔ ''ساڑھے چھ بج گئے؟'' اس نے کہا، جیسے متعجب ہو۔

''دیکھو میں تمھارے لیے کیا لایا ہوں،'' لعربی نے چند رسالے بڑھاتے ہوئے کہا جو گھر لوٹتے ہوئے اس نے خریدے تھے۔

''شکریہ، بابا،'' نورا نے کہا۔ اس نے رسالے لے لیے، اور جب وہ انھیں اپنی ڈیسک پر ڈالنے کے لیے ایک طرف ہٹی تو لعربی کو اس کی دوست نظر آئی، ایک لڑکی جو کھڑکی کے پاس کرسی پر ہاتھ گود میں رکھے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ ایک سرمئی رنگ کا بھدا سا سویٹر پہنے تھی اور ٹخنوں تک آتا ہوا ڈینم کا اسکرٹ، اور اس کے بال حجاب سے ڈھکے ہوئے تھے۔ نورا نے اس کا تعارف فاطن خطیبی کہہ کر کرایا، رباط یونیورسٹی میں اس کی ایک ہم جماعت۔ نورا نیویارک یونیورسٹی جانے والی تھی، لیکن انگریزی کے امتحان (TOEFL) میں اس کے ناکافی نمبر آئے تھے، چنانچہ اسے اس پبلک یونیورسٹی میں ایک سال تک انگریزی پڑھنی تھی۔ دسمبر میں وہ دوبارہ داخلے کی عرضی دینے والی تھی۔ اس تاخیر پر

وہ خاصی ملول تھی، اور اس میں تنہائی کے احساس نے اور اضافہ کر دیا تھا— اس کی زیادہ تر سہیلیاں جو پرائیویٹ فرانسیسی اسکول (lycée) میں اس کے ساتھ پڑھی تھیں، غیر ملکی یونیورسٹیوں میں جا چکی تھیں۔

لعربی کمرے میں داخل ہوا اور خوش خلقی سے اپنا ہاتھ فاطن کی طرف بڑھایا، لیکن فاطن نے مصافحہ نہیں کیا۔ "معاف کیجیے گا،" اس نے کہا۔ اس کی آنکھیں واپس نورا کی طرف پلٹ گئیں اور وہ مسکرائی۔ لعربی نے اپنے ہاتھ کو بے ڈھب طریقے پر اپنے پہلو میں گرا لیا۔ "اچھا۔" ایک ناخوشگوار وقفہ در آیا؛ لعربی کو کہنے کے لیے کچھ نہ سوجھا۔ "اب میں چلتا ہوں۔"

جب لعربی کچھ پینے کی چیز لینے کے لیے باورچی خانے کی طرف بڑھا تو اسے تالے میں چابی کے گھومنے کی آواز سنائی دی۔ اس کی بیوی، سلمیٰ، ایک بازو پر اپنا چرمی بستہ اور دوسرے پر دھلی اور استری کی ہوئی قمیصوں کا دستہ سنبھالے، اندر داخل ہوئی۔ "معاف کرنا، مجھے دیر ہو گئی،" وہ بولی۔ "جج نے عدالتی کارروائی میں خاصا طویل وقفہ ڈال دیا۔" لعربی نے قمیصیں اس سے لے کر ڈیوڑھی میں پڑی کرسی پر ڈال دیں، اور پوچھا کہ نورا کی دوست کون ہے۔ سلمیٰ نے شانے جھٹکائے۔ "یونیورسٹی کی ساتھی ہے اس کی۔"

"یہ اس قسم کی لڑکی نہیں نظر آتی جیسی وہ لڑکیاں جنھیں میں اس کے ساتھ پہلے دیکھ چکا ہوں۔"

"یعنی بگڑی ہوئی لونڈیا، یہی مطلب ہے نا تمھارا؟" سلمیٰ نے خفیف سے طنز کے ساتھ اسے مسکرا کر دیکھا۔ نورا کی سہیلیوں کو برداشت کرنے کی اس میں تاب نہیں تھی، پرائیویٹ اسکولوں کی لڑکیاں جو اپنا زیادہ وقت کپڑوں اور کاروں کی فکر میں برباد کرتی تھیں۔ برسوں پہلے، سلمیٰ نے نورا کو فرانسیسی اسکول بھیجنے کے خیال پر نارضامندگی ظاہر کی تھی، اور کبھی کبھی لعربی بھی اس بات پر خود کو مجرم محسوس کرتا تھا کہ اس کی اپنی بیٹی اس تدریسی نظام کا حصہ نہیں ہے جسے چلانے میں وہ اعانت کر رہا ہے۔ تاہم اس نے اصرار کیا تھا، اس کی بیٹی میں اس قدر صلاحیت تھی، اور وہ اسے کامیاب ہوتے دیکھنا چاہتا تھا۔ بے شک سلمیٰ جیسی آدرش پرست بھی یہ بات سمجھ سکتی ہے۔

"میں چاہتا ہوں کہ وہ غلط قسم کی لڑکیوں سے میل جول نہ رکھے،" اس نے کہا۔

"ٹھیک رہے گی وہ،" سلمیٰ نے کہا، اور اسے اُسی 'عوامی عورت' والی نگاہ سے دیکھا جو وہ گاہے

کا بے اپنے پر طاری کر لیتی تھی اور جو اسے بے حد برافروختہ کر دیتی تھی — ہر سال چند مقدمے بلا معاوضہ لڑنے اور انسانی حقوق کی مراکشی تنظیم میں فعال ہونے کا یہ مطلب تو نہیں نکلتا تھا کہ وہ لعربی کے مقابلے میں بہتر سوجھ بوجھ بھی رکھتی تھی۔

فاطن لعربی کے گھر باقاعدگی سے آنے جانے لگی۔ آہستہ آہستہ وہ اس کی ڈھکی ڈھکائی ہیئت اور راہداری میں نورا کے دروازے کے باہر اس کے موٹے اور بل کھائے تلووں والے جوتے دیکھنے کا عادی ہو گیا۔ اب جبکہ نورا اس کے ساتھ اتنا زیادہ وقت گزارنے لگی تھی، لعربی اتوار کی دوپہر کو ہونے والے فٹ بال کے مقابلے اکیلے ہی دیکھنے لگا۔ اس ہفتے اس کی محبوب ٹیم — رباط کی ''فتح'' — اپنی دیرینہ حریف ٹیم — کاسابلانکا کی ''وداد'' — کے خلاف کھیل رہی تھی۔ سلمیٰ، جس کے لیے فٹ بال چائے کے دم پر آ جانے کے انتظار سے بس تھوڑا ہی زیادہ ولولہ انگیز تھا، قیلولہ کرنے چلی گئی۔ آدھے وقت کے وقفے میں جب لعربی بیئر لینے کے لیے باورچی خانے گیا تو اسے فاطن کی آواز سنائی دی۔ ''یہ ناانصافی جو ہم روز دیکھتے ہیں،'' وہ کہہ رہی تھی، ''شاہ حسن، حکومت، اور سیاسی پارٹیوں کے کرپشن کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔ لیکن اگر ہم بہتر مسلمان ہوتے تو ہو سکتا ہے کہ یہ مصائب ہماری قوم پر اور دوسری جگہوں کے مسلمانوں پر نازل نہ ہوئے ہوتے۔''

''تمھارا کیا مطلب ہے؟'' نورا نے پوچھا۔

''صرف اپنے خیالات اور اپنے اعمال کو پاک و صاف کر کے . . .''

لعربی راہداری میں چند قدم نورا کے کھلے دروازے کی طرف آیا، جسے اس نے اسے دیکھتے ہی فوراً بند کر دیا۔ وہ لونگ روم میں واپس آ گیا، جہاں اپنے مارلبورو سگریٹ اور بیئر سے شغل کرتا رہا اور بقیہ میچ پر بمشکل ہی کوئی توجہ دی۔

فاطن کے جانے کے فوراً بعد، لعربی نے نورا کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تاکہ معلوم کرے کہ ان کی گفتگو کا موضوع کیا تھا۔ وہ اس کے قریب کھڑا تھا، اور جب وہ بولا تو نورا کی ناک پر بل پڑ گئے۔ لعربی کو اچانک احساس ہوا کہ اس کی سانسوں سے الکحل کی بو آ رہی ہے، اور وہ پیچھے ہٹ گیا۔

''کچھ نہیں، بابا،'' اس نے کہا۔

''کیسے کہہ سکتی ہو کہ کچھ نہیں؟ وہ یہاں خاصی دیر تک رہی۔''

''ہم یونیورسٹی کے مسائل پر بات کر رہے تھے، بس اسی قسم کی باتیں۔'' وہ گھومی اور، اپنی ڈیسک کے سامنے کھڑے کھڑے چند نوٹ بکس کو تلے اوپر جمانے لگی۔

لعربی نے مداخلت کی۔ ''کیا مسائل؟''

نورا نے اسے ششدر ہو کر دیکھا، شانے اُچکائے، اور پھر چند سی ڈیز کو واپس ان کے ڈبوں میں رکھنے میں مصروف ہو گئی۔ اس کی ڈیسک کے اوپر دیوار پر ایک پیئنی (peony) کے پھول کی ریشم پر بنائی ہوئی تصویر تھی جس کی پنکھڑیاں کھلی ہوئی اور بے جان سی تھیں، اور اس کا وسط سفید اور گلابی تھا۔ لعربی کھڑا انتظار کرتا رہا۔ ''وہ مجھے بتا رہی تھی کہ پچھلے سال چند طلبا سالانہ امتحان میں نہیں بیٹھے تھے، پھر بھی پاس ہو گئے۔ میرا گمان ہے انھوں نے اساتذہ کو رشوت وغیرہ دی ہو گی۔''

''اسے ان چیزوں کا کیسے پتا چل سکتا ہے؟'' لعربی نے جبیں بہ جبیں ہو کر پوچھا۔

نورا نے ایک لمبی آہ بھری۔ ''اسے اس کا براہِ راست تجربہ ہے۔ وہ پچھلے سال فیل جو ہو گئی تھی۔''

''ہو سکتا ہے کہ اس نے حسبِ ضرورت محنت نہ کی ہو۔''

نورا نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور ایسے لہجے میں کہا جس سے واضح ہو گیا کہ اب لعربی کو یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے، ''جو پاس ہوئے محنت انھوں نے بھی نہیں کی تھی۔''

''وہ اپنی ناکامیابی کے لیے دوسروں کو تصوروار نہیں ٹھہرا سکتی۔''

نورا نے اپنے بال پونی ٹیل کی شکل میں اوپر کھینچے۔ اپنے سنگِ مرمری سطح والے ڈریسر سے ڈھیلی ڈھالی پتلون اور ٹی شرٹ نکالی، انھیں بستر پر اچھال کر ڈالا، اور کھڑی ہو کر، اس حال میں کہ ہاتھ کولھوں پر اور کہنیاں باہر کو نکلی ہوئی تھیں، انتظار کرنے لگی۔ ''اب میں شاور لینا چاہتی ہوں۔''

لعربی نے اپنی بیٹی کے چہرے کا جائزہ لیا، لیکن وہ کسی پلاسٹک کے نقاب کی طرح بے تاثر تھا۔ وہ کمرے سے چلا آیا۔

جب وہ خواب گاہ میں داخل ہوا تو سلمیٰ ہنوز سو رہی تھی۔ وہ آ کر بستر پر، چہرہ اس کی طرف کیے، بیٹھ گیا۔ سلمیٰ کے پپوٹوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس کے پوری طرح بیدار ہو جانے کا انتظار کیے

بشیر العربی نے کہا: "نورا اب اس لڑکی سے نہیں ملے گی۔"

"کیا؟" سلمیٰ آنکھیں کھولتے ہوئے بولی "کیا کہہ رہے ہو؟" اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے، جیسے وہ صورتِ حال کا جائزہ لینے اور صحیح دلائل قائم کرنے کے لیے تیار ہو چکی ہو۔

"میرے خیال میں یہ مناسب بات نہیں ہے۔ میں نے ابھی ابھی انھیں سیاست پر گفتگو کرتے ہوئے سنا تھا۔"

"تو پھر؟"

"مجھے ایسے نہ دیکھو، سلمیٰ۔ تم خوب جانتی ہو کہ میرا کیا مطلب ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ کسی چکر میں پھنسے۔ اگر کسی نے اسکول میں انیس شاہ کے بارے میں اس طرح گفتگو کرتے ہوئے سن لیا تو اچھی خاصی مصیبت آ سکتی ہے۔"

سلمیٰ نے لمبی آہ بھری اور کھڑی ہو گئی۔ "صاف پوچھو تو، میرے خیال میں فاطمہ سے ملنا اس کے لیے اچھا ہے۔ نورا کو یہ جاننا چاہیے کہ اس کے اردگرد کیا پیش آ رہا ہے۔"

"تمھارا مطلب؟"

"دنیا صرف فیشن اور فلموں کے گرد ہی نہیں گھوم رہی ہے۔"

"وہ اپنے چاروں طرف خود دیکھ سکتی ہے! اسے اس لڑکی کی کیا ضرورت ہے؟"

"دیکھو، نورا تعلیمی سال ختم ہونے پر جا ہی رہی ہے۔ میں تو نہیں سمجھتی کہ اس کے بعد وہ ایک دوسرے سے مل سکیں گی۔" سلمیٰ نے اپنا لباس درست کیا اور اپنی بیلٹ کو کسا۔ "تم تو رائی کا پہاڑ بنا رہے ہو،" اس نے کہا۔ وہ اس قسم کی عورت تھی جو بحث کو کسی ضرب المثل کے ساتھ ختم کرنے کی عادی تھی۔

العربی نے اپنا سر ہلایا۔

"ارے ہاں،" سلمیٰ بولی۔ "تم یقین نہیں کرو گے کہ آج صبح کس نے فون کیا تھا۔ سی توفیق یاد ہے تمھیں؟"

"بالکل، بالکل،" العربی نے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔ اس نے سی توفیق کی بھتیجی کے سلسلے میں مدد کرنے کا ارادہ پہلے سے کر لیا تھا۔ "میں اسے فون کر لوں گا۔"

Scanned with CamScanner

جوں جوں ہفتے گزرتے گئے، نورا اپنی کتابوں میں زیادہ سے زیادہ غرق نظر آنے لگی۔ اکتوبر میں ایک سنیچر کی دوپہر لعربی نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ تھیٹر جانا چاہتی ہے۔ تفریحی پروگرام ایک اسٹینڈ اپ کامیڈین پیش کر رہا تھا جس پر دو سال تک پابندی رہی تھی اور ابھی حال ہی میں دوبارہ اجازت ملی تھی۔ شو کے سارے ٹکٹ بک چکے تھے۔ لعربی کے خیال میں یہ اچھا ہوتا کہ نورا اپنی اتنی کڑی پڑھائی کے درمیان ذرا سی تفریح بھی کر لے۔

''مجھے ایک مضمون لکھنا ہے،'' وہ بولی۔ قرآنی قرأت کی مدھم سی آواز اس کے سی ڈی پلیئر سے لہرائی۔

''اتنا اچھا موقع گنوا رہی ہو،'' لعربی نے کہا۔ یہ پہلی مرتبہ نہیں تھا کہ نورا نے گھر سے باہر تفریح میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ پچھلے ہفتے ہی اس نے ٹینس کا فائنل میچ دیکھنے کی دعوت بھی قبول نہیں کی تھی، اور اس سے دو ہفتے پہلے اپنے دور کی عم زاد کی منگنی کی رسم پر ان کے ساتھ جانے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ وہ ہمیشہ اچھی طالبہ رہی تھی، لیکن لعربی ان دنوں اس کی اس سخت محنت کی وجہ نہیں سمجھ پایا۔ یہ سہل سا سال تھا، بس انگریزی ہی تو بہتر کرنی تھی۔ اگلے سال نیویارک میں پڑھائی کرنے کے لیے بہتیرا وقت پڑا ہے۔ ''چلو، آؤ،'' اس نے کہا۔ ''تھوڑی سی تبدیلی کی خاطر ہی سہی، کچھ وقت تو اپنے باپ کے ساتھ گزارو۔''

''اچھا، بابا،'' نورا بولی۔

تھیٹر کے راستے میں، لعربی نے ریئر ویو آئینے میں نورا پر نظر ڈالی۔ ''تم میک اپ نہیں کیے ہوئے ہو،'' اس نے تبصرہ کیا۔

سلمیٰ ہنسنے لگی۔ ''اب یہ نہ کہو کہ تمھیں اس کے کاجل سرمے کی اتنی فکر ہے۔''

''بس یونہی کہہ رہا ہوں۔ آخر تھیٹر جا رہے ہیں۔''

''میں صرف دوسروں کا دل خوش کرنے کے واسطے کیوں اپنے پر رنگ روغن کرتی پھروں؟'' نورا نے برہمی سے کہا۔

سلمیٰ نے ڈرائیور کی مخالف طرف والا آئینہ نیچے کیا اور اس میں اپنی لڑکی کا جائزہ لیا۔ ''میرا

خیال تھا کہ تم رنگ روغن اپنی خوشی کے لیے کرتی ہو۔"

نورا نے اپنے بے سجاوٹ ناخن کترے، اور اپنے سر کو اس طرح جھکایا جس کا مطلب ہاں بھی نکل سکتا تھا اور نا بھی، پھر شانے اچکائے۔

کامیڈین کے پروگرام میں کٹیلے طنزیہ خاکے اور گانے ملے جلے تھے، اور گو اس کے چاروں طرف بھی ہنس رہے تھے، العربی کو محسوس ہوا کہ وہ اطمینان سے حظ نہیں اٹھا پا رہا۔ وہ نورا سے بات چیت کرنا چاہتا تھا لیکن اسے اندیشہ تھا کہ وہ پھر یہی کہہ دے گی کہ کوئی بات نہیں ہے۔

اگلے دن العربی بیٹی کے اسکول چلے جانے کا انتظار کرتا رہا تاکہ چپکے سے اس کے کمرے میں داخل ہو، لیکن کس چیز کی تلاش میں؟ اس کے بارے میں اسے کوئی علم نہیں تھا۔ کھڑکیاں کھلی تھیں اور سورج فرش پر درختوں کے سائے ڈال رہا تھا۔ العربی بیٹی کے بستر پر بیٹھ گیا۔ اسے تعجب ہوا کہ وہ قرینے سے بچھا ہوا ہے۔ کروشیے کے کام کا بستر پوش سلیقہ مندی سے چاروں طرف ٹھیک طرح پھیلا ہوا ہے۔ نورا ہمیشہ پھوہڑ رہی تھی، اور وہ اکثر مذاق میں کہتا تھا کہ اس کے کمرے سے باہر نکلنے کا راستہ پانے کے لیے اسے باقاعدہ قطب نما کی ضرورت ہوگی۔ اب بیٹی کی اس یکایک صفائی ستھرائی پر شک وشبہ کرنے پر اس نے خود کو احمق محسوس کیا۔ سلمٰی ٹھیک ہی کہتی تھی، وہ بلاوجہ پریشان ہو جاتا ہے۔ وہ کمرے سے نکلنے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ نائٹ اسٹینڈ پر رکھی ایک بھڑک دار پیپر بیک پر اس کی نظر جا پڑی اور اس نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یہ سیاسی اسلام سے متعلق کتاب تھی۔ ورق گردانی کرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ چھپائی کا معیار بہت گھٹیا ہے اور متن کتابت کی اغلاط سے اٹا پڑا ہے۔ آخر نورا کو اس سے کیا سروکار ہو سکتا ہے؟ اس نے کتاب کو واپس نائٹ اسٹینڈ پر ڈال دیا، جہاں وہ ایک اور موٹی سی کتاب سے ٹکرائی، اور یہ والی چرمی جلد بندی کی تھی۔ العربی نے سر پہلو کی طرف جھکایا تاکہ کتاب کی پشت کی چھپائی پڑھ سکے۔ یہ مصری مختلف الرائے (dissident) اور اخوان المسلمین کے رکن سید قطب کی معالم الطریق تھی۔ اسے شک ہوا کہ نورا، جس کی تعلیم و تربیت فرانسیسی اسکول لی سے دیکارت میں ہوئی تھی، اس قسم کی کتاب کی مغلق کلاسیکی عربی پڑھ بھی سکتی ہے، لیکن نائٹ اسٹینڈ پر اس کی موجودگی نے اسے بڑے اتاؤلے پن سے سارے کمرے میں دیگر سراغوں کی تلاش پر لگا دیا۔ نورا کے اسٹیریو کے برابر اسے ٹیپس کا ایک ڈھیر نظر آیا، اور جب اس نے ان میں سے ایک کو بجا کر سنا تو

Scanned with CamScanner

اس میں فقرے متعلق تبصرہ نکلا، جس میں بیچ بیچ میں نوجوانوں کی اخلاقی بداعمالیوں پر سخت لعن طعن بھی کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ اسے کوئی اور غیر معمولی چیز ہاتھ نہیں آئی۔

جب نورا دوپہر کے کھانے کے لیے گھر آئی تو وہ لونگ روم میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے ہاتھ میں سید قطب کی کتاب اٹھا کر پوچھا۔

''آپ میری چیزوں کی تلاشی لے رہے تھے؟'' نورا نے تعجب کے ساتھ اور مجروح ہو کر کہا۔

''میری بات سنو۔ اور میں دہراؤں گا نہیں۔ یہ لڑکی فاطن... تم آئندہ اس سے نہیں ملو گی۔''

''کیوں؟''

''وہ تمھارے ساتھ جو کچھ کر رہی ہے مجھے پسند نہیں۔''

''وہ میرے ساتھ کیا کر رہی ہے، بابا؟''

''میں اس لڑکی کو اب اپنے گھر میں نہیں دیکھنا چاہتا۔ صفی، بس!''

نورا نے اسے بڑی رنجیدگی سے دیکھا، اپنی ایڑیوں پر گھومی، اور کمرے سے چلی گئی۔ جب ماما نے کھانا لگا دیا، تو نورا نے کہا کہ اسے بھوک نہیں ہے۔ لعربی نے کوئی تردد نہیں کیا۔ کسی مصیبت میں پڑ جانے والی سے منہ بسورتی بچی بہتر۔

چند ہفتوں بعد، رمضان شروع ہونے سے ایک دن پہلے ہی نورا نے اعلان کیا۔ سلمٰی باورچی خانے میں پاؤں گھسیٹتی آ جا رہی تھی، جہاں ماما ماہِ مبارک کے واسطے بریوات [میٹھے سموسے] بنانے کے لیے اوون میں تیل بھون رہی تھی۔ لعربی وہ تصویریں دیکھ رہا تھا جو نادر نے بھیجی تھیں، اپنے نئے اپارٹمنٹ کی تصویریں جس میں وہ ایک دوست کے ساتھ حال ہی میں منتقل ہوا تھا، اور وہاں لیپ ٹاپ کا دور دور تک کوئی نشان نہ پا کر، جس کی احتیاج کا لڑکے نے رونا رویا تھا، اسے برہمی سے زیادہ تفریح محسوس ہوئی۔

''تم اسے بگاڑ رہے ہو،'' سلمٰی نے کہا۔

''اسے ماسٹر کی ڈگری ملنے والی ہے،'' لعربی نے جواب دیا۔

نورا کھانے کے کمرے میں آئی اور ناشتے کی میز کے پاس بیٹھ گئی۔ ''میں نے حجاب پہننے کا

فیصلہ کیا ہے۔'' سلمیٰ اپنی لڑکی کے ہاتھ کی طرف بڑھی اور اس نے میں کافی کی پیالی اُلٹ دی۔ اس نے میز سے اپنی کرسی کھسکا کر دور کی اور داغ پڑے میز پوش کو اپنے نیپکن سے خشک کیا۔

''کیا؟ کیوں؟'' لعربی نے تصویروں کو میز پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''اس لیے کہ خدا ہمیں اس کا حکم دیتا ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے،'' نورا نے جواب دیا۔

''یہ تم قرآن کا حوالہ کب سے دینے لگی ہو؟'' اس نے کہا، زبردستی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے۔

''صرف دو آیتوں میں سر پوش کا ذکر آیا ہے۔ تمھیں چاہیے کہ ان پر سیاق و سباق کے لحاظ سے غور کرو،'' اس کی ماں نے حجت کی۔

''آپ کا اس پر ایمان نہیں کہ قرآن خدا کا کلام ہے؟'' نورا نے پوچھا۔

''بیشک میں اس پر ایمان رکھتا ہوں،'' لعربی بولا، ''لیکن وہ زمانہ دوسرا تھا۔''

''اگر آپ حجاب سے متفق نہیں، تو آپ خدا سے بھی متفق نہیں،'' اس نے کہا۔ اس کے لہجے کے اعتماد نے لعربی کو خوفزدہ کر دیا۔

''اور تمھارا خدا سے براہ راست فون کے ذریعے رابطہ ہے، ہوں؟'' وہ بولا۔

سلمیٰ نے اپنا ہاتھ اٹھایا تاکہ لعربی کو روکے۔ ''تم میں کیا بلا سما گئی ہے!'' اس نے اپنی بیٹی سے پوچھا۔ نورا نے نظریں جھکا لیں۔ اس نے اپنے پیر کے انگوٹھے سے سرخ قالین پر بڑا پیچیدہ اقلیدسی نقش بنایا۔ ''ان آیات کا تعلق حیا سے ہے،'' سلمیٰ نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اس کے علاوہ، وہ جاہلیت کے گمراہ ایام تھے، اکیسویں صدی نہیں۔''

''خدا کے احکام تمام وقتوں کے لیے سچے ہیں،'' نورا نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ ''اور ایک لحاظ سے، ہم ہنوز دورِ جاہلیت ہی میں ہیں۔'' لعربی اور سلمیٰ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ نورا نے پھر گہری سانس لی۔ ''رباط کی سڑکوں پر عورتوں کو ہمیشہ تنگ کیا جاتا ہے۔ حجاب ایک امان ہے۔''

سلمیٰ نے جواب دینے کے لیے منھ کھولا لیکن اس میں سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ لعربی کو پتا تھا کہ اس کی بیوی ان جوکی آنکھوں والے جوانوں کے بارے میں سوچ رہی ہے، اور یہ کہ وہ کسی

خوبصورت لڑکی کو دیکھتے ہی کس طرح سیٹیاں بجانے لگتے ہیں لیکن اُن لڑکیوں کو جو حجاب پہنے ہوئے ہوں کبھی نہیں چھیڑتے۔ ''تو پھر کیا ہوا؟'' لعربی نے کہا، اس کی آواز اب بلند ہو چکی تھی۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ ''مرد تہذیب سے پیش نہیں آ سکتے تو کیا یہ ضروری ہے کہ میری بیٹی اپنے کو ڈھانچی پھرے؟ انھیں اپنی نگاہیں پھیر لینی چاہئیں۔ یہ بھی تو قرآن میں آیا ہے، تمھیں پتا ہے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ یہ مسئلہ کیوں بن گیا ہے،'' تورا نے کہا۔ ''یہ معاملہ میرے اور خدا کے درمیان ہے۔'' وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی، اور وہ میز کے دونوں سروں سے ایک دوسرے کی طرف گھورنے لگے۔ آخر کار تورا کھانے کے کمرے سے چلی گئی۔

لعربی دہل کر رہ گیا تھا۔ اس کی واحد بیٹی، اور یوں کسی جاہل دہقانی کے پیرہن میں! لیکن دہقان بھی اس قسم کا لباس نہیں پہنتے تھے۔ وہ روایتی دہقانی لباس پہننے کی بات کب کر رہی تھی۔ نہیں، وہ تو اخوان المسلمین کی نئی نسل کے لوازمات چاہتی تھی: چہرے کے گرد مضبوطی سے لپیٹا گیا سر پوش، آنکھوں میں لنگر انداز گمبھیر تاثر۔ اس کی عزیز بیٹی۔ وہ اُن بلوائیوں جیسی لگے گی جو ٹی وی کی خبروں کے چینلو پر دکھائے جاتے ہیں، آنکھیں لپکتی جھپکتی، منھ پھٹاس کھلے، مٹھیاں ہوا میں بلند۔ لیکن ہو سکتا ہے، اس نے اپنے سے کہنے کی کوشش کی، یہ بس آنی جانی دلچسپی ہو، ہو سکتا ہے کہ یہ جلد ہی رخصت ہو جائے۔ آخر تورا پہلے بھی کئی چیزوں پر فریفتہ ہو چکی ہے۔ ایک وقت تھا جب وہ تمباکو نوشی کی بڑی شدید مخالف رہی تھی۔ جب وہ دیکھ نہ رہا ہوتا، اس کے سگریٹ اٹھا کر پھینک دیتی تھی، ڈامبر سے سیاہ پڑے ہوئے جگروں کی تصویریں کتابوں سے تراش کر ریفریجریٹر کے دروازے پر ٹیپ سے چپکا دیا کرتی تھی۔ انجام کار اس نے باپ کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ اس نے لگاتار چند تفریحی مشغلے بھی بڑے حیرت ناک جوش و خروش سے پالے تھے اور پھر چند مہینوں بعد ہی انھیں بغیر کسی ظاہری وجہ کے چھوڑ چھاڑ دیا تھا — زیورات کی صناعت، ڈبے جمع کرنا، نے نوازی، اشاراتی زبان۔ لیکن اگر یہ شوق مختلف نکلا تو؟ اگر وہ اس کے ہاتھوں اسے کھو بیٹھا تو... اس اندھے پن کے ہاتھوں جسے وہ بصیرت سمجھے بیٹھی ہے؟

اسے وہ دن یاد آیا، بہت پہلے کا وہ دن، جب وہ اسے تقریباً کھو بیٹھا تھا۔ وہ صرف دو سال کی تھی۔ وہ پورا دن گزارنے تمارہ کے ریتیلے ساحل پر گئے ہوئے تھے، اور نادر نے آئس کریم مانگی تھی۔ لعربی نے آواز دے کر ایک ٹھیلے والے کو بلایا تھا جو ساحل پر چکر لگا رہا تھا۔ اس نے کونز کی قیمت

چکائی، ایک کون سلمٰی کو دیا اور ایک کون نادر کو، لیکن جب نورا کو اس کا کون دینے کے لیے مڑا تو وہ غائب تھی۔ وہ گھنٹوں اسے تلاش کرتے رہے۔ اسے سورج کی تمازت سے اپنا جلتا ہوا چہرہ یاد آیا، اس کی گردن کے پیچھے کی رگ کس طرح خوف اور پریشانی سے پھڑ پھڑا رہی تھی، ریت پر چلتے چلتے کس طرح اس کے پیر سوج گئے تھے۔ اسے وہ آنسو یاد آئے جو تلاش کے دوران سلمٰی کی آنکھوں سے مسلسل ایک جھڑی کی صورت گرتے رہے تھے۔ آخرکار ایک بوڑھی عورت سرگرداں بچی کو لیے پولیس اسٹیشن پہنچی۔ نورا سیپیاں جمع کرنے چلی گئی تھی، اور بڑھیا کو یہ سمجھنے میں کچھ دیر لگی کہ چٹان پر گم سم بیٹھی بچی اکیلی ہے۔ لعربی نے اپنے سے عہد کیا کہ وہ پھر کبھی اسے اپنی آنکھ سے دور نہیں ہونے دے گا، لیکن اس دن کی دہشت دراتی ہوئی لوٹ آئی، اور اس کے بوجھ نے اسے ہاتھوں میں سر تھام کر کرسی پر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔

چند لمحوں بعد، لعربی کو راہداری میں نورا کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ اسے آئینے کے سامنے کھڑا دیکھ سکتا تھا، اس کا چھائیاں پڑا چہرہ لونگ روم سے آتی ہوئی روشنی کی سمت میں مڑا ہوا، سر پر حجاب اوڑھتے ہوئے، ٹھوڑی کے نیچے گرہ لگاتے ہوئے تاکہ اس کا سر پوری طرح سے ڈھک جائے۔ اس سے قبل کہ وہ سوچتا کہ کیا کر رہا ہے، وہ اس کی طرف جھپٹا اور حجاب اس کے سر سے نوچ لیا۔ نورا نے چیخ ماری۔ سلمٰی کھانے کی میز سے اٹھ کھڑی ہوئی لیکن اپنی بیٹی کی مدد کو نہیں پہنچی۔

"آپ کیا کر رہے ہیں؟" نورا نے چلا کر کہا۔

"میں تمھیں اس حلیے میں باہر نہیں جانے دوں گا۔" لعربی نے حجاب فرش پر پھینک دیا۔

"آپ مجھے نہیں روک سکتے!"

لعربی نے کچھ کہا نہیں۔ اسے معلوم تھا کہ وہ بالکل درست کہہ رہی ہے، ظاہر ہے وہ اسے تالے چابی میں نہیں رکھ سکتا، صرف اس لیے کہ وہ اپنا سر شہر کی نصف زنانہ آبادی کی طرح ڈھانکے ہوئے ہے۔ نورا نے اپنا حجاب اٹھایا اور خاموشی سے اسے دوبارہ سر پر باندھنے لگی۔ پھر اس نے خدا حافظ کہا اور باہر نکل گئی۔ لعربی نے مڑ کر بیوی کو دیکھا، جس کے چہرے پر حواس باختگی کا ویسا ہی [illegible] تھا جیسا اس وقت تھا جب نورا نے پہلی بار بولنا شروع کیا تھا۔

رمضان کی پہلی رات سلمٰی نے اپنے بہترین چینی کے برتن نکالے اور خود ہی میز لگائی۔ اس نے ماما کو اپنے خاندان والوں کے ساتھ رمضان منانے کے لیے گھر بھیج دیا تھا۔ اس نے ایک ایک کر کے وہ کھانے نکالے جو انھوں نے اس دن مل کر پکائے تھے: بھیڑ کے گوشت کا حریرہ، شہد سے لپڑا بغریر، تل کی شبا کیہ، پسے ہوئے بادام اور شکر بھری کھجوریں، اور مختلف گری دار خشک پھلوں کی سینی۔ لعربی نے نورا کو آواز دی کہ کھانے کا وقت ہو گیا ہے، پھر بیٹھ کر اذان ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ اس لمحے کا جب دن جھٹ پٹے میں بدل جاتا ہے، افطار کا وقت، جب وہ کھا سکیں گے۔ آخر کار نورا نے اپنا سر اندر کیا اور کھانے کے کمرے کی دہلیز پر گم سم کھڑی ہو گئی۔ لعربی نے اس کے دل آویز بالوں کو دیکھا، اُن کی گھونگر یالی لٹیں اس کے سینے تک آ رہی تھیں۔ یہ اس بات کی علامت تھی جو اس نے خود اپنی مرضی سے اختیار کی تھی۔

ٹی وی کے اناؤنسر نے ظاہر ہو کر اطلاع دی کہ سورج غروب ہو گیا ہے، اس کے فوراً بعد مغرب کی اذان بند ہوئی۔ سلمٰی نے نورا کو اشارہ کیا۔ ''بیٹھو، کھانا شروع کریں۔''

''میں روزہ صرف پانی سے کھولوں گی۔ کھانا مغرب کی نماز پڑھ کر کھاؤں گی۔''

سلمٰی نے لعربی کی طرف دیکھا۔ ''ٹھیک ہے،'' وہ بولا۔

نورا نے مزید کہا، ''رمضان میں ہم سے سادہ کھانوں کی توقع کی جاتی ہے، ان جیسے تعیشات کی نہیں۔'' اس نے میز پر چنے پُر تکلف کھانوں کی طرف اشارہ کیا جو اس کی ماں نے تیار کیے تھے۔

لعربی کو اپنی بھوک غائب ہوتی محسوس ہوئی۔ اس کے بجائے اسے سگریٹ اور تیز مشروب کی طلب ہوئی، خاص طور پر اسکاچ کی۔ ظاہر ہے، شہر بھر میں کوئی دکان اگلے انتیس دن تک الکحل نہیں بیچنے والی تھی۔ اس نے خواہش کو مجبوراً دبا لیا۔ یہ رمضان بڑا طویل ثابت ہوگا۔

''ہم تمھارا انتظار کریں گے،'' اس نے کہا۔

نورا لوٹنے کے لیے مڑی، لیکن پھر رک گئی۔ ''خیر، چلیے، ذرا سا شبا کیہ چکھ لیتی ہوں،'' وہ بولی۔ اور اس نے مٹھائی کا خوب بڑا سا نوالہ لیا۔

''تمھی نے نہیں کہا تھا کہ یہ بہت پر تعیش کھانا ہے؟'' سلمٰی نے پوچھا۔

گھر والوں کے پاس ایک دوسرے سے بات کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ ماضی میں،

رمضان کی پہلی رات ہمیشہ بڑی خاص ہوا کرتی تھی: عزیز و اقارب اور دوست احباب میز کے گرد بیٹھتے، اپنے روزے کی حکایتیں سناتے اور حرے لے لے کر کھاتے، لیکن ان دنوں لعربی اتنی فکروں میں غلطاں تھا کہ کسی اور کو مدعو کرنے کا خیال نہ آیا۔

یہ خشک سالی کا ایک اور سال تھا— نومبر ختم ہو رہا تھا اور بارش ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔ اپنے ڈیسک کے کیلنڈر کو دیکھتے ہوئے، لعربی کو دھیان آیا کہ نیویارک یونیورسٹی میں داخلے کی عرضی کا وقت سر پر آ رہا ہے۔ نورا کا حال دشوار گزار سہی، اس کے مستقبل کو تو وہ امید بھری نظروں سے دیکھ سکتا ہے۔ جب سے اس نے حجاب پہننا شروع کیا تھا، لعربی نے دفتر میں اس کا تذکرہ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اسے اپنے جیسے کسی شخص کے لیے یہ بات خلاف شان لگتی کہ اس کی بیٹی حجاب پہنتی ہو، اور وزارت میں اگر کوئی اس کی بیٹی کی بابت پوچھتا بھی تو وہ نپا تلا جواب دینے پر اکتفا کرتا۔

دفتر سے لوٹنے کے بعد وہ اسے اپنے کمرے میں ماں کے ساتھ نئے پردے ٹانگنے میں مصروف دکھائی دی۔ لعربی نے پوچھا کہ داخلے کی عرضی کے لیے جو مضمون اس نے لکھا ہے، کیا وہ بھیجنے سے پہلے اسے پڑھوا سکتی ہے۔

''میں عرضی نہیں دے رہی ہوں،'' نورا نے جواب دیا۔ اس نے آخری پردہ مہاگنی کے پتلے سے ڈنڈے پر سرکایا۔

لعربی نے اسے گھور کر دیکھا۔ ''کیوں نہیں؟''

''کیونکہ میں اگلے سال کے ختم پر یونیورسٹی چھوڑنا چاہتی ہوں۔ میں ثانوی اسکول کی استانی بننا چاہتی ہوں۔''

''اقتصادیات پڑھنے کا تمھارا منصوبہ کیا ہوا؟'' سلمیٰ نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''مراکش کو میری ضرورت ہے۔ آپ دونوں ہمیشہ اساتذہ کی کمی کا ذکر کرتے رہتے ہیں،'' نورا نے کہا۔

''تمھارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے؟ تم اساتذہ کی کمی کا مسئلہ نہیں حل کر سکتیں۔''

''تو کیا اپنے ملک کی مدد کرنا پاگل پن ہے؟'' وہ مڑی اور اپنے ڈیسک پر چڑھ گئی تاکہ ڈنڈے

کو بریکٹس میں بٹھا سکے۔

''دیکھو، یہ مدد تم استانی کے مقابلے میں ماہرِ اقتصادیات بن کر زیادہ اچھی طرح کر سکتی ہو،'' لعربی نے کہا۔ ''ہونہہ، یہ اس کی اُسی دوست کا کیا دھرا ہے،'' اس نے اپنی بیوی کی طرف رخ پھیر کر اضافہ کیا۔ ''اُسی نے اس کے سر میں یہ خیالات بھر دیے ہیں، اور اب یہ اپنے طور پر کچھ نہیں سوچ سکتی۔''

''کوئی میرے سر میں کچھ نہیں بھر رہا،'' نورا نے کھڑکی کے برابر کھڑے ہوئے کہا۔ آخرِ دوپہر کی روشنی اس کے بالوں پر پڑ رہی تھی۔ ''ہمارے نظام میں بہت زیادہ کرپشن ہے، اور میں اس کے حل میں شریک ہونا چاہتی ہوں۔'' لعربی کو گمان ہوا کہ کہیں اس جملے سے نورا کا اشارہ اس کی طرف تو نہیں۔ نہیں، یہ ناممکن ہے۔ اس نے ہمیشہ اپنے دھندے اپنی بیوی اور بیٹی سے مخفی رکھے تھے۔ تاہم، اس نے جواب نہ دینے ہی میں بہتری سمجھی۔ نورا ڈیسک سے نیچے کودی۔ ''علاوہ ازیں، اسٹینفس میں پڑھنے کیوں جایا جائے جبکہ میں اتنی ہی آسانی سے یہاں بھی پڑھ سکتی ہوں؟''

''تجربہ حاصل کرنے کے لیے، بیٹی،'' سلمٰی نے کہا۔

''اور آپ کا خیال ہے کہ امریکہ میں لوگوں کو میری ضرورت ہے؟'' نورا نے آواز اونچی کرتے ہوئے کہا۔ ''امریکی ہم سے نفرت کرتے ہیں۔''

''یہ تم کیسے جان سکتی ہو جب تم کبھی وہاں رہیں ہی نہیں؟'' سلمٰی نے پوچھا۔ ''تمھارے بھائی نے تو کبھی ایسی شکایت نہیں کی۔ کیوں نہیں اس سے بات کر کے دیکھتیں؟''

''وہ کینیڈا میں ہے،'' نورا نے برہمی سے تھوکنے کی آواز نکالی، جیسے اس کی ماں یہ فرق سمجھنے سے عاجز ہو۔

''تمھارا اسلام باپ کی بات سننے کی تلقین نہیں کرتا؟'' لعربی نے پوچھا۔

''صرف اس وقت جب میرا باپ راہِ راست پر ہو۔''

''اچھا، تو مبارک ہو۔ تبھی راہِ راست پر گامزن ہو،'' اس نے کہا

''بَرَکہ!'' سلمٰی نے کہا۔ وہ کھڑی ہو گئی۔ ''اور وہ تمام سال جو تم نے انگریزی پڑھنے میں لگائے؟ وہ تمام منصوبے جو تم نے بنائے تھے؟''

"میں واقعی استانی بننا چاہتی ہوں،" نورا بولی۔

"ٹھیک ہے سوچ لو کیا کر رہی ہو، یا نورا تمھاری عمر کے لوگ اس جیسا موقع ملنے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے، اور تم اسے ضائع کیے دے رہی ہو۔"

"میں یہیں رہنا چاہتی ہوں،" نورا نے کہا، اور نئے پردوں کو کھینچ کر بند کر دیا۔

فاطمہ کو کھانے پر بلانے کی تجویز سلمیٰ کی تھی۔ العربی رضامند ہو گیا تھا، شروع میں بادل ناخواستہ، بعد میں راضی بہ رضا، یہ سوچتے ہوئے کہ اگر وہ اپنی بیٹی کی دوست کو کچھ بہتر سمجھ سکے تو شاید اس کے ہوش و حواس درست کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ یہ جمعے کی شام تھی، اور میز پر وہ نئے برتن لگائے گئے تھے جو سلمیٰ نے ابھی حال میں خریدے تھے۔ العربی میز کی صدر کرسی پر بیٹھا اور نورا اس کے بائیں پہلو میں۔ سلمیٰ دائیں طرف بیٹھی، فریم میں آویزاں اپنی جوانی کی سلویٹ (silhouette) کے نیچے۔ کوئی پچیس سال پہلے، پیرس میں اپنے ماہ عسل کے دوران، وہ مونمارت گئے تھے، جہاں ایک آرٹسٹ نے انھیں اپنی سلویٹس بنوانے پر راضی کر لیا تھا۔ اپنی قینچی کے چابک دست استعمال سے اس بوڑھے آرٹسٹ نے سلمیٰ کی گات و گیسو کو وہی بڑا اجاگر کیا تھا، اور وہ اس پر خوش ہی تھی، وہ اچھی خاصی پُرکشش دکھائی دیتی تھی۔

فاطمہ العربی کے سامنے میز کے دوسرے سرے پر بیٹھی، پُرسکون اور پُرتمکنت۔ اس کی آنکھیں شہد رنگ کی تھیں، ہونٹ چھوٹے چھوٹے، اور اس کی جلد کا رنگ اتنا صاف تھا کہ لگتا جیسے کمرے کی ساری روشنی اسی پر مرتکز ہو۔ دوسرے الفاظ میں، وہ بے حد خوبصورت تھی۔ اس بات نے العربی کو پاگل کر دیا۔ خدا خوبصورت ہے، اور وہ خوبصورتی کو پسند کرتا ہے، تو پھر اسے اس بے ضرورت کپڑے کے پیچھے کیوں پوشیدہ رکھا جائے؟

ماما خاص پکوان لائی، شوربے دار مرغ جس میں سیاہ زیتون اور محفوظ شدہ لیموں پڑے ہوئے تھے۔ "شکریہ، مام..." فاطمہ نے سر اوپر اٹھا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"میمونہ،" ماما نے بتایا العربی کی جانب نگاہ ڈالتے ہوئے۔

"شکریہ، میمونہ،" فاطمہ بولی۔

Scanned with CamScanner

''جیتی رہو،'' میمونہ نے جواباً مسکرا کر کہا۔

لعربی نے کھانا شروع کیا، وقفے وقفے سے فاطن پر بھی نظر ڈال لیتا۔ اسے یہ دیکھ کر کچھ اطمینان ہوا کہ فاطن کی تربیت میں اونچے طبقے سے ذرا کم ہی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اس نے استعمال کے بعد اپنی چھری واپس میز پر رکھ دی تھی۔ جب کھانے پینے میں معقول وقت گزر گیا اور سب کھانے کے ذائقے اور نفاست کی حسب دلخواہ تعریف بھی کر چکے، تو لعربی نے اپنا گلا صاف کیا۔

''بیٹی، تمھاری کیا عمر ہے؟'' اس نے پوچھا، اتنے مشفقانہ لہجے میں جو وہ لڑکی کے لیے مہیا کر سکتا تھا۔

''انیس،'' فاطن نے جواب دیا۔

''نورا نے مجھے بتایا ہے کہ تم اس سال دوبارہ امتحان دے رہی ہو،'' وہ بولا۔

نورا نے باپ کی طرف ایک برہم نگاہ ڈالی۔

''یہ درست ہے،'' فاطن نے کہا۔

''مجھے یہ سن کر افسوس ہوا۔ تمھیں خاصی آزردگی محسوس ہوئی ہوگی۔''

نورا نے اپنا کانٹا اپنی پلیٹ کے پہلو میں دے مارا اور اپنی ٹھوڑی ہاتھوں میں گرا لی۔ اس نے سخت برافروختگی سے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔

سلمٰی نے مداخلت کی۔ ''اور کیا تم رباط ہی کی رہنے والی ہو؟'' اس نے خوشگوار لہجے میں فاطن سے سوال کیا۔

''میں پیدا یہیں ہوئی تھی، لیکن پلی بڑھی اغادیر میں۔ چار سال پہلے ہی یہاں لوٹی ہوں۔''

''تو تمھارے والدین کہاں رہتے ہیں؟'' لعربی نے پوچھا۔

''میں اپنی والدہ کے ساتھ رہتی ہوں۔'' فاطن کی آواز کچھ دھیمی پڑ گئی۔ ''والد الحاجہ میں۔''

سلمٰی نے روٹی کی ڈلیا اٹھائی اور فاطن کو پیش کی۔ ''کچھ اور لو،'' وہ بولی۔

''ایک بات پوچھتا ہوں،'' لعربی نے کہا۔ ''اگر کوئی تمھیں نیویارک میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع دے تو کیا تم قبول کر لوگی؟''

''پھر وہی،'' نورا نے لمبی آہ بھری۔ اس کے باوجود ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے بھی اپنی سہیلی کے جواب میں دلچسپی ہو، کیونکہ اس نے رخ پھیرا اور جواب کا انتظار کرنے لگی۔

فاطن نے نظر چرائی۔ "مجھے کوئی موقع نہیں دے رہا۔"

"لیکن اگر دے تو؟"

"میں یہ جاننا چاہوں گی کہ یہ موقع مجھے کیوں پیش کیا جا رہا ہے۔ کوئی چیز مفت نہیں دی جاتی۔ ہمارے بعض نوجوانوں کی ساری مصیبت یہی ہے۔"

لعربی کو محسوس ہوا کہ فاطن بس اب وعظ شروع ہی کرنے والی ہے، چنانچہ اس نے بابا کو اور پانی لانے کی ہدایت کی۔ میمونہ پانی کی ایک اور بوتل لائی اور فاطن کا گلاس دوبارہ بھر دیا۔ لیکن لعربی کا گلاس بھرے بغیر ہی لوٹ گئی۔ "تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد تم کیا کرنا چاہتی ہو؟" اس نے فاطن سے پوچھا۔

"مجھے ٹھیک سے پتا نہیں۔ یہ سب خدا کے ہاتھ میں ہے۔"

"میری بیٹی اسکول چھوڑنا چاہتی ہے، نیویارک یونیورسٹی نہیں جانا چاہتی، اور قریوں میں پڑھانے جانا چاہتی ہے۔"

فاطن موافقت میں مسکرائی۔ "بہت بھلائی کرے گی۔"

"تمھارا کیا خیال ہے، غیر ملکی سند اس کے لیے بہتر نہیں رہے گی؟"

"نہیں، میں ایسا نہیں خیال کرتی۔ یہ بڑی شرم کی بات ہے کہ ہم اپنی اسناد کے مقابلے میں باہر کی اسناد کی زیادہ قدر کرتے ہیں۔ ہم مغرب سے اپنی محبت میں اتنے اندھے ہو گئے ہیں کہ اپنے ذہین ترین دماغوں کو یہاں رکھنے کے بجائے، جہاں ہمیں ان کی ضرورت ہے، اُن کے حوالے کیے دے رہے ہیں۔"

"اگر تم سمجھتی ہو کہ ثانوی اسکول میں پڑھانا اتنا ہی اچھا ہے تو تم نورا کے ساتھ کیوں نہیں چلی جاتیں؟" لعربی نے پوچھا۔

"ہو سکتا ہے میں ایسا ہی کروں،" فاطن نے شگفتگی سے کہا، "مگر، سچی بات یہ ہے کہ بچے مجھ سے خوش نہیں رہتے۔" جس بے تو جہی سے اس نے اپنا ہاتھ لہرایا تھا اسے دیکھ کر لعربی کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ اس لڑکی کے ہاتھوں اپنی بیٹی پر قابو کھوتا جا رہا تھا، وہ لڑکی جسے اتنی پروا بھی نہیں تھی کہ اس کے ساتھ شامل ہو جاتی۔ فاطن نے اپنی پلیٹ دور سرکائی۔ "آپ کو بڑا فخر ہو گا،" وہ بولی۔ اُن ساری

Scanned with CamScanner

باتوں میں سے جو وہ کہہ سکتی تھی، اسی بات نے لعربی کو سب سے زیادہ غصہ دلایا۔ بقیہ کھانے کے دوران اس نے کوئی اور بات نہیں کی، اور چائے آنے سے پہلے ہی بڑی ناشائستگی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ باہر کھڑا سگریٹ پی رہا تھا کہ سلمٰی نے شیشے کے دروازے سرکائے اور ٹیرس پر اس کے پاس نکل آئی۔ وہ پٹواں لوہے کی کرسی پر اس کے برابر بیٹھ گئی، اور وہ دونوں پائیں صحن کے ختم پر جکرندہ کے درختوں کی قطار کو دیکھنے لگے جن میں پھول کھلے ہوئے تھے۔ آخرکار سلمٰی بولی۔ ''تم اس سلسلے میں کیا کرو گے؟'' اس کے لہجے میں اتہام کا شائبہ تھا جس پر لعربی کا چیخنے کو جی چاہا۔

''اب چاہتی ہو کہ کچھ کیا جائے؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے علم نہیں تھا کہ بات یہاں تک جا پہنچے گی۔''

لعربی نے سگریٹ کا کش لیا۔ ''تو پھر تمھارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے، آنٹہ؟''

''مجھے معلوم نہیں۔ کچھ تو کرو،'' سلمٰی نے کہا۔

اسے یہ بتانے کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ سی توفیق سے پہلے ہی مدد مانگ چکا ہے، اور اس کے دوست نے بتایا ہے کہ فاطن کا کوئی پولیس ریکارڈ نہیں۔ وہ اسلامی طلبا تنظیم کی رکن ہے، لیکن تفتیش سے کسی غیر قانونی حرکت کا پتا نہیں چلا۔ توفیق نے اس پر نگاہ رکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ اب وہ صرف انتظار ہی کر سکتے ہیں۔

مہینوں گزر گئے۔ امتحانوں کا موسم وزارت میں شدید مصروفیت کا زمانہ ہوتا تھا، چنانچہ جب ہی رؤف نے مکان کی گھنٹی بجائی، تو لعربی کو خیال ہوا کہ یہ کوئی سرکاری کام سے متعلق معاملہ ہوگا جسے جلد از جلد نپٹا کر نورا کا موضوع چھڑنے سے پہلے ہی اُسے رخصت کر دے گا۔ لعربی سی رؤف کو اس زمانے سے جانتا تھا جب وہ نگرانِ تعلیم تھا۔ رؤف اسکول کا استاد ہوا کرتا تھا، لیکن آخر میں اس نے پی ایچ ڈی مکمل کر لی تھی اور ان دنوں تورا کے کالج میں لیکچرر تھا۔ آج رؤف کے چہرے پر وہی واماندگی تھی جو سال کے اس وقت میں ہوتی تھی، کیونکہ اسے انڈر گریجوئیٹوں کے سینکڑوں پرچے جانچ کر نمبر دینے ہوتے تھے۔ ماما نے چائے پیش کی، لیکن دونوں میں سے کسی نے اپنے گلاس کو چھوا بھی نہیں۔

''نورا کا معاملہ ہے، سی لعربی،'' رؤف نے کہا، اس کی آنکھیں وقفے وقفے پر اسے دیکھ رہی

تھیں، اور اس کی آواز میں اضطراب کا رنگ تھا۔ "اس نے کسی کو ایک نوٹ سرکایا تھا۔"

لعربی کو اپنے پیٹ میں گرہ سی پڑتی محسوس ہوئی۔ "میں نہیں سمجھا۔" اس نے سرگوشی کی۔

"ایک طالبہ نے۔۔ اس کا نام فاطمہ خلیلی ہے۔۔ نورا کو ایک پرچی بھیجی تھی جس پر سوال لکھے تھے اور نورا نے جواب لکھ کر لوٹا دی تھی۔"

"نقل کر رہی تھی؟" سلمیٰ نے بے یقینی سے کہا۔

"کسی کو نقل کرنے میں مدد پہنچا رہی تھی۔" رؤف بولا، ضرب کی شدت کو کم کرنے کی کوشش میں۔ "اور اس پر اسے کالج سے خارج کیا جا سکتا ہے۔ لیکن چونکہ ہم دوست ہیں، میں نے سوچا کہ آپ کو متنبہ کر دوں۔ اگر یہی واقعہ کسی اور نگراں کی موجودگی میں دوبارہ پیش آیا، تو مسئلہ کھڑا ہو سکتا ہے۔"

لعربی پروفیسر کو رخصت کرنے دروازے تک آیا۔ پھر وہ گھوما، اور مارچ کرتا ہوا نورا کے کمرے کی طرف آیا، اور دستک دیے بغیر دروازہ زور سے کھول دیا۔ نورا اپنی ڈیسک کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔ وہ کھڑی ہو گئی۔

"امتحان میں نقل ہو رہی تھی؟ ہم نے جو ساری قربانیاں تمہارے لیے دی ہیں ان کا بدلہ اس طرح دے رہی ہو؟" لعربی نے کہا۔

"ک۔۔ ک۔۔ کیا؟"

"میں وزارت میں کیا منہ دکھا سکوں گا؟" وہ دہاڑا۔ "میری اپنی بیٹی امتحان میں نقل کرتے ہوئے پکڑی گئی!"

"میں صرف فاطمہ کی مدد کر رہی تھی۔ اسے جواب نہیں معلوم تھے۔۔"

"اس کی مدد کر رہی تھیں؟ تمہارے خیال میں یہ کوئی لفظوں کا کھیل ہے؟" سلمیٰ نے پوچھا۔

"تم مدد نہیں کر رہی تھیں۔ تم دھوکا دے رہی تھیں۔"

"م۔۔ م۔۔ میں منع نہ کر سکی۔ وہ میری منت کر رہی تھی۔"

"تم ہمیں اچھے اور برے کے بارے میں وعظ دیتی ہو اور خود امتحانوں میں دھوکے بازی کرتی ہو۔ کیا تم نے کتاب مقدس کبھی کھول کر خود بھی دیکھی ہے یا اپنی ساری معلومات فاطمہ کے

ذریعے ہی حاصل کرتی ہو؟" سلمٰی نے پوچھا۔

"اب اگر اس بدبخت لڑکی کا ذکر بھی میں نے دوبارہ سنا تو، خدا کی قسم، تمھیں تمھارے کمرے میں بند کر دوں گا،" تعربی نے کہا۔ "میں اپنی عزت کے بارے میں برائی کا ایک لفظ بھی سننے کا روادار نہیں، سن رہی ہو؟"

"ہر شخص نقل کرتا ہے — ہر شخص،" نورا نے ٹھیک اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، اور وہ اس کی ٹکٹکی کو برداشت نہیں کر سکا۔ وہ ساری رعایتیں جو اس نے اپنے دوستوں کو دی تھیں، وہ اس نے ہمیشہ مخفی رکھی تھیں، لیکن اس وقت اسے گمان ہوا کہ نورا کو کسی نہ کسی طرح ان کا علم ہو گیا ہے۔

"لیکن اس سے یہ اخلاقی اعتبار سے جائز نہیں ہو جاتا،" سلمٰی نے کہا۔

اس کے بعد نورا دو دن کے لیے اپنے کمرے میں روپوش ہو گئی، اور جب باہر نکلی تو وہ بھی ٹی وی پر مذہب اور فقہ پر ایک پروگرام دیکھنے کے لیے جس کا نام "مفتی سے پوچھو" تھا۔ اس نے اس پروگرام کی کبھی کوئی قسط دیکھے بغیر نہیں چھوڑی تھی۔ جب پروگرام آ رہا ہوتا تو وہ فیملی روم میں آ کر بیٹھ جاتی، اس کی آنکھیں ٹی وی کے پردے پر ثبت ہوتیں۔ لوگ فون کر کے مختلف سوال پوچھتے، جن میں "زکوٰۃ نکالنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟" جیسے سنجیدہ سوالوں سے لے کر "حج کیسے ادا کر سکتا ہوں؟" جیسے سادہ لوحی کے سوال ہوتے، اور نورا سب کچھ دیکھتی۔ آج کسی نے فون کر کے پوچھا، "کیا ماؤتھ واش کا استعمال جائز ہے جبکہ اس میں الکحل شامل ہوتا ہے؟" نورا نے پیرانہ سال مفتی کی طرف بڑی توقع بھری نظر سے دیکھا۔ سلمٰی نے فوراً ریموٹ کنٹرول جھپٹ کر چینل بدل دیا۔ جب نورا تعجب سے چلائی، سلمٰی نے کہا، "مجھے یقین نہیں آتا کہ تمھیں ماؤتھ واش کے بارے میں ان احمقانہ تفصیلات سے دلچسپی ہو سکتی ہے جبکہ تمھیں امتحان میں نقل کرنے میں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔" تعربی ہنس پڑا، لیکن جلد ہی تلخی سے مغلوب ہو گیا۔ کاش وہ اس بدبخت لڑکی کو کسی طرح اپنی بیٹی سے دور کر سکے، شاید وہ نورا کو سراکس میں اپنی پھوپھی سے مل آنے پر راضی کر لے — ایک جنوبی شہر میں قیام شاید اس کے لیے مفید ثابت ہو۔ لیکن پہلے اسے فاطن سے نبٹنا ہوگا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ اس نے فون اٹھایا۔ امتحانی پرچوں کو ہنوز نمبر دیے جا رہے تھے، اور عمل کرنے کے لیے اب بھی وقت تھا۔ اسے فاطن سے نبٹنے کے لیے کسی قابلِ اعتماد شخص کی ضرورت تھی، اور اسے معلوم تھا کہ رؤف اسے مایوس نہیں کرے گا۔

لعربی اپنی بیوی کی سنگار میز کے سامنے ہمیشہ اپنی مونچھیں تراش رہا تھا، اس دوران میں سلمیٰ دھلے ہوئے کپڑے تہہ کر رہی تھی۔ اچانک اسے حسرت محسوس ہوئی اور اس کا جی چاہا کہ سلمیٰ سے ستر کی دہائی کے اُن ہیجان خیز دنوں کی بابت پوچھے جب وہ دونوں جوان تھے اور دُنیا ان کے سامنے کھلی پڑی تھی اور وہ اسے سنوارنے کے بڑے بڑے خواب دیکھ رہے تھے۔ اس نے استاد کی حیثیت سے ابتدا کی تھی اور سلمیٰ نے وکیل کی حیثیت سے، لیکن جبکہ وہ اب بھی اپنے دن اپنے موکلوں کی استغاثت کی جدوجہد میں صرف کر رہی تھی، وہ خود انتظامی عہدوں کی سمت میں نکل چکا تھا اور ان ترغیبات کو دبانے میں ناکام رہا تھا جو یہ عہدے اپنے ہمراہ لائے تھے۔ اسے کیا ہو گیا ہے، وہ پوچھنا چاہتا تھا۔ اسے لگا کہ وہ ناکام رہا ہے، گو یہ نہ جان سکا کہ یہ کب ہوا تھا۔ اسے دروازے پر دستک سنائی دی۔ یہ نورا تھی۔ ''میں امتحان میں پاس ہو گئی،'' اس نے مسکراتے ہوئے اعلان کیا۔

''مبارک اور مسعود ہو،'' سلمیٰ نے سپاٹ لہجے میں کہا، اور واپس کپڑے تہہ کرنے لگی۔ عام حالات میں اس نے نورا کو چمٹا لیا ہوتا، اپنا ہاتھ اوپری ہونٹ پر رکھ کر مسرت کی متعدد چیخیں نکالی ہوتیں، لیکن اب وہ اس سے کچھ زیادہ خوش نہیں نظر آ رہی تھی جیسے اس کی لڑکی نے بتایا ہو کہ وہ تصویر ٹانگنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔

''بابا، ایک گزارش ہے،'' نورا نے کہا۔ لعربی نے اپنی قینچی رکھ دی اور اس کی طرف رخ کیا۔

''ایک مسئلہ آ پڑا ہے۔ فاطن امتحان میں فیل ہو گئی ہے...'' اس کی آواز رفتہ رفتہ معدوم ہو گئی۔

''تو؟'' لعربی نے کسی تعجب کے بغیر پوچھا۔

''وہ پچھلے سال بھی فیل ہو گئی تھی، اس کا مطلب ہے کہ اسے نکال دیا جائے گا۔ اسے پتا نہیں کہ وہ کیا کرے گی۔''

سلمیٰ کھڑی رہی، ہاتھ میں ہینگر لیے ہوئے، اور اسی سے نورا کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''اس کا کیا ہو گا؟ پہلے ہی کالج کے گریجوئیوں کی بڑی تعداد موجود ہے جو بے روزگار ہیں، لیکن سند کے بغیر اس کو نوکری ملنے کے امکانات... یہ بڑی ناانصافی ہے۔''

''میں نہیں سمجھا کہ اس کا مجھ سے کیا تعلق ہے،'' لعربی بولا۔

''مجھے خیال آیا کہ آپ اس عقدے کا کوئی حل نکال لیں گے۔ آپ کے روابط ہیں، اور اس نے مجھ سے کہا کہ آپ سے مدد کرنے کے لیے کہوں،'' نورا بولی۔ ایک لمحے کے لیے اس کی نگاہیں لعربی پر سے ہٹیں اور پھر دوبارہ اس پر آ کر جم گئیں۔

لعربی تلخی کے ساتھ ہنسا۔ یہ رہی وہ، پاکباز، انتہا پسند، کرپشن کی بڑی فعال مخالف، لیکن انتہائے کار، ہر کسی کی طرح، وہ چاہتی ہے کہ اس کی دوست کے حق میں رعایتی سلوک کیا جائے۔

''اب وہ میرٹ کی بالادستی کی بات نہیں کرتی؟'' اس نے پوچھا۔ نورا نے نظر جھکالی۔ اس نے اس لمحے سے پورا لطف اٹھانے کے لیے توقف کیا، خواہ یہ کتنا ہی زود گزر کیوں نہ ہو۔ کتنی بار جب اس نے نورا سے اس ناہنجار حجاب کو اتار دینے اور اپنی پرانی حالت پر لوٹ آنے کے لیے کہا تھا تو اس نے ٹھکرا دیا تھا؟ اور اسے نیویارک یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقعے پر کیپ اور گاؤن پہنے ہوئے دیکھنے کا اس کا خواب کیا ہوا؟ محض اس خیال ہی سے اس کے دل میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ یہ ممکن ہوگا۔ اس کے لیے قانون شکنی کرنی پڑے گی — ایک بالکل غیر اسلامی حرکت، جیسا کہ تم خوب جانتی ہو،'' اس نے کہا۔

''جب آگ سے کھیلو گی تو جلنے کا خطرہ تو ہوگا ہی،'' سلمٰی نے کپڑوں کی الماری کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ نورا نے اسے برہمی سے گھور کر دیکھا اور کمرے سے چلی گئی۔

لعربی اسٹول پر گھوما اور تھوڑی دیر تک آئینے میں اپنا جائزہ لیتا رہا۔ خود وہ بھی آگ سے کھیلا تھا، لیکن شاید وہ پہلے ہی جل چکا تھا۔ جب اس نے دوبارہ قینچی اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو چھوٹی سی ایک مخملی تھیلی نظر آئی جسے خوشبوؤں کی بوتلوں کے درمیان ڈال دیا گیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں لے کر اسے کھولا۔ اس میں سے وہ تسبیح برآمد ہوئی جو ٹوٹ گئی تھی — ایسا لگتا تھا کہ برسوں پہلے — اور جسے سلمٰی نے یہاں اس کے لیے محفوظ رکھا تھا۔ وہ اپنی ماں کو یاد کرنے سے باز نہ رہ سکا جس کی نظر میں مذہب اور راست بازی کا چولی دامن کا ساتھ تھا، اور اس وقت کو یاد کرنے سے جب وہ خود بھی اس سنگت پر یقین رکھتا تھا۔

''میں جانتی ہوں کہ مجھے کسی کی مصیبت پر خوش نہیں ہونا چاہیے،'' سلمٰی نے کہا۔ ''لیکن مجھے

خوشی ہے کہ فاطمہ کو نکال دیا گیا۔ کم از کم اب کالج میں ان دونوں کی اتنی زیادہ ملاقات نہیں ہو سکے گی۔''

اس سے کہاں غلطی ہوئی؟ اس نے ہمیشہ نورا کی بہتری چاہی ہے۔ اس کی سابقہ زندگی میں ایسی کون سی خرابی تھی؟ اسے سب کچھ میسر تھا، اور وہ خوش تھی۔ آخر مذہب کی طرف ملتفت ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ شاید یہ خود اس کی گھر سے غیر حاضر رہنے کی عادت کا شاخسانہ تھا، یا پیٹے پالنے سے اس کے شغف کا، یا شاید یہ ان تمام رشوتوں کا نتیجہ تھا جو اس نے لی تھیں۔ ان میں سے کوئی بات بھی ہو سکتی تھی۔ ہو نہ ہو، وہی قصوروار تھا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کچھ بھی نہ ہو۔ آخرکار اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، وہ اسے دوبارہ کھو چکا ہے، اور اس بار وہ یہ امید کرنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتا کہ کوئی اسے اس کے پاس لوٹا لائے گا۔

''کیا خیال ہے تمھارا، اس سے کوئی فائدہ ہوگا؟'' العربی نے اپنی بیوی سے پوچھا۔

سلمٰی نے سر ہلا دیا۔ ''مجھے نہیں معلوم۔''

❋

بس کے سفر

جس دن مصطفیٰ نے اسے بجلی کے تار سے پیٹا، اس کے بعد والے دن، حلیمہ بوتعصہ نے چند کپڑے باندھے اور اپنی ماں کے گھر جانے کے لیے بس میں سوار ہو گئی جو سیدی بلیوط میں رہتی تھی، کاسابلانکا کے پرانے شہر میں۔ تار سے اس کے بازوؤں اور چہرے پر ضرب کے لمبے ابھرے ہوئے نشان پڑ گئے تھے، جنھیں وہ اپنے گھریلو لباس میں چھپا نہ سکی۔ وہ اسٹوڈیو اپارٹمنٹ کے دروازے پر پہنچی، نذرانے کے طور پر ہاتھوں میں النارہ چائے کا ڈبا سنبھالے، اور ایک لمحے تک، ڈانواڈول حالت میں، ساکت کھڑی رہی۔ اس کی ماں اسے دیکھ کر خوش نہیں ہوگی، لیکن وہ کہیں اور جانے کا تصور بھی

نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

''ارے پھر؟'' اس کی ماں، فاتحہ نے کہا۔

حلیمہ نے سر کو اقرار میں جنبش تک نہ دی۔ وہ فاتحہ کے پاس سے گزرتی ہوئی اپارٹمنٹ میں داخل ہوئی جہاں پچھلے ہفتے کی دھلائی میں استعمال ہونے والی کافوری گولیوں کی بو ہنوز ہوا میں بسی ہوئی تھی۔ بند جھلملی سے سورج کی روشنی لمبی لمبی دھاریوں کی شکل میں اندر آ کر ننگے فرش پر دھندلا سا جال بنا رہی تھی۔ دور والی دیوار پر حلیمہ کے باپ کی سرخی مائل بھورے رنگ کی تصویر ٹنگی تھی، وہ واحد ورثہ جو وہ پھیپھڑوں کے سرطان سے برسوں پنجہ کشی کرنے کے بعد پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ ایک کونے میں پورٹیبل ٹی وی پڑا تھا، جو حلیمہ کے بھائیوں کا دیا ہوا تحفہ تھا، دونوں فرانس ہجرت کر گئے تھے۔ اس نے اپنا جھولا فرش پر ڈال دیا اور تنگ سے باورچی خانے میں آئی۔

''اس بار کیا ہوا؟'' فاتحہ نے پوچھا۔

''کرائے کی رقم کی شراب پی گیا۔'' حلیمہ نے اپنا جلابہ اُتارا، جس کے نیچے سے اس کا خمیدہ نقش و نگار والا ڈریس اور تنگ سی کمر کے گرد حمائل نیلے رنگ کی بیلٹ ظاہر ہوئے۔ وہ اکتیس سال کی تھی، لیکن چہرے پر پڑے سیاہ قطعوں اور شانوں کے جھکاؤ کے باعث کہیں زیادہ عمر کی دکھائی دیتی تھی۔ وہ ایک اسٹول پر بیٹھ گئی اور اپنی ٹھوڑی کو ہاتھوں میں لے لیا۔

فاتحہ نے بوطاغاز [گیس کا چولھا] جلایا اور کیتلی چڑھا دی۔ ''انا اللہ مع الصابرین،'' وہ بولی۔

حلیمہ نے دنگ ہو کر سوچا کہ کیا اللہ اپنے بندوں سے صرف صبر کا ہی طالب ہے۔ کیا اس نے اب تک جو لمبی مصیبتیں جھیلی ہیں وہ کافی نہیں؟ اسے یہ بھی یقین تھا کہ رب اپنے بندوں کی خوشی بھی چاہتا ہے، لیکن اسے اپنی ماں کی طرح کوئی چبھتا ہوا لگا بندھا فقرہ نہ سوجھ سکا۔

کیتلی نے سیٹی بجائی۔ فاتحہ نے پودینے کی چائے بنائی اور نیچی سی گول میز پر قرینے سے جما دی۔ حلیمہ نے اپنا گلاس اٹھایا اور تڑختے ہوئے ہاتھوں میں سنبھالے رکھا۔ ''اگر میں اسے شراب پینے کے لیے پیسے نہیں دیتی تو وہ چرا کر لے جاتا ہے۔''

''عورت کو اپنے شوہر کو قابو میں رکھنے کا گن آنا چاہیے،'' فاتحہ نے ملامتی انداز میں کہا۔ وہ بیٹھ گئی، اس کے بڑے بڑے کولھے کرسی کے اطراف سے چھلکے پڑ رہے تھے۔ ''دیکھو، میں ایک نئی

جادوگرنی سے چند دن پہلے ملی ہوں۔ اس سے کوئی چیز تمھارے لیے لے آؤں گی۔ گرہ میں باندھ لو کہ اس بار اسے معظمی کے کھانے میں ضرور ملانا ہے۔ پھر دیکھنا وہ کس طرح تمھاری انگلی کی انگشتری بن جاتا ہے۔ جس طرف تم دو گی، گھوم جائے گا۔"

"تمھارے جادو ٹونے کام نہیں کرتے۔"

"وہ اس لیے کہ تم میری ہدایت پر عمل نہیں کرتیں۔"

"میں طلاق چاہتی ہوں۔"

فاطمہ نے اپنے زانو پر ہاتھ مارا اور چائے فرش پر چھلکا دی۔ "شیطان کو کوسو۔ بچوں کو کہاں سے کھلاؤ گی؟" اس نے گری ہوئی چائے دوپٹے سے پونچھ کر صاف کیا۔

"انھیں تو میں پہلے ہی سے پال رہی ہوں۔ تمھارے خیال میں جو خرچ وہ مجھے دیتا ہے اس میں ان کا گزارہ ہو جاتا ہے؟"

معظمی شہر کے رہائشی علاقے میں ایک بڑی سی ٹیکسی چلا کر روزی کماتا تھا، لیکن شراب خانے والا مے پلانے تک جو اس کے پاس کم ہی رقم بچتی تھی۔ حسیبہ ہفتے میں دو بار گھروں میں صفائی ستھرائی کا کام کرتی اور پھر مدرسے کے قریب محلے والیوں اور بچوں کے ہاتھوں کڑھائی کا کام بیچ کر کما لیتی۔

اس نے اپنی ماں کی طرف بے بسی اور توقع کے ملے جلے احساس کے ساتھ دیکھا۔

"بیٹی، اپنے مرد کے معاملے میں صبر و تحمل سے کام لو۔" فاطمہ نے کہا۔ "دیکھو، حمادہ کے ساتھ کیا ہوا۔" حمادہ زمانے بھر کی تنگیوں میں حسیبہ کی پڑوسن تھی۔ اس کے شوہر نے ایک اور عورت کو ڈال رکھا تھا لیکن اسے طلاق دینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ عدالت پہنچ گئی، لیکن وہ کسی گنتی میں نہ آیا۔ "اب وہ اکیلی رہتی ہے۔ نہ شادی شدہ زندگی گزار رہی ہے، نہ دوسری شادی کر سکتی ہے۔"

"لیکن یہ اس رہنے سے بچے کے ساتھ رہنے سے بہتر ہے۔"

"دیکھ" "اسی سے وہ تمھیں مارتا پیٹتا ہے۔ اتنی زبان دراز جو ہو۔"

حسیبہ نے زور سے سرد آہ بھری، لیکن ماں پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ ماں اٹھی اور اس نے مائیکرو ویو کی میز پر پڑے گلدان کو پونچھا جو اس کے بیٹے پچھلی بار اس کے لیے لائے تھے۔ اس نے اس کے اوپر پڑی گرد صاف کی اور پھر سے اسے دوبارہ قرینے سے رکھا۔

"میں حاوہ کی طرح نہیں ہوں،" حلیمہ نے کہا۔

"درست،" فاتحہ بولی۔ "تم بچوں والی ہو۔"

حلیمہ نے اپنے بال کھولے اور انھیں بے چینی سے ایک گرہ کی شکل میں باندھ لیا۔ اس نے اپنی ماں کا گلاس دوبارہ چائے سے بھر دیا۔ "وہ تمھاری جادوگرنی، وہ کتنا مانگ رہی ہے؟"

"پندرہ سو درہم،" فاتحہ نے بتایا۔

حلیمہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "اس سے بہتر ہوگا کہ اتنی رقم میں معلی کو دے کر اپنے لیے طلاق خرید لوں۔"

"اگر ایسا کرو گی بھی تو وہ بچے تمھیں نہیں دینے والا،" فاتحہ نے کہا۔

حلیمہ نے اپنا انگوٹھا کترا۔ "اس صورت میں میں جج کو رشوت دوں گی،" وہ تھوڑی اوپر کر کے بولی۔ اس نے انتظار کیا کہ دیکھیں ماں کیا کہتی ہے، جیسے سب دوسری تجاویز کو نامعتبر قرار دے دیا تھا اسی طرح وہ اس تجویز کو بھی رد کر دے گی۔

فاتحہ نے ہونک کی آواز نکالی۔ "اس رقم سے تو تم کسی حقیر سے کلرک کو بھی رشوت نہیں دے سکتیں۔"

حلیمہ نے اپنے سامنے گھور کر دیکھا، ان آنسوؤں کو دباتے ہوئے جو اسے باہر آتے محسوس ہوئے۔

"میں تمھیں ہی جادوگرنی کے پاس لے چلتی ہوں،" فاتحہ نے نرمی سے کہا۔ "تمھارا کیا بگڑتا ہے؟" حلیمہ نے اپنی ماں کے چہرے کی طرف دیکھا، اس کے ہونٹوں کی برجستگی اور شفقت کو، پھر حیرت سے سوچنے لگی کہ کس پر اعتماد کرے، عدالتوں پر یا جادوگروں پر۔

حلیمہ کو ماں کی تجویز کردہ اس جادوگرنی سے ملنے کے لیے پیسے جمع کرنے میں کئی ہفتے لگ گئے اور تین بار کی مار پیٹ، جن میں تازہ ترین مار گزشتہ کل ہی پڑی تھی۔ وہ بس میں سوار ہو کر دوبارہ زناتہ گئی اور شام کا کھانا تیار کرنے کے لیے ٹھیک وقت سے واپس گھر لوٹ آئی۔ اس کا ارادہ رغائف پکانے کا تھا۔ جادوگرنی نے جو چٹکی بھر سفوف اسے بیچا تھا اسے ملانے کے لیے یہ آمیزہ بالکل ٹھیک رہے گا۔

جب حلیمہ آٹا گوندھ رہی تھی، اسے موذن کی آواز سنائی دی جو ایمان والوں کو عصر کی نماز پڑھنے کی دعوت دے رہا تھا۔ وہ ابھی جو کام کرنے جا رہی تھی اس کے خیال سے کھٹکی: یہ بڑا سخت گناہ ہے، جادوگروں کا استعمال۔ اس کے باوجود، پیسہ بہر حال خرچ ہو چکا تھا، اور اگر یہ واقعی صحیح تھا کہ آدمی کے اعمال کا دارومدار اس کی نیت پر ہے، تو جادو ٹونے کے استعمال کی نیت کر کے وہ گناہ کی مرتکب پہلے ہی ہو چکی ہے، تو کیوں نہ اب اسے پورا کر ہی لیا جائے۔ جیسے ہی پہلا رغیف تیار ہوا، اس نے اسے چکھ کر دیکھا، اور ایسا کرتے میں اپنی زبان جلا بیٹھی۔ سفوف پڑنے سے اس کا رنگ قدرے پیلا ہو گیا تھا، لیکن ذائقہ بدلا ہوا نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے بقیہ روٹیاں بھی توے پر پکا ڈالیں اور چائے تیار کی، بڑی تیز، جس میں چائے کی مقدار زیادہ اور پودینے کی کم رکھی، بالکل جس طرح معلّی پسند کرتا تھا۔

صحن میں تنی رسّی سے اس نے خشک کپڑے اتارے اور واحد سونے کے کمرے میں لائی، جو ایک تاریک، مرطوب کھڑکیوں سے محروم جگہ تھی۔ کپڑے الماری میں رکھے، جو اپنے لنگڑاتے پایوں کے باعث دیوار کے سہارے ذرا جھکی کھڑی تھی، اور اس چادر کو ٹھیک کرتے ہوئے جو بچوں اور اس کے بستر کے درمیان لٹکی ہوئی تھی، باہر آ گئی۔ وہ باورچی خانے میں گئی اور چھوٹی سی گول میز کو اس کے سرے سے دھکیل کر صحن میں لگا دیا، دیوان اور کارکی ان نشستوں کے درمیان جو بچے چند بلاک دور گھورے سے اٹھا لائے تھے۔ جب بارش ہو رہی ہوتی تو کنبہ باورچی خانے میں ہی کھانا کھاتا، پام کی چٹائی پر بیٹھ کر، اس حالت میں کہ ان کی کہنیاں ایک دوسرے سے چھل رہی ہوتیں، لیکن آج دھوپ نکلی ہوئی تھی اور وہ اپنا رات کا کھانا دن کی روشنی ہی میں بیٹھ کر کھا سکتے تھے۔ گیس کے لیمپ کو استعمال کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

سب سے پہلے گھر لوٹنے والی حلیمہ کی بیٹی منی تھی۔ لوہے کے دروازے کو دھکا دے کر جب وہ اندر داخل ہوئی تو اس کی چوٹیاں اس کے سر کے دونوں طرف جھول رہی تھیں۔ حلیمہ دم سادھ کر رہ گئی۔ اپنی بلند پیشانی اور عقابی ناک کے باعث وہ اپنے باپ سے شکل میں کس قدر ملتی جلتی تھی۔ منی نے پوچھا کہ کیا وہ رات کا کھانا اپنی پڑوسی ہجولی کے ساتھ کھا سکتی ہے۔ حلیمہ نے اپنا بازو اپنی بیٹی کی کمر کے گرد ڈال دیا۔ "میرے ساتھ یہیں رہو،" اس نے کہا۔

"اچھا تو کیا اسی وقت کھانا کھا سکتے ہیں؟" منی نے ریاتے لہجے میں پوچھا۔

Scanned with CamScanner

"تمھارے ابا کا انتظار کرنا ہوگا۔"

منّی نے ناٹک کرتے ہوئے زور کی سرد آہ کھینچی۔ لڑکے قابو سے باہر ہوتے جا رہے تھے۔ فرید نے پلٹ کر جواب دینا شروع کر دیا تھا۔ لیکن، حلیمہ نے سوچا، منّی اچھی لڑکی ہے، اور ضرور کچھ کر کے دکھائے گی۔ اسے ہر وہ شے مل جائے گی جس کی تمنا حلیمہ نے اپنے لیے کی تھی۔ کاش اس کا کنبہ کسی طرح ان جھگیوں کی بستی سے باہر نکل سکے، اس کی غلاظت بھری گلیوں سے باہر جہاں لونڈے دن میں گوند سونگھنے کا نشہ کرتے اور رات کے وقت جتھوں کی صورت میں آوارہ گردی کرتے تھے۔

منّی کے چھوٹے بھائی، فرید اور امین، داخل ہوئے اور اپنے اسکول کے بستے فرش پر ڈال دیے۔ تینوں بچوں نے مل کر تاش کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ "دھوکے بازی مت کرنا،" امین نے، جو سب سے چھوٹا تھا، خبردار کیا۔ وہ دھوپ کے ایک قطعے کے نیچے فرش پر بیٹھ گئے اور کھیل شروع کیا۔ ان کے اوپر مکھیاں ایک دائرے کی شکل میں مسلسل رقص کرتی رہیں۔

اس کو پیٹنے کے کئی دن بعد تک معطی اکڑا اکڑا رہا۔ گھنٹوں گزر جاتے، وہ بیٹھی انتظار کرتی رہتی کہ وہ اپنے کیے پر معافی مانگے گا یا کم از کم اس سے بات ہی کرے گا، لیکن وہ یہ سب کر کے نہ دیتا، اور وہ انتظار چھوڑ چھاڑ کے الٹا اُسے ڈھارس دلانے لگتی، جیسے ٹھکائی اُس کی ہوئی ہو۔ لیکن آج رات وہ چہرے پر معذرت خواہی کا تاثر لیے لوٹا۔ اس نے حلیمہ کو بچوں کے ساتھ دیوان پر بیٹھنے دیا اور اپنے لیے کار کی نشست اختیار کی، اور پھر خود چائے پیش کی۔ حلیمہ اسے رغیف کھاتے، ہر روٹی کو صرف تین ہی لقموں میں چٹ کرتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس کے بارے میں ایک بات یقین سے کہی جا سکتی تھی، وہ یہ کہ اسے بھوک خوب کھل کر لگتی تھی۔ کاش وہ اپنا پیسہ شراب پر لگانے اور اس کی کمائی کھانے کے بجائے گھر کے اخراجات میں اس کی مدد کیا کرے! "بہت مزیدار ہیں،" وہ چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔

کھانا ختم ہونے کے بعد حلیمہ نے میز صاف کی اور بچوں کو باہر کھیلنے بھیج دیا۔ وہ باورچی خانے میں سنک کے پاس کھڑی تھی کہ معطی آ کر اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا، اور ایک بازو اس کے شانوں کے گرد ڈال دیا۔ اس نے اس کی گردن کا بوسہ لیا جو اسے تپش سے جلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ اب بھی اس پر پہلے کی طرح اثر انداز ہونے کا اہل تھا، شادی کے دس سال گزر جانے کے بعد بھی۔ جب وہ ایک

پڑوسی کی شادی کی تقریب میں ملے تھے، وہ فوراً ہی اس کی آنکھوں کی مقناطیسی کشش میں آ گئی تھی، اس کے جسم کی کشش میں، جو اپنے اس قدر دبلے پن کے باوجود مجبوس توانائی سے پھٹا پڑ رہا تھا۔ چند ہی ہفتوں بعد انھوں نے شادی کر لی تھی اور چار سال میں تین بچوں کے ماں باپ بن گئے تھے، جس کے بعد حلیمہ خاندانی منصوبہ بندی کے کلینک گئی اور ٹیکہ لے آئی۔

"برتنوں کو رہنے دو،" وہ بولا۔ "بعد میں دھوتی رہنا۔" اس نے اسے سنک سے دور کھینچا، اور اس کی کمر پر ہاتھ رکھے واپس صحن میں لے آیا، جہاں دونوں دیوان پر بیٹھ گئے۔ اس کی جلد حلیمہ کی جلد کے مقابلے میں زیادہ ملائم لگ رہی تھی، اس کے باوجود کلائی پر، جو اس نے پکڑ کر کھینچی تھی، اس کی انگلیاں اپنے نشان چھوڑ گئی تھیں۔ وہ جھکا اور اس کی ہتھیلی کا بوسہ لے لیا۔ مجھے اپنی ماں پر شک نہیں کرنا چاہیے تھا، حلیمہ نے سوچا، سفوف اپنا کام کر رہا ہے۔

اگلے دن، حلیمہ بس کا انتظار کر رہی تھی جو اسے کاسابلانکا کی بندرگاہ کے مچھلی بازار لے جانے والی تھی، کہ اسے گرد آلود فٹ پاتھ پر پچاس درہم کا ایک کڑکڑاتا نوٹ پڑا نظر آیا۔ کیسی زبردست قسمت ہے! اسی صبح معطی نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ شراب پینا چھوڑ دے گا اور اب یہ۔ جب بس میں آ بیٹھی تو کنڈکٹر نے کہا کہ اس کے پاس ایک فاضل ٹکٹ ہے جو کسی نے غلطی سے خرید لیا تھا اور اگر وہ چاہے تو صرف دس ریال میں لے سکتی ہے۔ وہ مسکرائی اور ٹکٹ اپنے بٹوے میں رکھ لیا۔ اسے کھڑکی کے پاس ایک نشست خالی مل گئی اور وہ داغ دھبے پڑے شیشے سے باہر کی دنیا کا نظارہ کرنے لگی۔ پلستر اکھڑی عمارتیں اور سیٹلائٹ ڈشیں تیزی سے گزرتی گئیں، کبھی کبھار پام کے درخت ان کے تسلسل کو توڑ دیتے۔

بازار کے داخلے کے پاس، گہرا کستھئی جلابہ پہنے ایک کانا آدمی ہاتھ آگے کو پھیلائے ہوئے زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اتنا ضعیف تھا کہ بمشکل ہی راہ گیروں کو اس کی بات سنائی دے رہی تھی، اس کی کمزور آواز چند فٹ سے زیادہ دور نہیں پہنچ رہی تھی۔ حلیمہ نے اپنے بٹوے میں دیکھا اور کچھ ریزگاری اسے دے دی۔

گلی کے سہارے، نیلے لیب کوٹ پہنے ہوئے پھیری والے اپنے مال کی تازگی اور کم قیمتی کے

Scanned with CamScanner

گن گا رہے تھے۔ حلیمہ نے اسٹالوں کے بیچ میں بہتے پانی اور فلسوں کے نالوں کو پھلانگا۔ کسکس، پھلیوں کے سوپ، آلو کے تلے ہوئے قتلوں کی یک رنگی کو توڑنے کے لیے، کہ بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے اس کا بس اتنا ہی مقدور تھا، وہ ہفتے میں ایک بار سستی سی مچھلی خرید لیتی تھی۔ عام طور پر وہ سارڈین یا مکارل مچھلی خریدتی تھی، لیکن آج وہ شاہ خرچی کے موڈ میں تھی، چنانچہ ایک پھیری والے سے خوب بھاؤ تاؤ کرنے کے بعد اس نے طاجین پکانے کے لیے ایک بڑی سی سفید مچھلی خرید ڈالی۔

دوپہر کے کھانے کی تیاری کرتے ہوئے حلیمہ نے ریڈیو پر ''دیاک'' گاتے ہوئے فرید الاطرش کے ساتھ ساتھ خود کو گنگناتے ہوئے پایا۔ اس نے مچھلی کو سنک میں رکھ کر صاف کیا، پھر اسے ٹماٹر اور لیموں کے عرق میں پکایا۔ میز لگا دی گئی، لیکن معطی ہنوز گھر نہیں لوٹا تھا۔ وہ باورچی خانے میں کھڑی ہو گئی، اس فیصلے کی کوشش میں کہ کیا کرے۔ اگر وہ کھانا ابھی لگاتی ہے تو یہ اس کے آنے تک ٹھنڈا ہو چکا ہوگا اور ہو سکتا ہے کہ وہ اس بات سے برہم ہو جائے۔ اگر انتظار کرتی ہے تو بچوں کو اسکول لوٹنے میں دیر ہو جائے گی، اور وہ شاید اس بات سے بھی برہم ہو جائے۔ یہ ناممکن سا انتخاب جو وہ ہر روز اس پر عائد کر دیتا تھا، اسے سخت ناپسند تھا۔ وہ بڑھتے ہوئے اضطراب کے ساتھ گھڑی دیکھنے لگی، لیکن پھر جلد ہی اسے صدر دروازے کی چرچراہٹ سنائی دی اور اس نے جھپٹ کر طاجین اٹھائی اور باہر لے آئی۔

معطی پستہ سے دیوان پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ قیف کی شکل کے برتن سے نکلتی ہوئی لیموں کی خوشبو کے اوپر اپنے دونوں ہاتھ ملنے لگا۔ بچے میز کے گرد بیٹھ گئے، اور دائرے کو پورا کرتے ہوئے حلیمہ نے اپنی نشست سنبھالی۔ معطی نے مچھلی کا بہترین حصہ کاٹ کر مشترکہ رکابی میں بچوں والے سرے پر رکھ دیا۔ چکھنے کے بعد بولا، ''خدا تمھیں تندرستی عطا کرے۔ بے حد لذیذ بنائی ہے۔''

''اور تمھیں بھی تندرستی عطا کرے،'' اس نے جواباً کہا۔

''استانی کہہ رہی تھی کہ ہمیں تاریخ کی نئی کتاب خریدنے کی ضرورت ہے،'' فرید نے بتایا۔

''پھر سے؟'' حلیمہ نے پوچھا۔

''پچھلی بار قواعد کی کتاب تھی، اماں،'' فرید نے آنکھیں گھماتے ہوئے جواب دیا۔ حلیمہ کو قواعد کے بارے میں زیادہ معلوم تھا نہ تاریخ کے، اس کی تعلیم تو صرف خواندگی کی جماعتوں تک محدود

رہی تھی، لیکن اسے اس کا لہجہ ناگوار گزرا۔

''اس سے کہنا کہ اگلے ہفتے خریدیں گے،'' معطی بولا۔ اس نے لڑکے کا سر تھپتھپایا، اور مچھلی کے شوربے کا چیپ وہاں لگا دیا۔ صرف ایک ماہ پہلے ہی منیٰ بقیہ کلاس کے ساتھ مکناس کے پاس ولوبلیس میں رومی آثار قدیمہ دیکھنے فیلڈ ٹرپ پر نہیں جا سکی تھی۔ حلیمہ کو معلوم تھا کہ معطی اپنی اچھی نیت کے باوجود بچے سے کیے ہوئے اپنے وعدے پر قائم نہیں رہ سکے گا۔

جب بچے واپس اسکول چلے گئے، معطی اور حلیمہ چائے پینے کے لیے آرام سے بیٹھ گئے۔ آج وہ خاموش خاموش سا تھا، لیکن اس نے اس کا برا نہیں منایا۔ وہ دیوان پر پیچھے ہو کر بیٹھی اور اپنی چائے مزے لے کر پینے لگی۔ معطی نے اپنی چائے ختم کی، پھر وہیں قیلولے کے لیے پسر گیا۔ ''واپس کام پر نہیں جا رہے؟'' اس نے پوچھا۔

اس کی آنکھیں دوسری طرف ہو گئیں۔ ''باس نے مجھے نکال دیا ہے۔''

حلیمہ کا دل سینے میں اچھل پڑا۔ وہ ایک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ''کیوں؟'' اس نے پوچھا، اس کے باوجود کہ اسے معلوم تھا کہ برطرفی کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ شراب پیتے ہوئے پکڑا گیا ہوگا۔ اسے معطی پر افسوس ہوا، لیکن غیظ جلد ہی رحم پر غالب آ گیا۔ ''تمہارا خیال تھا کہ سی حسین اس سے صرف نظر کر لے گا؟'' معطی نے اپنا بازو پیشانی پر رکھ لیا، تاکہ اس کی آنکھوں کے شدید ارتکاز سے بچ سکے۔ ''اب ہم کیا کریں گے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں کوئی اور کام ڈھونڈ لوں گا،'' وہ بولا۔ اس کے لہجے میں اعتماد تھا، لیکن اس نے اپنا چہرہ اس کی طرف سے پھیر لیا۔

حلیمہ نے نظریں گاڑ کر اسے دیکھا۔ اس کی آواز کی نقل اُتارتے ہوئے وہ ناراضگی سے کراہی، ''میں پیسہ بچاؤں گا، میں اپنی ٹیکسی خرید لوں گا، زناتہ سے ایک دن نکل ہی جاؤں گا، تم دیکھنا۔'' معطی نے اپنا بازو آنکھوں پر سے ہٹایا اور اسے دیکھا۔ حلیمہ نے اس کی نقل اُتارنی بند کر دی۔ اس کے باوجود، وہ کہے گئی، ''اور وہ سب کس لیے؟ ہم جب تک مر نہیں جاتے یہیں پھنسے رہیں گے۔ جلد ہی مسجد کے دروازے پر کھڑے جمعے جمعے بھیک مانگ رہے ہوں گے۔'' اس نے نیچے اپنے تار تار سلیپروں پر نظر ڈالی۔ وہ کھڑی ہونے کے لیے ان میں اپنے پیر ڈال رہی تھی، چنانچہ اس کے بڑھتے

ہوئے ہاتھ کو نہ دیکھ سکی — وہ تو جب چہرے پر اس کی ضرب پڑی اور اسے ایک طرف گرا دیا تبھی اس نے محسوس کیا، ہوا اس کے پھیپھڑوں سے یک دم خارج ہو گئی۔ اس نے معطی کی پہنچ سے نکل جانے کے لیے چھلانگ لگائی، لیکن اس نے اسے اس زور سے لات ماری کہ اس کا جوتا اس کے سر پر سے ہوتا ہوا گزر گیا۔ وہ گھٹنوں کے بل گر پڑی، ٹھوڑی فرش سے جا ٹکرائی، دانت منہ میں ہلنے لگے۔ اس نے اس کا جوتا اٹھا کر اس کی طرف پھینکا، ہاتھوں کے سہارے کھڑے ہونے کی کوشش کی، اور اس کی پہنچ سے دور بھاگ گئی، اور خود کو چھوٹے سے غسل خانے میں بند کر لیا، جیسا کہ وہ ہمیشہ کرتی تھی جب وہ جھگڑتے تھے۔ اس نے آئینے میں اپنے چہرے کا جائزہ لیا۔ معطی کا ہاتھ ٹھیک اس کے رخسار پر نہیں پڑا تھا، تاہم اس کے واضح نشان اس کی گردن اور جبڑے پر دیکھے جا سکتے تھے۔ اس نے سنک کا پہلو تھام کر بڑی لمبی خرخراتی ہوئی چیخ ماری۔

وہ ہنوز غسل خانے ہی میں تھی کہ معطی پاؤں پٹختا ہوا گھر سے باہر چلا گیا، دروازے کو پیچھے دھڑ سے بند کرتے ہوئے۔ وہ یہ اطمینان کرنے کے لیے کہ معطی واقعی جا چکا ہے کچھ دیر انتظار کرتی رہی، پھر باہر آئی اور ایک ٹرٹل نیک سویٹر نکال کر اپنے لباس کے نیچے پہن لیا۔ معطی ان دنوں گھر کم سے کم خرچ دے رہا تھا۔ وہ اپنی دوپہریں اپنے صحن ہی میں گزارتی۔ یہاں اپنی مشین پر جھکی ہوئی، وہ مجلسی لوگوں کے لیے بڑے تجاوٹوں والے سرپوش اور دلہنوں کے لیے بستر کی چادریں بناتی۔ اب جبکہ معطی کی نوکری جاتی رہی تھی، اسے معلوم تھا کہ وہ بیئر کے پیسوں کے واسطے اس کے پاس آیا کرے گا۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں پر گر جانے دیا۔ یہ حال کیسے ہوا؟ وہ آدمی کہاں چلا گیا ہے جس سے اس نے شادی کی تھی؟ وہ تو امکانات، توانائی اور حوصلے سے بھرا ہوا تھا، لیکن اب وہ کاہل اور غصیلا ہو گیا تھا، ٹیکسوں کے خلاف لعن طعن کرتا کہ وہ اس کے نفقے میں گھٹائی کر دیتے ہیں، اُن گاہکوں کے خلاف جو اسے بخشش نہیں دیتے تھے، دوسرے ڈرائیوروں کے خلاف جو جب وہ پینے کے لیے کھسک گیا ہوتا اسے بچانے کے لیے بہانے نہیں بناتے تھے۔

اس نے چہرہ ہاتھوں سے صاف کیا، مار کے نشانوں کو ٹٹولا جو ابھرنے شروع ہو چکے تھے، اپنا گھر کا لباس اوپر کر کے پچھلی مار کا نشان ڈھونڈا، جب معطی نے اس کی پنڈلی اپنے بیلٹ کے بکل سے ادھیڑ دی تھی۔ اب جبکہ زخم بھر چکا تھا، اس کی شکل ہونٹوں جیسی ہو گئی تھی، یوں جیسے اس نے اس کی

ٹانگ کا بوسہ ہی لے لیا ہو اور اس کا نشان چھوڑ گیا ہو۔ اس نے اس کے اردگرد کی کھال کو کھجایا اور اپنی جراب کھینچ کر اوپر کر لی۔

حلیمہ بس کا انتظار کرنے لگی جو اسے انفا میں حج کے گھر لے جانے والی تھی، کاسابلانکا کا سمندر کے پاس کا ایک خوش وضع محلہ جہاں اونچے طبقے کے لوگ رہتے تھے۔ ایک تیار راستہ اختیار کرنے سے اس کا دل گھبرایا، اور وہ اسٹاپ پر اکڑی اکڑی سی کھڑی رہی، گاہے گاہے آگے کو جھک کر دیکھ لیتی کہ کیا بس محمد خامس چوک کا موڑ کاٹ رہی ہے۔ وہ ایک ہلکے سبز رنگ کا جلابہ پہنے ہوئے تھی اور اس کے بال، جو چند ہفتے پہلے ہی چھوٹے تراشے گئے تھے، ہوا میں پھڑ پھڑا رہے تھے۔ وہ اپنے بٹوے کو مضبوطی سے پکڑے رہی۔ اس سے پہلے اتنی زیادہ رقم لے کر وہ کبھی نہیں نکلی تھی۔ ماں کے گھر سے رخصت ہونے سے پہلے اس نے وہ رقم گنی تھی جو اس کے بھائیوں نے اس وقت بھجوائی تھی جب اس نے بتایا تھا کہ وہ اپنی طلاق کا ڈول ڈالنے والی ہے۔ اس نے ہر نوٹ کو اپنے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے درمیان کڑکڑا کر دیکھ لیا تھا اور پھر ایک لفافے میں رکھ دیا تھا جو اب اس کے ہینڈ بیگ کے ایک اندرونی خانے میں محفوظ تھا۔

ربڑ اور گاڑیوں سے خارج ہونے والے گیسیلے دھویں کی بو فضا میں بسی ہوئی تھی۔ بس اسٹاپ کے نزدیک مزدوروں کی ایک ٹولی اکڑوں بیٹھی ہوئی تھی، سگریٹیں زردی مائل انگلیوں کے بیچ پھنسی ہوئی، نیلے دھویں کے بادلوں کے نیچے گپ شپ کرتے ہوئے۔ ایک نائی نے اپنی دکان کا آہنی پردہ ابھی ابھی اوپر اٹھایا تھا، اور اب گرد سے نجات پانے کی بے سود کوشش میں دکان کے سامنے فٹ پاتھ پر چھڑکاؤ کر رہا تھا۔ آخر ایک کھٹارا بس، جس کا آگے کا بمپر جھول رہا تھا، چنگھاڑتی، کالے دھویں کا بادل لہراتی آ پہنچی۔

حلیمہ اوپر چڑھی۔ سفر تقریباً گھنٹہ بھر لمبا ہوگا، راستے میں کئی ٹھہراؤ آئیں گے، لیکن وہ اپنی پیٹھ تیر کی طرح سیدھی تانے بیٹھی رہی، کسی گڑبڑ کے ادنیٰ سے آثار پر فوراً اٹھ کھڑے ہونے کے لیے چاق و چوبند۔ بس کے ریڈیو پر کوئی گانا آ رہا تھا، اور اس کی تیز لاؤڈ اسپیکروں سے خارج ہوتی ہوئی گڑبڑاہٹ سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے اُم کلثوم کے بول "فکروني" پہچان

لیے۔ اس نے اپنی قوتِ ارادی سے موسیقی کی آواز کو اپنے شعور سے خارج کر دیا۔

بس ایک اسپتال کے نزدیک آ کر رکی اور بھانت بھانت کے مسافروں کی ایک ٹولی، بھک منگے، اور پھیری والے آ چڑھے۔ آخر میں سوار ہونے والا ایک دبلا پتلا آدمی تھا جس کے بال تار جیسے تھے، اور جو درمیانی راستے سے ہر نشست کے ہینڈل کو پکڑ پکڑ کے آہستہ آہستہ چلتا ہوا بس کے درمیانی حصے میں پہنچا۔ اس نے اپنی قمیص کا دامن اوپر سرکایا اور اپنے پیٹ سے پیوست ایک چوکور تھیلی کو ظاہر کیا۔ اس کے اندر کا سیال پیشاب جیسا لگ رہا تھا۔ وہ گھوما تاکہ سب لوگ اچھی طرح سے مشاہدہ کر لیں۔ کئی لوگوں کی سانس پھول گئی۔ اس نے اپنی ایک انگلی اوپر کی طرف اُٹھائی اور اپنا دکھڑا بڑی بلند اور واضح آواز میں سنایا۔

"اَبنائے آدم،" وہ بولا، "میری تقدیر میں خدا نے یہی لکھا ہے۔" اس نے بیلٹ ڈھیلی کی جو تھیلی کو سنبھالے ہوئے تھی اور اپنے شکم میں پڑا سوراخ دکھایا جو آب بھرنے لگا تھا۔ "دیکھو کہ مجھے ہر روز کیا جھیلنا پڑتا ہے اور اپنے اور میرے خدا کا شکر ادا کرو کہ تمھیں مجھ جیسی اذیت نہیں اُٹھانی پڑتی۔" سروں کی جنبش اور زبانوں کی چسکیوں کی آواز نے اس کے اعلان کو تسلیم کیا۔ "جو بھی اسپتال کا بل ادا کرنے میں میری مدد کرے گا، خدا اس کی کفالت کرے گا، اس پر جنت کے دروازے کھول دے گا، بچوں سے بامراد کرے گا، خدا اسے نظرِ بد سے محفوظ رکھے گا..." اور اس نے اپنی دعاؤں کی گردان

دیکھتے دیکھتے ہاتھ اُٹھے، بعض سکے بعض نوٹ ... نے دعائیں دینا بند کیا اور گھوم گھام کر نذرانے اکٹھے کرنے لگا۔

جب وہ حلیمہ کی نشست کے پاس سے گزرا تو اپنی خالی ہتھیلی اس کے آگے کر دی۔ اس پر سرخ روغن کے ذرّے تھے، جو وہاں اس وقت بے چپک گئے تھے جب اس نے نشستوں کے رنگ اُکھڑے ہینڈل پکڑے تھے۔ حلیمہ نے اس کی طرف سے رخ پھیر کر کہا، "خدا ہم سب کی د کرے۔" آدمی بخوشی دینے والوں کی طرف بڑھ گیا، اپنے پیچھے اسپتال کی مختلف بساندوں کی لین ڈوری چھوڑتے ہوئے۔

بس انقاسے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ حلیمہ نے اپنا بیگ پہلو میں اپنے سے اور قریب کر لیا اور اپنے بس اسٹاپ کی راہ دیکھنے لگی۔ اس کے نظر آتے ہی وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور باہر نکل آئی۔ گری کے

Scanned with CamScanner

باعث اس کے پیر سوج گئے تھے، اور اس کے پلاسٹک کے نیلے سینڈل اس گھر سے قریب تر لاتے ہوئے ہر قدم کے ساتھ چرچرانے لگے۔

آخر کار اسے حویلی مل ہی گئی۔ یہ ایک سفید سیمنٹ کی عمارت تھی جس کی چھت اور کھڑکیوں پر بحیرۂ روم کے علاقے کے سرخ رنگ کے ٹائلوں کے حاشیے پڑے ہوئے تھے۔ اس کا لان بے حد بنا سنورا ہوا تھا، گیٹ لاکھی روغن کی لکڑی کا تھا، اور ایک بڑی نفیس ڈور بیل لگی ہوئی تھی، جو حلیمہ نے بجائی۔

ایک ماما، پشتکل نوجوان لڑکی، دروازہ کھولنے آئی۔ حلیمہ نے بتایا کہ وہ جج سے ملنے آئی ہے۔ ماما نے اسے ایک جانی پہچانی نظر سے دیکھا اور صحن میں انتظار کرنے کے لیے کہا۔ حلیمہ نے باہر ہی کھڑے رہنے کو ترجیح دی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ جج شادی شدہ ہے، کہ اس کی بیوی گھر پر موجود ہے۔ وہ ناشائستگی کے ادنیٰ ترین اظہار سے بھی مجتنب رہنا چاہتی تھی۔ سو وہ باہر سیڑھیوں ہی پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔

جج دروازے پر نمودار ہوا۔ اس کا چہرہ پھولا ہوا تھا، لیکن اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں توجہ کرنے کا حکم دے رہی تھیں۔ اس نے سڑک پر یوں جھانکا جیسے کسی اور کو دیکھ رہا ہو، پھر کہا، "اندر صحن میں آجاؤ، وہاں مت کھڑی رہو۔" حلیمہ اتنی سہمی ہوئی تھی کہ منع نہ کر سکی۔ وہ جج کے پیچھے پیچھے ہو لی جج اپنے کرارے، سفید جلابے میں جو اس کے تھلتھلاتے سینے کے گرد پھنسا پھنسا سا تھا، بطخ کی چال چلتا ہوا اندر چلا۔

"رقم لائی ہو؟" اس نے سوال کیا۔ حلیمہ نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ لرزتے ہاتھوں سے اس نے اپنا بٹوا کھولا اور لفافہ اس کے سپرد کر دیا۔ جج نے نوٹوں کی گڈی نکالی اور گننے لگا۔ واپس کرنے سے پہلے اس نے لفافے کے اندر دوبارہ جھانک کر دیکھا، پھر نوٹ اپنی سروال [شلوار] کی جیب میں ڈال لیے۔ "اگلی مرتبہ چھوٹے نوٹ مت لانا۔"

حلیمہ نے یہ بات اپنے پر جبر کے ساتھ برداشت کی۔ اسے اگلی مرتبہ کا حوالہ ناگوار گزرا۔ جج نے اپنے جلابے کو جسم پر درست کیا اور اس سے کہا کہ پریشان نہ ہو۔ "پیشی پر وقت سے پہنچ جانا۔ تمھیں اپنی طلاق اسی ہفتے مل جائے گی۔" اس نے حلیمہ کی پیٹھ تھپتھپائی اور اسے احساس ہوا کہ معاملہ

ختم ہو گیا ہے اور وہ اسے دروازے کی طرف دھکیل رہا ہے۔ یک بارگی اسے یہ خواہش ہوئی کہ رقم کے تبادلے میں کچھ اور وقت لگا ہوتا۔ طارق اور عبدالکریم نے اسے بچانے کے لیے بڑی کڑی محنت کی تھی اور خود اس نے اس کے لیے بڑا لمبا انتظار کھینچا تھا، اور اب یہ اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ وہ لرزی اور گیٹ کو پکڑے رہی لیکن اس سے باہر نہیں نکلی۔ اور اگر اس نے بچوں کو اس کی تحویل میں نہیں دیا تو؟ اسے خیال آیا۔ وہ گھومی۔ اس نے ساری رقم یک مشت ہی اسے کیوں دے دی؟ وہ اسے نصف دے سکتی تھی اور بقیہ نصف طلاق اور تحویل مل جانے کے بعد چکانے کا وعدہ کر سکتی تھی۔ یہ بات اسے پہلے کیوں نہیں سوجھی؟ ''ٹھہریے،'' اس نے کہا۔

جج کا چہرہ، جو چند لمحے پہلے اگر کریم نہ بھی سہی، کم از کم نرم ضرور لگ رہا تھا، اب قطعی ضرر رساں نظر آ رہا تھا۔ ''کیا؟''

''بچے،'' وہ بولی۔

اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ وہ بس کچھ کہنے ہی والا تھا لیکن اپنے کو روک لیا۔

''مجھے کیسے معلوم ہو کہ آپ اپنے وعدے پر قائم رہیں گے؟'' حلیمہ کا دل سینے میں اتنی شدت سے دھڑ دھڑا رہا تھا کہ اسے لگا وہ اس کی آواز اپنے کانوں میں سن سکتی ہے، اپنی کنپٹیوں میں، حتیٰ کہ اپنے ہاتھوں میں بھی۔ ''میری رقم واپس کر دیجیے۔''

جج ناراض نظر آنے لگا۔ ''میں تم جیسوں کو خوب جانتا ہوں،'' وہ بولا۔ اس نے اپنی ہتھیلی اس کی پیٹھ پر رکھی اور اسے دروازے کی طرف دھکیلنے لگا۔ اس نے جسم اکڑا لیا۔ جج نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا اور اپنی انھیں چھوٹی چھوٹی للکارتی ہوئی آنکھوں سے اسے گھورا۔ ''چلتی بنو، قبل اس کے کہ میں اپنا ارادہ بدل دوں۔''

حلیمہ کو اپنے گھٹنے لرزتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس کے حلق میں ایک گرہ سی پڑ گئی، اور اس نے اسے نگلنے کی کوشش کی۔ بچے کیوں نہیں اس کے حوالے کرے گا؟ جج برسوں سے رشوت لے رہا تھا؛ یہ سوچنے کی کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ اس بار وعدہ پورا نہیں کرے گا۔ لیکن اگر نہ کیا تو؟ وہ اس پر کیسے بھروسا کر سکتی ہے؟ وہ اس پر بھروسا نہیں کر سکتی، جیسے اپنی ماں پر نہیں کر سکتی، نہ جادوگرنی پر۔ ''میرے پیسے واپس کر دیجیے،'' اس نے لرزتی آواز کہا۔ جج کی آنکھیں چوپٹ کھل گئیں اور اس کے لب ایک

ایسے تاثر کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا ہوئے جو غصے اور نفرت کے بین بین تھا۔ اس نے ہاتھ جیب میں ڈالا اور رقم نکال کر اس کی طرف پھینک دی۔ جیسے ہی نوٹوں کی گڈی زمین پر گری، چند نوٹ اس میں سے نکل کر اڑنے لگے۔ حلیمہ نے اپنے گھٹنے زمین پر ڈالے اور انھیں اپنے دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔ جج نے جھپٹا مار کر اس کے حلالے کو پیچھے سے پکڑ لیا اور اسے دھکا دیا۔ حلیمہ نے اپنا سارا زور اکٹھا کر کے کہنی اس کے پیٹ میں گھسیڑ دی۔ وہ درد کے مارے دوہرا ہو گیا، اس کے بازو اس کے پیٹ کے اوپر لپٹے ہوئے تھے، دریں اثنا حلیمہ، مٹھی بھر نوٹ ہاتھوں میں لیے، باہر نکل گئی۔ گیٹ دھڑ سے بند ہو گیا۔ اس کے پیچھے، صحن پُرسکوت ہو چکا تھا؛ جج درونِ خانہ جا چکا تھا۔ اس نے رقم اپنے بٹوے میں محفوظ کر لی اور ہاتھوں سے کولھے رگڑنے لگی۔ ایک مرسیڈیز شور مچاتی ہوئی ویران سڑک سے گزری، خوب زور سے ہارن بجاتی ہوئی۔ ڈرائیور نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا، دانت نکال کر ہنسا۔ حلیمہ نے اسے نظر انداز کر دیا اور چلنے لگی۔

چند دنوں بعد حلیمہ بس پکڑ کر شہر کے کاروباری علاقے میں اپنی صفائی ستھرائی کی ملازمت پر پہنچی، وہ یہاں حنان بھر کے دفتر کی صفائی کرتی تھی، ایک مترجم جسے مہاجرت کی دستاویزات میں اختصاص حاصل تھا۔ حلیمہ کو یہ ملازمت اُس مرکز کے توسط سے ملی تھی جہاں وہ خواندگی کی کلاسیں پڑھنے جاتی تھی، اور جہاں ایک بڑی سی تختی پر، جسے وہ سال بھر لمبے خواندگی کے پروگرام کے بعد پڑھنے کے قابل ہو گئی تھی، جلی حروف میں لکھا تھا: "اپنے مستقبل کے لیے کام کیجیے — آج"۔ کلاسوں سے جو واحد فائدہ اسے اب تک پہنچا تھا وہ یہ تھا کہ اب وہ سوپ اوپراؤں کے اختتام پر، جنھیں وہ ہر رات دیکھتی تھی، اسکرین پر شرکا کے گھومتے ہوئے نام پڑھ سکتی تھی۔

دروازے پر دو بار دستک دینے کے بعد حلیمہ نے چابی لگائی اور اندر داخل ہو گئی۔ اس نے باریک شفاف کپڑے کے پردے کھینچ کر ایک طرف سرکائے اور فرانسیسی طرز کی کھڑکیاں کھول کر تازہ ہوا اندر آنے دی۔ اس نے شہر کا منظر دیکھا، جس پر شاہ حسن کی مسجد حاوی تھی، صبح کی روشنی میں چمکتے ہوئے اپنے ملمع کے گولوں جیسے تین میناروں سمیت۔ حلیمہ نے کوڑے دان خالی کرنے شروع کیے۔ وہ موزیک کے فرشوں کو پوچھا لگا رہی تھی کہ حنان داخل ہوئی۔ "صباح الخیر،" اس نے کہا۔ اس نے اپنا

بریف کیس ایک کرسی پر ڈالا اور جیکٹ دوسری پر۔

"صباح الخیر،" حلیمہ نے جواباً کہا، اور کہتے وقت اپنے کو زبردستی ہشاش بشاش ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

حنان گہرے رنگ کا پن اسٹرائپ اسکرٹ پہنے ہوئے تھی اور بٹن لگے کالر والی سفید قمیص۔ اس کے بال سیدھے کڑھے ہوئے تھے، پونے سرمئی آئی شیڈو سے سیاہ، اور اس کے ہونٹ چمکیلے سرخ۔ میں اس جیسی ہو سکتی تھی، حلیمہ کو خیال آیا، جیسے ہمیشہ جب وہ حنان کے پاس ہوتی تو آتا تھا۔ میں اس جیسی ہو سکتی تھی، اگر میری قسمت مختلف ہوتی، اگر میں کسی باقاعدہ اسکول گئی ہوتی، اگر میں نے کسی اور سے شادی کی ہوتی۔ وہ اب حیرت سے سوچنے لگی کہ آیا حنان بھی اس کے متعلق اسی طرح سوچتی تھی اور محض رحم کھا کر اسے یہ نوکری دے دی تھی۔

حنان اپنے کاغذات الٹتی پلٹتی رہی اور اس اثنا میں حلیمہ اپنے کام میں لگی رہی۔ ملاقاتی کمرے کی صفائی سے فارغ ہونے کے بعد اس نے پوچھے باورچی خانے کی الماری میں رکھے اور اپنے ہاتھ دھوئے۔ "میں نے کام ختم کر لیا ہے،" اس نے بتایا، اور جانے کے لیے اپنا جیکٹ اوڑھ لیا۔ حنان نے نہیں سنا، کیونکہ وہ اپنے کاغذات میں غرق تھی۔

"بہت کام ہے؟" حلیمہ نے پوچھا۔

"مجھے؟ ہاں بالکل،" حنان نے جواب دیا۔ "جب تک لوگ مہاجرت کرتے رہیں گے، میرے پاس کام ہی کام رہے گا۔"

حلیمہ لاشعوری طور پر حنان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے بھائیوں کے بارے میں سوچا، جب وہ ہنوز ایک چھوٹی سی لڑکی تھی، ایک صبح طارق چلا گیا اور عبدالکریم اس کے پیچھے پیچھے چند ماہ بعد، اور پھر پورے ایک سال تک دونوں کی جانب سے خیر خبر کا ایک لفظ تک نہیں ملا تھا۔ پھر روپیہ پیسہ آنا شروع ہوا، پہلے جستہ جستہ، بعد میں لت ڈالنے والی باقاعدگی کے ساتھ، اور جب کہ اس کی ماں کسی نہ کسی طرح واجبات کی ادائیگی کرتی رہی، حلیمہ، ان کی دریادلی سے اسی استواری کے ساتھ متمتع نہ ہوئی، ہنوز سیمنٹ کے اُسی گھر میں گزر بسر کرتی رہی جس کی لہریے دار ٹین کی چھت تھی جس سے بھورے رنگ کا پانی ریلے کی شکل میں سڑک کے بیچوں بیچ گرتا رہتا۔ اب اس نے اچنبھے

سے سوچا کہ اگر اپنے بھائیوں ہی کی طرح وہ بھی یورپ چلی گئی ہوتی تو کیا ہوتا۔ کیا اس کے پاس بھی اپارٹمنٹ ہوتا، کپڑے دھونے کی مشین، اور کوں جانے کار بھی؟ اور کیا معطی بھی؟

وہ ساکت بیٹھی رہی۔ حنان نے سر اٹھا کر دیکھا، آنکھوں میں ایک سوال لیے۔ حلیمہ نے اپنے ہاتھ باندھے اور اپنے جوتوں کو دیکھا۔ ''میں سوچ رہی تھی... '' اس نے زبان پھرا کر اپنے ہونٹ تر کیے۔ ''ہجرت کرنے میں بھلا کتنی دشواری پیش آتی ہے؟''

حنان کے کندھے ڈھیلے پڑ گئے۔ اس نے تیزی سے ایک چٹکل اٹھائی اور ہیجان آمیزی سے اسے اپنی انگلیوں کے بیچ میں تھپتھپانے لگی۔ ''میں وکیل نہیں ہوں۔ میں دستاویزات کا ترجمہ کرتی ہوں۔''

حلیمہ نے شانے اچکائے۔ ''پھر بھی،'' وہ بولی، ''آپ کو پتا تو ہوگا۔''

''تم نے سفارت خانوں کے باہر لگی قطاریں دیکھی ہیں؟'' حنان نے پوچھا۔

حلیمہ نے اثبات میں سر ہلایا، اس کے باوجود کہ اس نے نہیں دیکھی تھیں۔ معطی نے، بہرحال، اسے ان کے بارے میں بتایا ضرور تھا، لوگوں کے بارے میں جو پوری رات لائن میں کھڑے صرف اس لیے انتظار کرتے ہیں کہ عمارتوں کے اندر جانے کا موقع مل جائے گا، سچ مچ کی عرضی دینا تو دور کی بات ہے۔ اسے گاہکوں کو سفارت خانے لے جانا پسند تھا کیونکہ شام کے وقت، جب قطار لگنے لگتی، ٹیکسی کا کرایہ زیادہ ہوتا تھا۔ ''لیکن فرانس میں میرے بھائی ہیں،'' اس نے کہا۔

''اچھا،'' حنان نے کہا۔ وہ دوسری طرف دیکھنے لگی، جیسے کچھ کہنے پر شرمساری محسوس ہو رہی ہو، پھر سانس لی۔ ''اس کے باوجود، وہ ایسے لوگوں کو ویزا نہیں دیتے ہیں...''

حلیمہ کو معلوم تھا کہ حنان کا کیا مطلب ہے۔ اسے معلوم تھا کہ اس جیسے لوگ، بے ہنر اور تین تین بچوں والے، انھیں ویزا نہیں ملتا۔

''اس حرامی کو عدالت لے جاؤ،'' حنان نے لمبی سانس بھر کے کہا۔

''وہ تو میں کر چکی ہوں۔''

حنان نے پلک جھپکائی، کرسی کی پشت سے لگ کر بیٹھ گئی، عاجز کہ کیا کہے۔ کمرہ خاموش تھا، تنہا آواز پنسل سے آ رہی تھی، جواب بھی حنان کی انگلیوں کے بیچ تھپتھپا رہی تھی۔

''ویزا حاصل کرنے کی کوئی نہ کوئی صورت تو ہوگی؟'' حلیمہ نے پوچھا۔

حنان نے شانے اُچکائے۔ ''تمھارے پاس کل وقتی ملازمت ہونی چاہیے، بینک اکاؤنٹ، ٹکٹ، رہنے کے لیے جگہ — خاصا پیچیدہ مسئلہ ہے،'' اس نے کہا، یوں جیسے حلیمہ کوئی ایسی چیز سمجھنے سے قاصر ہو جسے تین آسان سے مرحلوں سے زیادہ کی حاجت ہو، جیسے، دھوؤ، جھاگ نکالو، نچوڑو۔ میں اس سے کہیں زیادہ جانتی ہوں، حلیمہ اسے بتانا چاہتی تھی۔ اچانک اسے افسوس ہوا کہ اس نے حنان سے کچھ بھی کیوں کہا۔ یہ سوچنا غلطی تھا کہ حنان یا وہ جج یا وہ جادوئی سفوف اسے اس حالت سے باہر لا سکیں گے۔

''کوئی دوسرا ذریعہ ضرور ہوگا،'' حلیمہ نے کہا۔

''تمھارا مطلب ہے، غیر قانونی طور پر جانا؟''

حلیمہ نے پھر شانے اُچکائے۔ اسے معلوم تھا کہ جب اس کی ماں صبر کرو کے اسی پیش پا افتادہ نغمے کی بازخوانی کرے گی تو وہ جواب میں کیا کہے گی۔ اسے مستقبل کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا۔ آج۔

❄

قبولیت

عزیز عمور نے وہ ہفتہ لوگوں سے خدا حافظ کہنے میں گزارا۔ اب تک، وہ چچا چچیوں کی دو جوڑیوں سے مل آیا تھا، چار دوستوں، اور کئی پڑوسیوں سے، لیکن کسی نے اسے سفر کے لیے اپنی نیک تمنائیں پیش نہیں کی تھیں۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ اس کا ارادہ پتیرا (patera) کشتی پر اپنی قسمت آزمانے کا ہے، تو انھوں نے اپنے اضطراب کے تاثر کو چھپانے کی کوشش کی، حوصلہ افزائی کے لیے اس کی پیٹھ تھپتھپائی، اور ہمدردی سے اپنے سر ہلائے۔ اس کے اعلان سے جس طرح سکوت چھا جاتا تھا، وہ اس سے بیزار ہوتا جا رہا تھا، تو جب، خبر سن کر، اس کے دوست لحسن [الحسن] نے کھڑے ہوتے ہوئے میز

اُلٹ دی، اسے بڑی راحت کا احساس ہوا۔

''تمھاری عقل تو نہیں ماری گئی، عمور؟'' اس نے کہا۔ حالانکہ لحسن اور عزیز ایک دوسرے کو ابتدائی اسکول سے جانتے تھے، لحسن اسے اب بھی اس کے آخری نام ہی سے پکارتا تھا، جس طرح اسکول کے لڑکے اکثر کیا کرتے ہیں۔ آج عزیز اور لحسن کی دوستی کو بیس سال ہو رہے تھے۔ وہ چوری چھپے ساتھ ساتھ سینما گئے تھے، اپنی پہلی سگریٹ ساتھ ساتھ پی تھی، اپنی بیئر کی پہلی بوتل آدھی آدھی بانٹ کر پی تھی — ہائے کن بیئر کی بوتل جو کسی مہنگے، پرائیویٹ اسکول کے نوخیز طالب علموں کی ٹولی سکول پاس کرنے کی خوشی منانے کے بعد ساحل پر چھوڑ گئی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے لڑکیاں بھی پھانسی تھیں، گو زیادہ تر عزیز ہی یہ کام کرتا تھا۔ لحسن، عزیز نے دیکھا تھا، عورتوں کے معاملے میں کبھی بہت زیادہ خوش قسمت نہیں رہا تھا۔

عزیز نے میز دوبارہ ٹانگوں پر کھڑی کر دی، اور اپنی بیوی زہرہ پر ایک دزدیدہ نظر ڈالی جو دیوان پر اس کے مقابل بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے عزیز کو باز رکھنے کی کئی بار کوشش کی تھی، اور وہ اس منظر کو اس شخص کی ملیحدگی سے دیکھ رہی تھی جو سارے دلائل پہلے ہی سن چکا ہو، اور جو اس کے باوجود مجتسس ہو کہ دیکھیں شاید اس بار ان کا حل مختلف نکلے۔ عزیز اور زہرہ اتوار کو نمازِ عصر کے فوراً بعد ہی لحسن سے ناگہانی ملنے چلے آئے تھے۔ لحسن اپنے والدین اور چار بہنوں کے ساتھ ورب تکیان کے ایک دو منزلہ مکان میں رہتا تھا جو کاسابلانکا کے پرانے شہر میں واقع تھا۔ کھڑکی بند تھی، لیکن شیشیوں سے کبھی کبھار در آنے والی کاروں کے ہارن اور بائیسکلوں کی گھنٹیوں کی آواز پھر بھی سنائی دے جاتی۔

''اطمینان رکھو،'' عزیز نے کہا۔

لحسن نے اپنی مٹھیاں کھول دیں اور زور سے بولا، ''تم کیسے مجھ سے اطمینان رکھنے کو کہہ سکتے ہو؟ اگر تم ڈوب گئے تو؟'' وہ بس ایسا ہی تھا — بدترین احتمال کا خیال اسے سب سے پہلے آتا تھا۔

''میں اچھا پیراک ہوں،'' عزیز نے جواباً کہا۔ ''اور پھر یہ بھی ہے کہ ان دنوں موٹر بوٹ استعمال ہو رہی ہیں۔ وہ مجھے ساحل پر اتار دیں گے۔''

''اور تمھارے خیال میں ہسپانیہ اچھا ثابت ہوگا؟ کچھ نہیں، بس سخت محنت، بے وطنی اور تنہائی کا احساس ہوگا۔''

"کم از کم یہ کچھ کام آنے لگا،" زہرہ بولی۔ عزیز کو حیرت ہوئی کہ وہ اس کی مدافعت کے لیے ٹھیک وہی الفاظ استعمال کر رہی ہے جو اُسے قائل کرنے کے لیے خود اس نے چند ہفتے پہلے ہی استعمال کیے تھے۔ زہرہ کے گھر والوں نے اسے کبھی پسند نہیں کیا تھا۔ انھوں نے زہرہ کو صرف اس لیے عزیز سے شادی کرنے دی تھی کہ وہ تین سال تک اس سے ملتی رہی تھی اور ان کی "بدچلن بیٹی" کی بابت پڑوسیوں کی گپ بازی نے ان کا بیڑا غرق کر دیا تھا۔ لیکن شادی سے عزیز کے اپنے سسرالیوں سے کشیدہ تعلقات سدھر نہ سکے۔ وہ اٹھتے بیٹھتے زہرہ کو اس کی بے روزگاری کے طعنے دیتے رہتے تھے، جن میں زہرہ کے سوڈا فیکٹری میں ملازمت کر لینے کے بعد سے تو اور بھی شدت آ گئی تھی۔

جب عزیز کو یہاں سے جانے کا خیال آیا تو زہرہ نے اسے باز رکھنے کی کوشش کی، لیکن بے روزگاری کے چند اور مہینے گزر جانے کے بعد اس نے ہار مان ہی لی۔ اس نے کہا کہ وہ اس کا انتظار کرے گی اور جب وہ واپس لوٹ آئے گا تو وہ اس کے والدین کا گھر چھوڑ دیں گے، اپنا مکان لے لیں گے، اور بچے پیدا کریں گے۔ الغرض، وہ بولی، وہ زندہ رہنے کی شروعات کریں گے۔

"اور تمھارا کیا ہوگا؟" محسن نے زہرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تمھیں پیچھے اکیلا چھوڑ کر چلا جائے گا؟"

"میں دو تین سال بعد لوٹ آؤں گا،" عزیز بولا۔

"کیا یہ ہم نے پہلے نہیں سنا؟" محسن نے انگلی رخسار پر رکھتے ہوئے کہا، جس سے وہ اچھی بھلی عورت نظر آنے لگا۔ "کوئی بھی لوٹ کر نہیں آتا۔"

"میں آؤں گا،" عزیز انگوٹھا سینے پر رکھ کر بولا۔

"یہ ضرور لوٹ آئے گا،" زہرہ نے کہا۔ اس نے اپنے جلابے کی آستین سے رومال نکالا اور اپنی ناک سنکی۔ اسے پیچھے چھوڑ جانے پر عزیز کو اپنا احساسِ جرم پھر ٹھونگے مارتا ہوا محسوس ہوا، اور اس نے اپنا ہاتھ اس کے گھٹنے پر رکھ کر نرمی سے دبایا۔

"تم کیوں اتنی شدت سے اس کے مخالف ہو؟" عزیز نے پوچھا۔ "تم کیا چاہتے ہو، میں کیا کروں؟"

محسن کی بہن حکیمہ، ہاتھوں پر چائے اور بسکٹوں کی سینی اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ محسن

نے اپنا سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا اور باہر نکل گیا۔ عزیز باری باری دونوں عورتوں کو دیکھنے لگا، اپنی بیوی اور اپنے عزیز ترین دوست کی بہن کو، اور یوں ان دونوں کے ساتھ تنہا چھوڑ دیے جانے پر خود کو قدرے سراسیمہ محسوس کیا۔ چنانچہ وہ اٹھا اور خود بھی محسن کے پیچھے باہر آ گیا۔

"تو تم کیا چاہتے ہو، میں کیا کروں؟" عزیز نے سیڑھیوں پر اپنے دوست کے برابر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ اسے واقعی جواب کی بابت تجسس تھا۔

"کچھ اور کرنے کی کوشش کرو،" محسن نے سگریٹ سلگاتے ہوئے جواب دیا۔

"مثلاً؟"

محسن نے کندھے اچکائے۔ "مجھے دیکھو۔ آخر کسی نہ کسی طرح گزارہ کر ہی لیتا ہوں۔" اس نے چار سو درہم چند فون کارڈوں پر لگائے تھے، اور وہ ہر سہ پہر کو ان افراد کے ہاتھوں زیادہ قیمت پر بیچتا تھا جو یہ فون استعمال کرنا چاہتے تھے۔ وہ کاسابلانکا کے کاروباری علاقے میں واقع مرکزی ڈاک خانے میں یہ دھندا کرتا تھا۔ اس کی کل آمدنی بے حد کم تھی، لیکن اس سے بسوں کا کرایہ اور سگریٹ کا خرچ نکل آتا تھا۔ اس کے علاوہ، اس نے بتایا کہ اسے یہی پسند تھا کہ وہ لوگوں کو اپنے سے خریداری کرنے پر رجھا لیتا ہے۔ اس لیے اسے دوسرے فون کارڈ بیچنے والوں سے، خواہ یہ مرد ہوں، عورتیں ہوں یا بچے، کشاکش بری نہیں لگتی تھی۔

"تمھاری بات مختلف ہے۔ تم اکیلے ہو۔"

"تو پھر تم نے شادی کیوں کی؟"

"کیا؟"

محسن نے سگریٹ کا کش لیا۔ "اگر تم نے شادی نہ کی ہوتی تو یہ سب کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔"

عزیز نے زبان سے کلک کی آواز نکالی۔ "میری بیوی کو بیچ میں مت لاؤ۔"

"میں تو یونہی کہہ رہا ہوں۔"

"تو تمھارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ تمھاری طرح سستے فروخت کرتا پھروں؟"

"کم از کم میں کچھ کر تو رہا ہوں۔ اور میرے پاس تو کوئی سند وند بھی نہیں، تمھاری طرح۔" یہ

سند کاغذ کا ایک پرزہ تھی جو عزیز کے بستر کے پاس ایک بستے میں پڑی دھول کھا رہی تھی۔ چند سال پہلے لحسن اور عزیز دونوں ہائی اسکول کے امتحان میں فیل ہو گئے تھے، اس لیے یونیورسٹی میں داخل نہیں ہو سکے تھے۔ لحسن نے اپنا فون کارڈوں کا دھندا شروع کر دیا تھا، لیکن عزیز تجارت کے اسکول جانے لگا تھا، اور دو سال بعد اسے خودکاری (automation) کی سند مل گئی تھی — جس کا بنیادی طور پر مطلب تھا کہ وہ مرمت کا کام کر سکتا ہے۔ کام اسے ملا نہیں۔

"سند ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"تمھارے پاس سند ہے جبھی ایسی بات کرتے ہو۔"

عزیز نے لمبی سانس کھینچی۔ "یہ آج تمھیں کیا ہو گیا ہے؟"

"یہ تو مجھے تم سے پوچھنا چاہیے، میرے دوست۔ تم میرے پاس آتے ہو، کہتے ہو کہ کشتی میں سوار ہو جاؤ گے، ہسپانیہ جانے کے لیے اپنی زندگی خطرے میں ڈالو گے، جہاں ملے ہے کہ پکڑ لیے جاؤ گے، اور پھر چاہتے ہو کہ میں تمھیں مبارکباد پیش کروں؟"

اپنے مستقبل کا یہ نقشہ عزیز پہلے اپنے والدین سے بھی سن چکا تھا۔ انھوں نے اسے تمام شکلوں سے متنبہ کر دیا تھا: بہترین شکل (زراعتی زمین پر کسی غلام کو ملنے والے مشاہرے والی نوکری)، بدترین شکل (خوف ناک موت)، اور ان دونوں کے درمیان ہر شے (جرائم کی ناقابل مفر زندگی!)۔ لیکن اس نے ان کی تنبیہوں کا مقابلہ برسوں تک ٹکے رہنے کے امکان سے کیا، برسوں تک بس کے کرائے کے لیے ان کے آگے ہاتھ پھیلانے کے امکان سے، برسوں تک کسی کے پوچھنے پر کہ کیا کام کرتا ہے نظریں جوتوں کی طرف جھکا لینے یا موضوع کو بدل دینے سے، اور یہ داؤ، آخر میں، اسے کھیلنے کے قابل معلوم ہوا۔ "تمھارے پاس ایک فالتو سگریٹ ہو گا؟" اس نے پوچھا۔

لحسن نے اپنا اولمپک روڑ کا پیکٹ بڑھا دیا۔ "دیکھو، میں شاید تمھاری مدد کر سکوں۔"

عزیز نے سگریٹ سلگا کر ایک لمبا کش لیا۔ پیچھے دروازہ کھلنے کی چرچراہٹ پر دونوں نے مڑ کر دیکھا۔ حکیمہ نے اپنا سر باہر نکال کر پوچھا کہ کیا وہ کھانا کھانے کے لیے اندر آ رہے ہیں۔ لحسن نے ہاتھ لہرا کے کہا کہ تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔ "جا کر روٹی لے آؤ،" حکیمہ نے کہا۔ "ختم ہو گئی ہے۔"

لحسن اور عزیز اٹھے اور پیر گھسیٹتے ہوئے نانبائی کی دکان کی طرف چل پڑے۔ باہر آسمان

ابر آلود تھا اور ہوا میں تیزی آ گئی تھی۔ انھوں نے ایک خالی میدان پار کیا جہاں سرخ گرد کے اُٹھتے ہوئے غبار کے نیچے لڑکے فٹ بال کھیل رہے تھے۔ بیکری میں اس دن کی ساری روٹیاں بک چکی تھیں، بس چند ہی باقی بچی تھیں۔ محسن نے ان میں سے جو زیادہ بہتر لگ رہی تھی دیکھ کر چن لی اور کیشیر کو ایک نوٹ دیا۔ اس نے دونوں آدمیوں کو آگے پیچھے دیکھا، ان پر بڑی ناگوار نظر ڈالی، اس کے باوجود رقم لے لی۔

"اسے کیا مصیبت ہے؟" جب وہ وہاں سے نکل گئے تو عزیز نے پوچھا۔

"بڑا عجیب آدمی ہے،" محسن نے جواب دیا۔ "محلے کے باہر والوں کو بالکل پسند نہیں کرتا۔"

"ہاں، بڑا گدھا ہے،" عزیز بولا۔ اس دکاندار نے عزیز کو اپنی دادی یاد دلا دی، جسے ان لوگوں میں جن سے وہ بمشکل واقف ہوتی عیب نکالنے کا مرض تھا۔ ڈاکیا، جو کاسابلانکا کے قریبی دیہی علاقے کا عروبی [بدو] تھا، اسے غیر مہذب اور اُجڈ لگتا تھا۔ اور درزی کو، جو شمالی علاقے کا شمالی تھا، وہ بس تھوڑا ہی بہتر گردانتی تھی، لیکن اکثر اس کے بارے میں یہ رائے دیتی کہ اتنا کائیاں ہے کہ اس سے کسی اچھائی کی امید عبث ہے۔ شلوح [بربر] جس سے وہ بازار میں پودینہ خریدتی تھی، وہ لالچی ہونے پر اکثر اس کی لعن طعن کا ہدف بنتا۔ بات یہاں تک پہنچ گئی کہ عزیز کو ان تمام لوگوں سے جو اس کی دادی کی نظر میں نامقبول ہوتے، ایک گونہ انس محسوس ہونے لگا تھا۔ عزیز نے یہ واردات محسن کو سنائی، اور جب وہ دونوں کھانا کھانے گھر لوٹ رہے تھے اپنے دوست کو شگفتہ خاطر کرنے کے لیے دو ایک چٹکلوں کا اضافہ بھی کر دیا۔

"وہ بڑی ٹوہ لیتا ہے،" زہرہ نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ مدینے کی طرف گھر لوٹ رہے تھے۔ ان کے ارد گرد دکاندار اپنی دکانیں بڑھا رہے تھے۔

"وہ فکر مند ہے،" عزیز نے کہا۔

"ایک وہی کیا، سبھی ہیں۔"

عزیز نے جواب نہیں دیا۔ وہ ابھی تک محسن نے جو کہا تھا اسی کی بابت غور کر رہا تھا۔

"تمھارا کیا خیال ہے، وہ واقعی کوئی مدد کر سکتا ہے؟" زہرہ نے پوچھا۔

Scanned with CamScanner

ٹھیک اسی سوال سے وہ خائف تھا۔ کہ لحسن کے مدد کے وعدے زہرہ کی امید کو ہوا دیں گے، ایک ایسی امید کو جو اسے جانے دینے کے بارے میں اس کے عزم کو نگل جائے گی، ایک امید جو اسے معلوم تھا کہ انتہائے کار پاش پاش ہو کر رہے گی۔ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دبایا۔ ''اگر لحسن مدد کرنے کے قابل ہوتا،'' وہ بولا، ''تو پہلے اپنی مدد نہ کرتا۔''

''کچھ نہیں کہا جا سکتا،'' وہ بولی۔

اگلے دن لحسن ڈبل بریسٹڈ سوٹ میں نمودار ہوا جو اس نے درب غلف میں بکنے والے لین دین کے بازار میں خریدا تھا جہاں استعمال شدہ امریکی کپڑے بکتے تھے؛ اسے وہ خاص خاص موقعوں پر پہنتا تھا۔ ''کدھر چلے؟'' عزیز نے دروازے پر اس کا استقبال کرتے ہوئے پوچھا۔

''ایک میٹنگ میں جا رہا ہوں،'' لحسن بولا۔ ''اور، عمور، تم میرے ساتھ چل رہے ہو۔'' اس نے اپنے پیچھے دروازہ بھیڑ دیا۔

عزیز کو معلوم تھا کہ لحسن نے جو منصوبہ بھی بنایا ہے، اس میں اسے ساتھ دینا ہی ہوگا، اور کچھ نہیں تو اپنے والدین کی خاطر، جو اس مہاجرت سے پہلے اسے ہر ممکن حل تلاش نہ کرنے کا الزام دیتے رہتے تھے۔ ''ٹھیک ہے۔''

لحسن عزیز کے والدین کے ساتھ چائے پینے کے لیے بیٹھ گیا۔ اس نے موسم پر بات کی، فٹ بال کے تازہ ترین میچ پر گفتگو کی، اور ان کی صحت کا حال پوچھا۔ عزیز کے والد نے فوری ''الحمدللہ'' کے ساتھ جواب دیا، اپنے نقلی دانتوں کو انگلی سے چھیڑتے ہوئے، انھیں منہ سے نکال کر اور دوبارہ ٹھیک سے بٹھاتے ہوئے، جبکہ عزیز کی والدہ، جو بڑی زبردست مزاقی واقع ہوئی تھی، اپنی تازہ بدہضمی کے دورے کی تفصیل بیان کرنے لگی۔ لحسن خوش اخلاقی سے سنتا رہا، چائے ختم کی، پھر عزیز کو اشارہ کیا کہ چلنے کا وقت ہو گیا ہے۔ ''اپنا بستہ لاؤ،'' اس نے حکم دیا۔

زہرہ بھاگتی ہوئی سونے کے کمرے میں گئی اور عزیز کے والد کی جیکٹ لے آئی اور اصرار کرنے لگی کہ وہ اسے پہن کر جائے۔ ''میٹنگ میں،'' وہ بولی۔

عزیز نے جیکٹ پہن لی اور اپنے دوست کے ساتھ شامل ہونے کے لیے دروازے سے باہر

نکلا۔

''ایک عورت جو مجھ سے منٹ خریدتی ہے کسی ڈینٹسٹ کے یہاں کام کرتی ہے۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ تمھارے لیے اپنے باس سے بات کرے۔''

''بھلا ایک ڈینٹسٹ مجھ سے کیا چاہے گا؟''

''اس کی کرسی ٹوٹ گئی ہے۔ شاید تم اس کی مرمت کر سکو، اور پھر ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے دوستوں کو تمھارے بارے میں بتائے۔''

''یہ کوئی نوکری نہیں۔''

''مجھے ذرا اپنے دانت دکھاؤ۔''

''کیا؟''

''یہ ضروری ہے کہ تم جب اس کے دفتر میں داخل ہو تو تک سک سے درست ہو۔''

عزیز ہنس پڑا۔

''تم جانو،'' وہ بولا، ''میں اس کی قدر کرتا ہوں کہ تم میری مدد کی کوشش کر رہے ہو۔ لیکن یہ کوئی ملازمت نہیں، یار۔ یہ ایک بار کا معاملہ ہے، کیوں، ہے نا؟''

''ہو سکتا ہے اس سے کوئی اور راہ کھل جائے۔''

وہ بس میں بیٹھ کر بیوپاری علاقے میں پہنچے اور ڈینٹسٹ کے دفتر میں ٹھیک اس وقت داخل ہوئے جب ایک مریضہ باہر نکل رہی تھی، دہاڑتی ہوئی کہ وہ اب دوبارہ کبھی نہیں آئے گی۔ لحسن عورت کے لیے دروازہ کھولے کھڑا رہا، تاکہ عورت سارے ڈاکٹروں کو عام طور پر اور ڈینٹسٹوں کو خاص طور پر اپنی لمبی لتاڑ سنانا ختم کر لے، پھر عزیز کو اپنے پیچھے لے کر داخل ہوا۔ وہ ریسپشنسٹ کی طرف دیکھ کر مسکرایا، پوچھا کہ اس کے بوائے فرینڈ کا کیا حال ہے، وہی جسے وہ ہمیشہ پے فون سے کال کرتی ہے۔

''وہ ٹھیک ہے،'' ہلکے گلابی پڑتے رخساروں کے ساتھ اس نے جواب دیا۔ ''بیٹھیے، میں ڈاکٹر کو اطلاع کرتی ہوں کہ آپ آئے ہیں۔'' وہ غائب ہو گئی، اور عزیز اور لحسن ایک کافی کی میز کے سامنے بیٹھ گئے جس پر تین آدھے پھٹے ہوئے رسالے پڑے تھے۔ یہ سب کے سب گالف کے بارے میں تھے۔ عزیز نے ایک اُٹھا کر پڑھنا شروع کیا جبکہ لحسن نے ٹانگ پر ٹانگ چڑھالی اور اپنی جیب میں رکھی

سگریٹوں کو تھپتھپانے لگا لیکن انھیں باہر نہیں نکالا۔

دوپہر رفتہ رفتہ گزرتی رہی، بس دروازے کی گھنٹی، دردکی کراہیں، اور کیش رجسٹر کی کا چنگ وقفے وقفے سے اس میں مخل ہوتی رہیں۔ جب گھڑی نے چھ بجائے، عزیز نے وہاں سے اُٹھنے کے لیے کہا۔ لحسن نے اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا کہ جب اتنا انتظار کر ہی چکے ہیں تو تھوڑا سا اور کر لینے میں کیا حرج ہے۔ بالآخر آخری مریض بھی رخصت ہوا اور ڈینٹسٹ باہر نکلا اور اپنا لیب کوٹ اُتارنے لگا۔ اس نے دونوں آدمیوں کی طرف کچھ تعجب اور کچھ واقفیت کی نظر سے دیکھا۔ ''اچھا، تو تم آئے ہو،'' وہ بولا۔

لحسن اور عزیز دونوں کھڑے ہو گئے۔ ڈینٹسٹ معائنے کے دوسرے کمرے میں گیا اور ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا جس کی سر ٹیکنے کی گدی ابھی تک اپنے اصلی پلاسٹک کے غلاف میں تھی۔ ''میں اسے چلا نہیں سکا،'' وہ بولا، ''اور مشینیں لگانے والی کمپنی میرے فون کا جواب نہیں دیتی۔''

لحسن ڈاکٹر سے گپیں مارتا رہا، دریں اثنا عزیز نے کرسی کا معائنہ کیا۔ بجلی کا تار تو لگا ہوا تھا، لیکن جب اس نے جھک کر دیکھا تو اس کے زیریں حصے میں اسے دو اضافی بٹن نظر آئے۔ اس نے ان میں سے ایک کو دبایا اور کرسی سے خرخراتی آواز نکلنے لگی۔ ''بجلی آن نہیں تھی،'' اس نے کہا۔

''اوہ،'' ڈینٹسٹ بولا۔ غیر یقینی سے عالم میں وہ اسٹول پر بیٹھ گیا اور اپنے پاؤں سے مختلف کنٹرولز کے بٹن دبا دبا کر دیکھنے لگا۔ کرسی اس کے حکم کے اتباع میں اوپر نیچے ہونے لگی۔ ''اچھا، شکریہ،'' وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا، اس کی آنکھیں کسی دوسری طرف دیکھ رہی تھیں۔

عزیز لحسن کو مختصر لیکن بڑی دل موہ لینے والی تقریر جھاڑتے دیکھتا رہا کہ کس طرح اس کا یہ دوست کوئی چیز بھی درست کر سکتا ہے، اور اگر ڈینٹسٹ اپنے ہم کاروں کو اس سے آگاہ کر دے تو اس وہ بہت مشکور ہوگا۔ ڈینٹسٹ نے مبہم انداز میں سر ہلایا اور اپنی ریسپشنسٹ کو آواز دے کر کہا کہ دفتر بند کرنا شروع کرے۔ اس نے ایک دس درہم کا نوٹ نکالا اور عزیز کو تھما دیا۔

جب وہ دفتر سے باہر نکلے، عزیز نے لحسن کا ہاتھ پکڑ کر اس میں نوٹ ٹھونس دیا۔ ''تمھارے سگریٹ کے اگلے پیکٹ کے لیے۔''

''کیا ہوا؟'' لحسن نے پوچھا۔

''میں دس درہم سے کیا بھاڑ جھونک لوں گا؟''

''کم از کم کچھ تو ہے۔''

''وقت کا زیاں، اور کیا،'' عزیز ایلی ویٹر کو بلانے والا بٹن دباتے ہوئے بولا۔

''اس طرح بات نہ کرو۔ وہ ضرور اپنے دوستوں کو بتائے گا۔''

''اور یہ اعتراف کرے گا کہ کس قدر بدتمیز ہے؟'' عزیز نے ایلی ویٹر کا انتظار چھوڑا اور اس کے بجائے بھاگتے ہوئے سیڑھیاں اُترنے لگا۔

''رکو،'' لحسن نے چلا کر کہا، اس کی آواز تاریک زینے میں گونجنے لگی۔

عزیز نے لحسن کو سیڑھی کا ایک قدم خطا کرتے سنا، چنانچہ بٹن دبا کر مقررہ وقت تک چلنے والی بتی روشن کر دی، اور اس کا انتظار کرنے لگا۔

عزیز اپنے ساتھ لے جانے والی اشیا کی فہرست میں سے چیزوں کو فرداً فرداً کاٹتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھ کم سے کم سامان لے جانا چاہتا تھا اور یہ فیصلہ کرنے کی کوشش میں غلطاں تھا کہ آیا سردیوں میں پہننے کے کوٹ کے بوجھ کا اضافہ کرے یا نہ کرے۔ زہرہ نے واٹر پروف جیکٹ کو، ہر چند کہ یہ کافی چھوٹی تھی، لے جانے کا مشورہ دیا، کیونکہ یہ وزن میں کم تھی اور ضرورت پڑنے پر اس کی جیب میں سما سکتی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ایک عملی فرد رہی تھی۔ ان کی کورٹ شپ کے ایام میں بھی، عزیز نے یہی محسوس کیا تھا کہ دونوں میں وہ زیادہ رومان پسند واقع ہوا تھا، اور وہ اکثر حیرت سے سوچتا کہ کیا اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ اس کے مقابلے میں زیادہ محبت کرتا تھا، یا وہ بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتی تھی جتنی وہ کرتا تھا، لیکن اپنے مخصوص، باہوش انداز میں۔

دروازے کی گھنٹی بجی۔ لحسن تھا، پوچھ رہا تھا کہ کیا عزیز کافی پینے چلے گا۔ ''یقیناً،'' عزیز نے جواب دیا۔ سامان باندھنے کو اب بھی بہت وقت پڑا تھا۔ وہ ایک کیفے میں آئے جو مدینہ سے بس ذرا ہی آگے تھا، محمد خامس چوک پر۔ جب ویٹر کافی لے آیا تو لحسن نے قیمت ادا کرنے پر اصرار کیا۔

''تو جانے پر اب بھی تلے بیٹھے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

عزیز نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

لحسن نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ کیوں یہ ایک احمقانہ حرکت ہے ایک اور تقریر جھاڑ دی لیکن چند ہی منٹوں بعد عزیز نے سننا بند کر دیا۔ وہ دو آدمیوں کو دیکھنے لگا جو سڑک کے پہلو والی ٹیرس پر ایک میز کے گرد آمنے سامنے بیٹھے تھے، ایک دوسرے کی طرف بڑے غور سے جھکے ہوئے تھے، اپنی گفتگو میں غرق تھے۔ وہ جس چیز کے بارے میں باتیں کر رہے تھے ضرور ایسی رہی ہوگی جس نے ان کی ساری توجہ جذب کر لی تھی، کیونکہ وہ اپنی میز کے پاس سے گزرتی ہوئی کالج کی حسیناؤں سے بالکل بے خبر تھے۔ ایک آدمی مسکرایا اور دوسرے کے بازو کے اندرونی حصے کو چھوا، اسے اپنے انگوٹھے سے رگڑنے لگا۔ عزیز نے اپنے اردگرد نظر دوڑائی کہ دیکھے کسی اور نے بھی ہم جنس پرستوں کے اس جوڑے کو تاڑا ہے یا نہیں، لیکن کوئی بھی ان پر توجہ دیتا ہوا نظر نہیں آیا۔

"تم سن رہے ہو؟" لحسن نے پوچھا۔

عزیز نے اپنے دوست کی بھوری آنکھوں میں جھانک کر دیکھا، اور ان تمام وقتوں کی یادیں اچانک ذہن میں چلی آئیں جب ہائی اسکول کے زمانے میں گھر لوٹتے وقت لحسن تقریباً اپنا بازو عزیز کے شانوں پر رکھ دیا کرتا تھا، یا وہ کس طرح ہر اس لڑکی میں جس سے عزیز بے تکلفی سے بات کرتا کوئی نہ کوئی نقص نکال لیتا تھا۔ جب وہ ساحل پر جاتے لحسن کہتا کہ سا کر کھیلنے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا، وہ تو بس ریت پر لیٹنا چاہتا ہے۔ برابر پڑے تولیے تھپتھپاتے ہوئے وہ عزیز سے کہتا کہ اسے آرام کرنا اور دھوپ سے لطف اٹھانا سیکھنا چاہیے۔

"ہاں،" عزیز نے کہا۔ "میں سن رہا ہوں۔"

"لبو نیوز میں اس کی بابت ایک مضمون چھپا تھا، یار۔ ان لوگوں کی تصویریں وغیرہ دی گئی تھیں جو ڈوب گئے تھے۔"

عزیز نے سر ہلا دیا۔ "مجھے ان سب باتوں کا علم ہے۔"

"اور پھر بھی خوف نہیں آتا؟"

"میں بس یہی سوچتا ہوں کہ کام بن جائے گا۔"

"تم پاگل ہو، عمور،" لحسن نے کہا، اپنا سر ہلا کر۔ "اور پیسہ کہاں سے لاؤ گے؟"

"اپنے والد سے،" عزیز نے جواب دیا۔ یہ حرف بہ حرف صحیح نہیں تھا۔ عزیز نے ضروری رقم

کچھ تو زہرہ کو فیکٹری سے جو معمولی سی آمدنی ہوتی تھی اس سے، کچھ ایک عم زاد سے قرض لے کر، اور کچھ پیسہ اس کار کے حادثے کے تصفیے میں سے نکال کر جو اس کے والد کو دو سال پہلے پیش آیا تھا، جمع کی تھی، لیکن وہ اس ڈر سے اس کے بارے میں بتاتا نہیں تھا کہ اوروں کے بھلے کی خاطر اس رقم سے دست کش ہو جانے کے لیے اس کی اور زیادہ منت سماجت ہونے لگے گی۔

''اوہ،'' لحسن نے کہا۔ اس نے اپنی انگلیاں میز پر بجائیں اور کافی کی پیالی کو دور سرکا دیا۔

اپنے دوست کے دلائل کو نظر انداز اور مدد کرنے کی پیشکشوں کو رد کر کے عزیز کو ہمیشہ احساسِ جرم کی ہلکی سی چبھن محسوس ہوتی تھی۔ ''میری فکر نہ کرو،'' وہ بولا۔ ''فکر تو مجھے تمھاری کرنی چاہیے۔''

لحسن نے متعجب ہو کر نظر اُٹھا کر اوپر دیکھا۔ ''میری فکر؟ وہ کیوں؟''

''ایسا ہے...'' عزیز بولا، اچانک ایسے محسوس ہوا جیسے مناسب الفاظ نہ مل رہے ہوں۔ خاموشی کا ایک طویل ثانیہ گزر گیا، اور اس کے بعد اس نے اپنے کندھے اُچکائے۔

چند دنوں کے بعد عزیز لحسن سے ملنے مرکزی ڈاک خانے پہنچا۔ دیکھا کہ ایک پے فون کے پاس کھڑا ایک گاہک — سرمئی وردی اور سفید شانہ زیب میں ملبوس ایک سپاہی — کے لانگ ڈسٹینس پر بات ختم کر لینے کا انتظار کر رہا ہے۔ ''بیٹھو،'' لحسن نے کہا، جیسے یہ عوامی جگہ، جہاں لوگ آ جا رہے تھے، اس کا نجی دفتر ہو۔ عزیز انتظار کرنے والے مقام پر جا کر بیٹھ گیا، اور کتھئی سوٹ میں ملبوس عورت کو ایک کیشیئر سے اپنے ٹیلیفون کے بل میں لگائے گئے غیر واجب داموں کے بارے بے فائدہ بحث کرتے ہوئے اور پھر پیسے وصول کیے بغیر لوٹتے ہوئے دیکھنے لگا۔ ایک بڑے میاں کو، جنھوں نے چیک بھنایا تھا، فوراً ہی باہر سڑک پر آوارہ گرد لونڈوں کے ایک غول نے گھیر لیا اور ان سے ریزگاری مانگنے لگے۔

''کیسے ہو؟'' لحسن نے پلاسٹک کی کرسی پر عزیز کے برابر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ٹھیک ٹھاک،'' عزیز نے جواب میں کہا۔ ''یہ لو۔'' اس نے تائی کون ڈوکا کارڈ لحسن کو تھما دیا جو اسی کے لیے خریدا تھا۔

''کاہے کے لیے ہے؟''

''میری بہن نے مجھے تین ماہ کی رکنیت تحفتاً لے دی تھی،'' عزیز نے بتایا۔ ''میں اب اور اسے

استعمال کہاں کروں گا، سوچا شاید تم کو پسند آئے۔"

"ٹائی کون ڈو؟" لحسن نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں نے کبھی اس کا تجربہ نہیں کیا۔"

"میں نے سوچا شاید تمھیں پسند آئے،" عزیز نے دوبارہ کہا، جیسے محض تکراری سے کوئی بات سچ ثابت ہو سکتی ہو۔ "اور تم نئے دوست بنا سکو۔"

لحسن نے کارڈ ہاتھوں میں گھمایا اور پھر اپنی جیب میں ڈال لیا، سر ہلاتے ہوئے جیسے عزیز کا دل رکھ رہا ہو۔ "اچھا، تو اب چل کر ایک پیالی کافی پینے کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"اور میں یہ بھی لایا ہوں،" عزیز نے کہا اور پلاسٹک کے سیاہ تھیلے سے اپنی چند پوری آستین کی قمیصیں نکالیں۔ اس کا خیال تھا یہ لحسن کے لیے زیادہ بہتر رہیں گی، ان بے آستین کی تنگ، چست بے گلے کی بنیانوں جیسی قمیصوں کے مقابلے میں جو وہ ہمیشہ اپنے بازو کی مچھلیوں کی نمائش کے لیے پہنے رہتا تھا۔

لحسن نے ایک قمیص اُٹھا کر اپنے سینے کے مقابل رکھی۔ "تم چاہتے ہو کہ میں بھی تم جیسا لگنے لگوں؟" اس نے رائے ظاہر کی۔

"سوچا تمھاری کچھ مدد ہی کر دوں، بس،" عزیز نے کہا۔

"یہ شاید میرے ناپ کی نہیں ہیں۔"

"لے تو لو۔"

"نہیں، مجھے صاف نظر آ رہا ہے کہ مجھے نہیں آئیں گی،" لحسن نے قمیصوں کو تہہ کر کے انھیں تھیلے میں واپس رکھتے ہوئے کہا۔ "تم ہی رکھو۔" وہ کھڑا ہو گیا، ایک بھوں سوالیہ انداز میں تنی ہوئی، اس انتظار میں کہ آیا اس کا دوست بات سمجھتا بھی ہے یا نہیں۔

"تم اتنے ضدی کیوں ہو؟" عزیز نے پوچھا۔

"خوب کہی۔"

عزیز نے لمبی سانس کھینچی اور کھڑا ہو گیا۔ "ٹھیک ہے، چلو کافی پئیں۔"

لحسن اسی کیفے میں جانا چاہتا تھا جہاں وہ پہلے گئے تھے، مدینے کے قریب، لیکن عزیز نے عین السبع جانے کے لیے اصرار کیا۔ "کیوں؟ وہ تو بالکل ویران ہے،" لحسن نے شکوہ کیا۔ عزیز نے کہا کہ وہ

زہرہ سے جب وہ سوڈا فیکٹری سے کام ختم کر کے نکلے گی ملنا چاہتا ہے، لیکن اس بات کا کوئی ذکر نہیں کیا کہ زہرہ کو اپنی کسی سہیلی کو ساتھ کیفے لے آنے کی تاکید بھی کر رکھی ہے؛ وہ چاہتا تھا کہ یہ ایک بالکل اتفاقی واقعہ نظر آئے۔

اس بار کافی کی قیمت ادا کرنے پر عزیز نے اصرار کیا۔ خوب دھوپ نکلی ہوئی تھی، سو وہ باہر ہی بیٹھے۔ راہ گیر تو بس چند ہی تھے، لیکن سواریوں کی آمد و رفت کافی تھی، چنانچہ وقت گزاری کے لیے بیٹھے فراٹیسی اور جرمن کاروں کو تکتے رہے جو سبز بتی کے انتظار میں کھڑی ہوئی تھیں، دریں اثنا ڈرائیور اپنے موبائل فونوں پر محوِ گفتگو رہے اور ان کے اسٹیریو پر امریکی موسیقی چنگھاڑتی رہی۔ عزیز نے چشم خیال میں اپنے کو ایک دن اسی انداز میں دیکھا، اس کے پاس اپنی کار ہوگی اور جانے کے لیے کوئی جگہ، کسی کیفے میں بیٹھ کر وقت ضائع کرنے کے بجائے، جب کہ اس کی بیوی کام پر گئی ہو۔

جلد ہی عزیز کو زہرہ سڑک پر آتی نظر آئی، اپنی دوست کی بانہوں میں بانہیں ڈالے، ایک دراز قامت عورت جس نے زرد رنگ کا جلابہ اوڑھا ہوا تھا جس کے باعث اس کی جلد قدرے سیاہ نظر آ رہی تھی، بھنے ہوئے بادامنوں کے رنگ کی۔ اس کے بال لمبے اور بھورے تھے، اور آنکھیں جو بے فکری سے جگمگا رہی تھیں۔ انھوں نے کرسیاں نکال کر عورتوں کو پیش کیں، اور زہرہ نے اپنی دوست کا ملکہ کہہ کر تعارف کرایا۔ زہرہ کی سرمئی بھوری آنکھیں دوپہر کی روشنی میں بڑی دلکش لگ رہی تھیں، لیکن عزیز نے اپنے کو ملکہ کی جانب متوجہ ہونے پر مجبور کیا، زیرِ غور معاملے کی خاطر۔ ''تو تم زہرہ کے ساتھ کام کرتی ہو؟'' وہ بولا۔

''ہاں،'' ملکہ نے جواب دیا۔ وہ مسکرائی، جس سے اس کے سامنے کے دانتوں کا درمیانی رخنہ نظر آنے لگا۔

''تمھیں وہاں کام کرنا پسند ہے؟'' عزیز نے دریافت کیا۔

''بس، میرے خیال میں تو ٹھیک ہے،'' وہ بولی، اور زہرہ کی طرف دیکھنے کے لیے مڑی، جیسے اس سے ان دونوں کے بے کیف کام کی تصدیق چاہتی ہو۔

''یہ اچھا کام کرتی ہے،'' زہرہ نے کہا۔ ''یہ کناروں کا معائنہ میرے مقابلے میں کہیں زیادہ تیزی سے کرتی ہے۔'' ان کے مشروب آئے، اور اس بار پھر قیمت ادا کرنے پر عزیز نے اصرار کیا۔

لحسن نے ابھی تک ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا، حقیقت یہ ہے کہ وہ چوری چھپے انگلی سے ناک کریدنے لگا تھا۔ عزیز نے اسے ٹہوکا مارا کہ یہ حرکت بند کرے۔ ''تم یہیں کہیں قریب رہتی ہو؟''

''نہیں۔ میں درب غنوئی میں رہتی ہوں،'' ملکہ نے نارنگی کے عرق کی چسکی لیتے ہوئے بتایا۔

''میرا دوست درب تکیان میں رہتا ہے — پھر تو یہ بہت زیادہ دور نہیں،'' عزیز نے کہا۔ اس نے مڑ کر لحسن کی طرف دیکھا، اور واضح کر دیا کہ وہ اس کے کچھ کہنے کا منتظر ہے، لیکن لحسن اپنی کافی کی دوسری پیالی میں شکر ہلاتا رہا اور ایک ہی گھونٹ میں اسے پی گیا۔

کوئی امید نہیں کی جا سکتی، عزیز نے سوچا۔ اس کے باوجود اسے محسوس ہوا کہ اسے ایک بار اور کوشش کر دیکھنی چاہیے۔ ''یاسین مجھے ابھی ایک نئی مصری فلم کے بارے میں بتا رہا تھا جو اسٹار سینما میں لگی ہے۔''

ملکہ نے لحسن کی طرف دیکھا، جیسے اس کے کچھ کہنے کا انتظار کر رہی ہو، لیکن اس کے بجائے اس نے ایک اور سگریٹ نکال کر جلالی۔ ملکہ نے اپنا عرق ختم کیا، اسٹرا کو اپنی انگلیوں میں مروڑا۔ ایک لمبی، ناگوار خاموشی طاری ہو گئی، جس کے بعد زہرہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور بولی کہ اب انھیں چلنا چاہیے۔

''تو، کیا خیال ہے تمھارا؟'' عزیز نے پوچھا۔

''کاہے کے بارے میں؟''

''ملکہ کے بارے میں، ظاہر ہے۔''

لحسن نے شانے اُچکائے۔

''میرے خیال میں تو بڑی پیاری سی ہے،'' عزیز نے کہا۔ ''اور...'' اس نے ایسے اشارہ کیا جیسے ہاتھوں میں خربوزے تول رہا ہو۔

لحسن ہنس پڑا۔ اس نے ایش ٹرے میں سگریٹ بجھایا۔ ''میرے قیاس کی نہیں ہے،'' وہ بولا۔

''خیر، اگر تم اپنا قیاس بتا دو تو ہو سکتا ہے کوئی ڈھونڈ ڈھانڈ کر بھڑا دیں۔''

''تمھیں نہیں معلوم؟'' اس نے یکبارگی آواز بلند کرتے ہوئے پوچھا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ کوئی بھڑوا ہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے،'' عزیز نے کہا۔

وہ اپنی کرسیوں پر کاہلی سے ٹکے رہے، افق پر سورج کو غروب ہوتا دیکھتے رہے، آسمان ایسے رنگ بدل رہا تھا جنھیں کاسابلانکا کی فضا میں پھیلے آلائشی دھویں کی تہوں نے اور بھی شاندار بنا دیا تھا۔

''تائی کون ڈوکا کیا ہوگا؟'' عزیز نے کہا۔ ''تم تجربہ کرو گے؟''

''اب ہمیں چلنا چاہیے،'' لحسن نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''دیکھو، مجھے افسوس ہے۔'' عزیز نے اپنے دوست کا بازو پکڑ لیا۔ ''براہِ مہربانی بیٹھ جاؤ۔''

لحسن نے نشست سنبھالی، بادلِ ناخواستہ۔

''تم کیا کرو گے؟'' عزیز نے پوچھا۔

لحسن نے شانے اُچکائے۔ ''کچھ نہیں۔''

ویٹریس کی بتیاں روشن کرنے باہر نکل آئے تھے۔ رفتہ رفتہ، مچھر قمقموں کے گرد اکٹھے ہونے لگے اور ایسا رقص شروع کیا جس کی دلکشی کو دبانا آسان نہیں تھا۔

''اگر تمھارے والدین کو پتا چل گیا تو؟''

''انھیں پہلے سے پتا ہے۔''

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے واپس بس اسٹاپ پہنچے۔

اپنی روانگی کی صبح عزیز الارم کلاک بجنے سے پہلے ہی بیدار ہو گیا۔ زہرہ پہلے سے جگی ہوئی تھی۔ وہ بستر پر اپنے والے پہلو گھٹنوں کے گرد بانہیں ڈالے بیٹھی تھی۔ ''تم واپس آؤ گے نا،'' وہ بولی، اور وہ اس کے لہجے سے یہ نہیں معلوم کر سکا کہ یہ سوال تھا یا بیان۔

''انشاءاللہ۔''

اس نے اپنا سر ہاتھوں میں گر جانے دیا اور ایک سسکی کو دبا دیا۔ اس نے زہرہ کو اپنی بانہوں میں بھر لیا اور اس وقت تک ہم آغوش رہا جب تک اس کا رونا فرو نہیں ہوا۔ اگر اس لمحے اس نے اس سے نہ جانے کے لیے کہا ہوتا، تو عزیز میں نا کہنے کی سکت نہ ہوتی۔ ایک بار پھر، وہ بہادر ثابت ہو رہی تھی، تیزی سے اپنا چہرہ خشک کر رہی تھی اور اس سے پوچھ رہی تھی کہ کیا وہ تیار ہے۔

جب عزیز اپنے والدین کے ساتھ آخری بار ناشتہ کرنے بیٹھا تو اس نے جس قدر بھی ممکن ہو

سکا ہر حسی کیفیت کو حافظے میں محفوظ کرنے کی کوشش کی — گیہوں کی روٹی کا ذائقہ، دم پر آتی ہوئی پودینے کی چائے کی مہک، اپنے نیچے دیوان کا لمس، اپنے باپ کی انگلیوں میں پھرتے ہوئے تسبیح کے دانوں کی آواز۔ اسے معلوم تھا کہ آنے والے مہینوں میں زندہ رہنے کے لیے اسے ان میں سے ہر ایک کی ضرورت ہوگی۔ اس کے باوجود کوئی چیز ایسی بھی تھی جو اس ذہنی فہرست سے غائب تھی، چنانچہ وہ اٹھا اور زہرہ سے بولا کہ وہ صرف چند منٹ کے لیے باہر جا رہا ہے۔ وہ دوڑتا ہوا لحسن کے گھر پہنچا تاکہ اسے کام پر جانے سے پہلے جا پکڑے۔ لحسن نے دروازہ کھولا، جسم پر قمیص ندارد اور صرف شب خوابی کا پاجامہ پہنے۔ ''میں جا رہا ہوں،'' عزیز نے کہا۔ اس نے لحسن کو گلے لگا لیا، اور اس کی پیٹھ پر بڑے بڑے بے ہنگم دھپ مارنے لگا جیسے کہ وہ جانتا تھا مردوں کو کرنا چاہیے۔ اور پھر وہ علیحدہ ہو گیا۔

*

کل قسمت اچھی ہوگی

جب دوپہر کی فیری بوٹ نے سیاحوں کو طنجہ میں اُتارا، تو گائیڈ ان پر ٹوٹ پڑے۔ وہ ایک مسافر سے دوسرے کی طرف لپکتے، مدینوں اور عجائب گھروں، محلوں اور بازاروں کی سیر کرانے کی پیشکش کرتے۔ لیکن مراد اور یسی کا طریق کار دوسرا تھا۔ اس کا فقرہ یہ تھا ''آپ کو پال بولز سے دلچسپی ہے؟'' اور یہ تدبیر ہمیشہ کارگر ثابت ہوتی، خاص طور پر ہپی ٹائپ لوگوں پر۔ ہر چند کہ اس ادیب کا انتقال چند ماہ پہلے ہو چکا تھا، مراد سیاحوں کو اب بھی وہ گھر دکھانے لے جا سکتا تھا جہاں اس کا قیام رہا تھا، وہ کیفے جن میں وہ جایا کرتا تھا، وہ جگہیں جہاں وہ اپنی ''کیف'' خریدتا تھا۔ لیکن ان دنوں سیاحوں کے مقابلے میں گائیڈوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تھی اور مراد کو کام کم ہی ملتا تھا۔

وہ ہسپانیہ کی فیری سے اُترنے والے مسافروں کو دیکھتا رہا، اس سے قبل کہ اس نے اپنی نظریں ایک جوڑے پر جمائیں۔ عورت ٹی شرٹ اور کارگو پینٹس پہنے ہوئے تھی؛ اس کا ساتھی جینز، بال کیپ اور سبز ٹینکر میں تھا۔ پشتی تھیلوں کی وجہ سے ان کی چال کچھ آگے کو جھکی جھکی سی نظر آ رہی تھی، لیکن وہ

عرشے پر خاصی پھرتی سے چل رہے تھے۔ وہ عمر میں تیس سے کچھ کم نظر آتے تھے، اور یہ عمر اس دائرے میں نہیں آتی تھی جسے مراد اپنے فقرے کے استعمال کے لیے ترجیح دیتا تھا۔ اس کا اثر عمر رسیدہ لوگوں پر زیادہ ہوتا تھا۔ تاہم اس نے قیاس کیا کہ یہ یا برٹش ہوں گے یا امریکی، اور پال بولز سے آشنا ہوں گے، اور پھر کام دھندے کی ان دنوں جو حالت تھی، اُس کو دیکھتے ہوئے وہ زیادہ نخرے نہیں دکھا سکتا تھا۔

جب وہ ان کے قریب پہنچا تو انھوں نے نظریں چار کرنے سے اجتناب کیا، لیکن اس نے مسکراتے ہوئے میٹھے سجاؤ کے ساتھ اپنا فقرہ دہرا دیا۔ ''آپ کو پال بولز سے دلچسپی ہے؟'' تعجب کے زود گزر تاثر سے ان کے چہرے چمکے، لیکن وہ ایک طرف ہو گئے۔ وحشت تیرے کی۔ شاید امریکی نہیں تھے۔ "Hablan espanol?" مراد نے پوچھا۔ جواب ندارد۔ ایک اور گائیڈ مراد اور ان دونوں کے بیچ میں گھس آیا۔ "Sprechen Sie Deutsch?" اس نے پوچھا۔ مراد نے آدمی کو تیز نظر سے دیکھا، جیسے کہہ رہا ہو، میری نظر ان پر پہلے پڑی تھی، ان سے دور ہو۔ جوڑا قدم بڑھاتا ہوا نکل چلا، چنانچہ مراد نے ان کا تعاقب کیا۔ عورت کے پشتی تھیلے کی جالی دار جیب میں مراد کو ایک کتاب نظر آئی۔ اس نے اپنی گردن آگے کو ترچھی نکال کر کتاب کا نام پڑھنے کی کوشش کی Backpacking in Morocco۔ تو اس کا خیال ٹھیک نکلا، شاید یہ لوگ انگلوز ہیں۔

سالوں پہلے، جب وہ ابھی انگریزی میں بیچلر کی ڈگری کی تعلیم حاصل کر رہا تھا، تو زنقہ ابن معذ میں امریکن لینگویج سینٹر جاتا تھا اور وہاں لائبریری میں بیٹھ کر جتنی کتابیں بھی ہتھے چڑھتیں پڑھ ڈالتا۔ سے کتابیں پڑھنے کا شوق تھا، اپنی انگلیوں کے پوروں کے نیچے کاغذ کے لمس سے عشق تھا، جس طرح الفاظ اس کی زبان سے پھسل کر نکلتے تھے، کس طرح وہ اسے اپنی ذات کے بارے میں ان چیزوں کی دریافت کراتے جن سے وہ لاعلم تھا۔

فیری کے ٹرمینل کے داخلے کے پاس مراد نے جوڑے کو بالآخر جا لیا۔ اس نے ارادہ کیا کہ یہ الفاظ بولتے وقت اس کی آواز میں اعتماد کی گونج ہوگی۔ ''میرا نام مراد ہے۔ مراکش میں خوش آمدید! آپ پال بولز کی قیام گاہ کی زیارت پسند فرمائیں گے؟''

''نہیں، شکریہ،'' عورت نے کہا۔

کم از کم جواب تو ملا۔ اب بھی امید کی جا سکتی ہے۔ تو گویا انھیں پال بولز سے دلچسپی نہیں۔ خیر، خود مراد کو کب دلچسپی تھی۔ "آپ یار براہٹن کا محل دیکھنا چاہیں گے؟" اس نے دریافت کیا۔

"یہ کس کا ذکر کر رہا ہے؟" مرد نے پوچھا۔ ان کے لہجے سے مراد تاڑ گیا کہ امریکی ہیں، برٹش نہیں، جیسا کہ اس نے گمان کیا تھا۔

"ڈول ورتھ کی وارث، جیک،" عورت نے کہا۔

مراد کو احساس ہوا کہ ان کے بارے میں اس سے غلطی ہوئی ہے۔ انھیں انیس سو ساٹھ کی دہائی کے طبقے سے دلچسپی نہیں تھی، چنانچہ اسے کچھ اور سوچنا ہوگا۔ ان کے پشتی تھیلوں سے اشارہ پا کر اس نے ایک کوشش اور کر ڈالی۔ "ہرکلیز کے غار دیکھو گے، جیک؟ بے حد خوش منظر ہیں۔"

جیک اتنے اچانک طور پر گھوما کہ مراد اس سے ٹکرا گیا۔ "دیکھو، مجھے افسوس ہے،" وہ بولا۔ "ہمیں گائیڈ کی ضرورت نہیں۔ بہرکیف شکریہ۔"

جس مہارت اور پھرتی سے وہ بندرگاہ کے ملازمین، مصروف راہ گیروں، اور بے شمار گائیڈوں اور پھیری والوں کے ہجوم میں اپنا راستہ بناتے چلے جا رہے تھے اس سے مراد کافی متاثر ہوا۔ اب وہ بتی کے پاس تھے، جہاں بس کا اڈہ تھا، اور سڑک کے پار ٹیکسیوں کی قطاریں۔ وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ وہ ان کے برابر کھڑا تھا، ان کی آنکھوں میں گھور رہا تھا جب کہ وہ ٹھیک اپنے سامنے دیکھ رہے تھے۔ "میں آپ کو مدینے کا دورہ کرا سکتا ہوں،" وہ بولا۔ جوڑا اسے نظرانداز کیے گیا۔ "ہوٹل میں کمرہ چاہیے؟ مجھے ایک جگہ کا پتا ہے جہاں آپ کو مناسب قیمت پر کمرہ مل سکتا ہے۔" ہنوز کوئی جواب نہیں ملا۔ شدید مایوسی کے عالم میں اس نے سرگوشی میں کہا، "حشیش چاہیے؟" دھوئیں کے کالے بادل اڑاتی ہوئی، زناٹے کے ساتھ گزرتی ہوئی کاروں کے شور میں اس کی آواز ڈوب کر رہ گئی۔

اسے یقین نہیں تھا کہ انھیں اس کی بات سنائی دی ہوگی، لیکن جب بتی بدلی، تو عورت کی چال میں ہلکی سی ہچکچاہٹ آ گئی۔ اس نے پہلی بار مڑ کر مراد کو دیکھا۔ اس وقت جیک نے اس کی کہنی پکڑ لی۔ "آ کیلین،" اس نے کہا۔ وہ چوڑی پیشانی اور بے حد صاف رنگ کی عورت تھی، لیکن یہ اس کی شفاف نیلگوں آنکھیں تھیں جو مراد کی نظر میں کھب گئیں۔ ان میں کوئی چیز ایسی تھی جس وہ پہچان گیا۔ دستبرداری کی کیفیت، شاید۔

Scanned with CamScanner

اب وہ چھوٹی ٹیکسیوں کے اڈے کے پاس پہنچ گئے تھے۔ "اچھی قیمت پر دلوا سکتا ہوں،" مراد نے کہا، اس کی آواز جتنا وہ چاہتا تھا اس سے زیادہ بلند تھی، اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں منت سماجت کا رنگ آ گیا تھا۔ اس کے پاس تو کسی قسم کی منشیات نہیں تھیں، لیکن اگر وہ ہاں کر دیتے تو خورد فروش سے اسے اپنے لیے بھی تھوڑا بہت منافع مل سکتا تھا۔ اور اگر وہ ہاں کر دیتے تو وہ چالیس درہم کے لگ بھگ کما سکتا تھا، جن سے دو تین دن کے سودے سلف کا بندوبست ہو سکتا تھا۔ جیک کی گرفت بڑے محسوس طور پر آئلین کی کہنی پر مضبوط ہو گئی جب وہ اس کی قیادت کرتا ہوا ایک ٹیکسی تک لایا اور اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔ مراد نے ایک گہرا سانس لیا۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔

وہ مڑا اور عرشے کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے وہاں لوٹ جانے کا خیال آیا، لیکن اب تک سارے سیاح جا چکے ہوں گے۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا راستے میں پڑے کنکروں کو ٹھوکر مارتے ہوئے باب البحر کی طرف چلنے لگا۔ اس کے جوتے کا تلا ڈھیلا پڑ گیا۔ کوسنوں کا طومار منہ سے نکالتے ہوئے، اس نے اپنے پیر کے گول حصے کو اور زیادہ زور سے زمین پر دبایا تا کہ ڈھیل پڑے ربڑ کو چھپا سکے۔ جب وہ بڑی مسجد کے پاس سے گزرا، تو موذن کو عصر کی اذان دیتے ہوئے سنا۔ آج اور مسافر کشتیاں نہیں آئیں گی۔

بادلِ ناخواستہ مراد گھر کی طرف چل دیا۔ اس تمام عرصے وہ خالی ہاتھ ہی گھر لوٹتا تھا، اور آج کا دن مختلف نہیں تھا۔ کچھ دیر تک وہ تنگ گلیوں میں گھومتا پھرا یہاں تک کہ اپنی اپارٹمنٹ بلڈنگ کے سامنے پہنچ گیا۔ وہ کسی ایسے آدمی کی رفتار کے ساتھ جو فائرنگ اسکواڈ کے سامنے جا رہا ہو سیڑھیاں چڑھتا ہوا سب سے اوپر کی منزل پر پہنچا۔ لینڈنگ سے اسے مصری سوپ اوپرا کی جاذبِ توجہ شناختی دھن سنائی دی۔ وہ اپارٹمنٹ کے آہنی دروازے کے سہارے جھکا اور اپنے کو اندر داخل کر دیا۔ استری کی گرم، مرطوب مہک نے اس کے نتھنوں میں گدگدی سی کی اور اسے چھینک آ گئی۔ اس کی ماں نے استری کے تختے سے سر اُٹھا کر اوپر دیکھا، جس پر وہ اس کی بہن کی کام پر جانے کی قمیصوں پر استری کر رہی تھی۔ اس کے عقب میں ملاقاتی کمرے کی واحد کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور صاف آسمان کے نیچے اینٹینوں اور سیٹلائٹ ڈشوں کے ایک قطعے کو ظاہر کر رہی تھی۔ اس نے ماں کے ہاتھ کی پشت کو بوسہ

دیا۔

"اللہ تم سے خوش رہے" وہ بولی۔

اس نے اپنا جلاّب جدا کیا جسے وہ سیاحوں سے ملتے وقت استعمال کرتا تھا۔ اب وہ اپنی پرنی جینز اور سفید ٹی شرٹ میں نظر آ رہا تھا۔ وہ ماں کے پاس ہی بیٹھ گیا، ہتھیلیاں دیوان کے گھسے ہوئے مخملیں غلاف پر سپاٹ رکھ دیں اور ایک لمبی سانس بھری۔

"دن کیسا گزرا؟" ماں نے پوچھا۔

"دھندا کافی مندا رہا" اس نے نظریں پھرا کر جواب دیا۔

"کل قسمت اچھی ہوگی۔"

وہ ہر روز یہی کہتی ہے، مراد نے سوچا، لیکن اس کی قسمت بہتر ہوتی نظر نہیں آ رہی۔ اس نے اپنی آنکھوں کو ٹی وی پر مرکوز کر دیا جہاں ایک سانولے رنگ کا خوبرو آدمی ایک فربہ لڑکی کو، جس نے آنکھوں پر خوب بناؤ سنگار کر رکھا تھا، رجھا رہا تھا، اس سے وعدہ کر رہا تھا کہ نوکری ملتے ہی اور جہیز کے لیے مناسب رقم بچاتے ہی اس کے والدین سے بات کرے گا۔ مراد نے جوتا اُتارا اور تلے کا جائزہ لینے لگا۔ "کیا جوتے چپکانے کا سریش باقی ہے؟" اس نے دریافت کیا۔

"الماری میں رکھا ہے۔"

مراد اپارٹمنٹ کی واحد خواب گاہ میں گیا جہاں اس کی ماں اور بہن، لامیہ، رات کو سوتی تھیں۔ وہ اور اس کا چھوٹا بھائی، خالد، ملاقات کے کمرے میں دیوان ہی پر رات بسر کرتے تھے۔ یہ اچھی قسمت تھی کہ ٹھیک جب اس خاندان کو یہ اپارٹمنٹ ملا تھا، مراد کے والد کے انتقال کے چند ماہ بعد ہی، تو درمیانی دونوں توام بچوں عبدالصمد اور عبدالستار کو وظیفہ مل گیا تھا اور انھوں نے رباط میں میڈیکل اسکول میں پڑھنا شروع کر دیا تھا، ورنہ یہاں مزید دو افراد کی گنجائش نکلنا ناممکن ہوتا۔ اس نے سریش الماری سے نکالا اور اس کے ناہموار دروازوں کو بند کرنے کی پروا کیے بغیر ملاقاتی کمرے میں لوٹ آیا اور جوتے کی مرمت میں لگ گیا۔

"لامیہ کہاں ہے؟"

"کام پر گئی ہوئی ہے۔"

مراد کی بہن لامیہ شہر کے تجارتی علاقے میں برآمد و درآمد کرنے والی ایک فرم میں ریسپشنسٹ تھی۔ اس نے تلخی سے یاد کیا کہ ایسی ہی ایک ملازمت کے لیے خود اسے رد کر دیا گیا تھا کیونکہ وہاں ایک عورت کو رکھنا چاہتے تھے۔ "اس وقت تک اسے گھر واپس نہیں آجانا چاہیے تھا؟" اس نے پوچھا۔

اس کی ماں نے اسے نظرانداز کر دیا اور قمیصیں ٹی وی سیٹ پر جمائے استری کرتی رہی۔

"اور خالد، وہ کہاں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"اسکول میں۔" مراد کی ماں نے گرم گرم استری پھیرنے سے پہلے اپنی انگلیاں پانی کے پیالے میں ڈبوئیں اور ایک قمیص کی آستین پر چھڑکاؤ کیا۔ "آخر یہ سب سوال کیوں ہو رہے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"کوئی وجہ نہیں۔" اس نے ریش کی بوتل کا ڈھکنا بڑی احتیاط سے بند کیا، پھر جوتے کو کافی کی میز کے ایک پائے کے نیچے خشک ہو جانے کے لیے دبا دیا۔

ماں نے کام پر جانے کی قمیصوں پر استری کرنا ختم کیا، انھیں تار کے ہینگروں پر لٹکایا، اور لے کر چل دی۔ جب لوٹی تو اس کے برابر آ کر خاموشی سے بیٹھ گئی۔ "کوئی آج تمھاری بہن کا پیغام لے کر آیا تھا۔"

"کون؟"

"جہاں وہ کام کرتی ہے، وہیں کا ایک ہم کار۔ وہ تمھارے چچا سے اور مجھ سے بات کرنے آیا تھا۔"

"چچا سے؟" اس سکی پر مراد کو اپنا چہرہ لال ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

"ہاں، بالکل۔" ماں نے کہا۔

"مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

"اب بتا رہی ہوں۔"

اس نے اپنا ہاتھ میز پر پٹخا اور کھڑا ہو گیا۔ "اس خاندان کا سربراہ میں ہوں۔" اس نے کہا۔ اس کے والد کو مرے ہوئے تین سال ہو گئے تھے، ایسے حادثے میں کہ ٹکر مارنے والا جائے واردات سے فرار ہو گیا تھا۔ وہ کیفے سے جہاں چائے پیتا تھا، کہانیاں سناتا تھا، اور ہر شام اپنے ساتھیوں کے

ساتھ شطرنج کھیلتا تھا، واپس آ رہا تھا کہ ایک سرخ رینو کار کے ڈرائیور نے ایک فیاٹ کار سے آگے نکلنے کی کوشش کی، سڑک سے اتر پڑا، اور اسے ٹکر مار دی۔

''منگنی کی باقاعدہ رسم ادا کی جائے گی اور تم اس میں موجود ہو گے۔ خدا کرے کہ تمہارا موقع آنے پر ہمیں خوشی منانا نصیب ہو۔''

مراد کو تعجب ہوا کہ اس کی ماں یہ سب اتنی بے فکری سے کیسے کہہ سکتی ہے جبکہ اسے خوب معلوم ہے کہ بلا ملازمت کے اس کا موقع جلد آنے کا کوئی امکان نہیں۔ ''کم از کم مجھے اطلاع تو دی جانی چاہیے تھی،'' اس نے چلا کر کہا۔

''میرے سامنے اپنی آوازمت اٹھاؤ۔ کیا تم شادی کا خرچہ برداشت کر رہے ہو؟''

''میرے پاس نوکری نہیں تو تم سمجھتی ہو کہ میں نظر ہی نہیں آتا؟ میں اس کا بڑا بھائی ہوں۔ تمھیں چاہیے تھا کہ مجھ سے پہلے بات کرتیں۔''

مراد واپس دیوان پر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں ٹی وی پر تھیں لیکن اس کا ذہن ادھر اُدھر بھٹک رہا تھا۔ لامیہ کی زندگی آگے بڑھ رہی تھی — اس کے پاس ملازمت تھی، اور اب شادی بھی ہونے والی تھی۔ جڑواں بچے ہنوز میڈیکل اسکول میں تھے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ایک شاندار مستقبل ان کا منتظر تھا۔ ڈاکٹروں کو اب بھی کام مل جاتا تھا۔ اور وہ؟ اس نے خود کو کوسا۔ اس کے ساتھ کیا خرابی تھی؟ کاش اس نے کالج جا کر انگریزی پڑھنے کی فکر نہ کی ہوتی، ایک زبان اور اس کا ادب پڑھنے میں وقت نہ لگایا ہوتا۔ آخر کون ان چیزوں کی پروا کرتا ہے۔ شروع میں، جب وہ ابھی ابھی فارغ التحصیل ہوا تھا، اخباروں میں اشتہاروں کی چھان بین کیا کرتا تھا، اور لمبی لمبی اعتماد سے بھرپور عرضیاں لکھی تھیں؛ لیکن جوں جوں ماہ اور، بعد میں، سال رینگ رینگ کر گزرتے گئے، وہ جو کام بھی ہاتھ آتا، عارضی یا موسمی، کر لیتا تھا۔ اب پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے اس نے سوچا کہ اسمگلروں کے ساتھ مل کر کام کیوں نہیں کیا، سبتہ سے ٹیکس فری مال لاتا، یونیورسٹی میں اپنا وقت ضائع کرنے کے بجائے۔

جھٹ پٹے کے وقت، مراد سوکو چیکو کی طرف چلا۔ النجاہ کی عمارت سے کنی کترا کر چلنے کی خاطر، جہاں چھ سالوں میں، جب سے اس نے کالج ختم کیا تھا، اس کا واحد امید افزا انٹرویو ہوا تھا،

اس نے ایک چھوٹا سا چکر کاٹا۔ اس میں اضافی پانچ منٹ لگے اور سے ایک تنگ سی سڑک سے گزرنا پڑا جہاں ایک ٹوٹے ہوئے جو بچے کے پاس مٹیالے پانی کی تمیا سی بن گئی تھی، تاہم یہ اس سے بہتر تھا کہ اس کا سامنا کام سے لوٹتے ہوئے ملازمین سے ہو۔

سات بجے کے قریب وہ کیفے لالیبرتے پہنچا اور ایک پیالی کافی کا آڈر دیا۔ وہ خوب گاڑھی تھی اور ذائقے میں ڈامر جیسی۔ اس نے اس کے مزاج کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ اس کے اردگرد دستار پوش بوڑھے بغیر فلٹر والے سگریٹ پھونک رہے تھے اور ننگے سر والے نوجوان تاش کھیل رہے تھے۔ کیفے کی دور پرے والی دیوار پر لگے ٹی وی پر فٹ بال کا کوئی میچ دکھایا جا رہا تھا— ''ریل میڈرڈ'' کی ٹیم بارسونا کے خلاف کھیل رہی تھی۔ مراد نے اسے دلچسپی کے ساتھ دیکھا، چنانچہ اس کی نظر رحال پر نہ پڑ سکی جب تک وہ ایک میز کے پاس نہ بیٹھ گیا۔ رحال مراد کی طرف دیکھ کر مسکرایا، مسکراہٹ جو اس کی بڑی بڑی آنکھوں کی وجہ سے جو ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھیں، اور اس کے گنجے سر کے باعث، کسی سانپ سے مشابہ لگ رہی تھی۔ مراد نے سر ہلا دیا لیکن میچ دیکھتا رہا۔

رحال نے پودینے والی چائے منگوائی، پھر اسے پیالی میں اُنڈیلا، چائے دانی کو آہستہ آہستہ اوپر اٹھاتے ہوئے تاکہ گلاس میں خوب جھاگ پیدا ہو جائے، پھر وہ ایک نیلے ٹائلوں والی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ''پچھلے ہفتے جو گفتگو ہم نے کی تھی، تم نے اس کے بارے میں غور کیا؟'' رحال ادھر مراد کو پھنسنے کی کوشش کر رہا تھا، تاکہ اُن میں کی کسی کشتی پر سوار ہو کر ہسپانیہ چلا جائے، اور مراد دو بار اس سے کہہ چکا تھا کہ اسے اس میں دلچسپی نہیں۔ لیکن یہ آدمی اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔

مراد نے اپنا سر ہلا دیا۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ یہ اچھا خیال ہے۔''

رحال طشتری پر چینی کے ڈلے سے کھیلنے لگا۔ وہ اسے اپنی انگلیوں میں لے کر گول گول گھمانے لگا۔ ''یہ بتاؤ، اس مہینے تم نے کتنے پیسے کمائے؟''

''یہ کاروبار کے لیے مندا موسم ہے۔ گرمی میں کاروبار چمک جائے گا۔''

رحال مسکرایا۔ ''تم ساری عمر گائیڈ نہیں بنے رہو گے۔ تم کبھی اس پر اپنی گزر اوقات نہیں کر سکو گے۔''

Scanned with CamScanner

مراد نے کافی کی چسکی لی اور میچ دیکھتا رہا۔ ''زبردست کِک تھا،'' وہ پردے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''بارسلونا جیت جائے گا۔''

رحال نے ٹی وی کی طرف نہیں دیکھا۔ ''ہسپانیہ میں،'' وہ بولا، ''تم جیسے کو پلک جھپکتے میں نوکری مل جائے گی۔''

''خدا جانے،'' مراد نے کہا۔

''دیکھو، میں عام طور پر ایسی بات نہیں کہتا، لیکن میں صاف دیکھ سکتا ہوں۔ میں فوراً دیکھ سکتا ہوں کہ کوئی کامیاب ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اور تم ضرور کامیاب ہو گے۔ تم دوسروں جیسے نہیں۔''

مراد دانت نکال کر ہنس دیا۔ کیا رحال سوچتا ہے کہ وہ اس پر یقین کر لے گا؟

''تمھاری مرضی،'' رحال بولا۔ ''جاؤ، گائیڈ بنے رہو۔ ہو سکتا ہے دس سال میں اتنا بچا لو کہ ماں کے گھر سے نکل سکو۔''

مراد نے نظریں جھکا لیں۔ اس کی پیالی میں زرد سا جھاگ رفتہ رفتہ سیاہ کافی میں تحلیل ہو گیا۔

''کتنا لگے گا؟'' اس نے پوچھا۔

''بیس ہزار درہم۔''

مراد یک بیک کھڑا ہو گیا۔ رحال نے اس کی کلائی دبوچ لی اور اس سے دوبارہ بیٹھ جانے کے لیے کہا۔ ''اگر میں پکڑا گیا تو حوالات بھیج دیا جاؤں گا،'' رحال نے سرگوشی میں کہا۔

مراد اس کی طرف دیکھ کر پھنکارا۔ رحال کو حوالات سے بھلا کیا خوف آئے گا؟ ماضی میں وہ منشیات بیچ چکا ہے، اب لوگوں کو غیر قانونی طور پر ہسپانیہ لے جاتا ہے کیونکہ یہ زیادہ منافع بخش ہے۔ پندرہ سال پہلے رحال کا باس ایک معمولی سا سمگلر تھا، اور آج، آج اُن کشتیوں کی ایک پوری قطار کا مالک ہے اور رحال جیسے کتنوں کو اسمگلنگ کے لیے ملازم رکھا ہوا ہے۔

''اور میرا کیا ہو گا؟'' انگوٹھے سے اپنے سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مراد نے پوچھا۔

''بھلا تم کیوں جیل جانے لگے؟''

''میرے پاس بیس ہزار نہیں۔''

''تمھارے گھر والوں کے پاس نہیں ہوں گے؟''

"میرے باپ کا انتقال ہو چکا ہے، خدا اس پر اپنی رحمت کرے۔ میری ماں کے پاس کوئی روپیہ پیسہ نہیں۔ چچا اور بہن کا بھلا ہو، ورنہ ہم سڑکوں پر مارے مارے پھر رہے ہوتے۔"

"کیا یہ تمھیں پیسے ادھار نہیں دے سکتے؟"

"اتنی بڑی رقم نہیں دے سکتے۔"

"یہ بڑی مناسب قیمت ہے،" رحال بولا۔ "ہمیں کبھی کسی مشکل کا سامنا نہیں ہوا ہے۔"

"مجھے صرف آٹھ ہزار مل سکتے ہیں،" مراد نے کہا، حالانکہ وہ اسی اُدھیڑ بن میں تھا کہ چچا اور بہن کو اتنی رقم بھی قرض دینے پر کیسے آمادہ کر سکے گا۔

رحال نے دبی دبی سی ہنسی کی آواز نکالی۔ "یہ کوئی کھیل نہیں۔ ہم بڑے خطرات مول لے رہے ہیں۔" اس نے اپنا گلاس دوبارہ چائے سے بھرا۔ "ہمارے پاس مدد لائف بوٹس ہیں، وہ بہتر کشتیاں نہیں جو دوسرے استعمال کرتے ہیں۔"

مراد کو وہ دھنسی دھنسی سی مچھلیاں پکڑنے والی کشتیاں یاد آئیں جن کے ابار گوارڈیا سول ہسپانوی ساحل پر لگا دیتی تھی، جو مراکش کے ساحل سے بالکل صاف نظر آتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے لوگ ڈر جائیں گے۔ لیکن لوگ بھلا کہاں ڈرنے والے تھے۔

"اچھا تو دس ہزار،" مراد نے کہا۔

"لا واہ، لا واہ [نہیں بھئی]۔ میں اتنے کم پر نہیں لے جا سکتا۔"

"تمھارے خیال میں دس ہزار کم رقم ہے؟"

"ساری رقم مجھے تھوڑی ملتی ہے۔ مت بھولو کہ مجھے تیل گیس کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ اور پھر پولیس ہے۔ اسے رشوت دینی پڑتی ہے۔" رحال شکر کے زائد ڈلے کو پھر انگلیوں میں گھمانے لگا۔ بڑی چابک دستی سے وہ اس نے اپنی جیب میں ڈال لیا۔ "تمھیں ایک بات بتاتا ہوں۔ رشید نانائی کو جانتے ہو نا؟ کوئی آٹھ ماہ قبل اس کا بھائی ہماری کشتی پر وہاں گیا۔ ان دنوں وہ بارسلونا میں ہے اور ہر ماہ اپنے گھر والوں کو پیسے بھیجتا ہے۔"

مراد کو اس قسم کی کہانیاں ہمیشہ سننی پڑتیں۔ اس نے ڈراؤنی کہانیاں بھی سنی تھیں — غرقاب ہونے کی، قید کیے جانے کی، یا جبرواپس اپنے ملک بھیج دیے جانے کی — لیکن محلے میں جو کہانیاں

بار بار دہرائی جاتیں، وہ صرف اچھی کہانیاں ہی ہوتیں، ان لوگوں کی کہانیاں جنھوں نے پالا مار لیا۔ پچھلے سال تک رشید کا بھائی بھی ایسا ہی ایک بے روزگار جوان تھا، ایک لونڈا جو حشیش پھونکنے کا رسیا اور پھینکی ہوئی خالی ماچس کی ڈبیوں سے عجیب و غریب مجسمے کھڑے کرنے کا شوقین تھا، جنھیں وہ بعد میں آرٹ کہہ کر بیچتا تھا۔ لیکن آج اسے دیکھو۔ مراد نے ایک گہرا سانس لیا۔ "تو بارہ ہزار۔ اور یہ قطعی سمجھو،" اس نے آخر کار کہا۔ "خدا کی قسم، میں اس سے زیادہ اُن سے نہیں نکلوا سکوں گا۔" گو کہنے کو مراد "اُن سے" کہہ رہا تھا، اسے معلوم تھا کہ لامیہ اسے ایک دمڑی بھی نہیں دینے والی۔ اول تو اب اُس کی شادی ہونے والی ہے؛ دوسرے یہ کہ وہ چھوٹی بہن سے مدد مانگنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن چچا کا معاملہ دوسرا تھا۔ وہ اس سے بات کر سکتا تھا، جیسے مرد مردوں سے بات کرتے ہیں، اور قرض مانگ سکتا تھا۔ اغلب یہی ہے کہ پیر مرد نا نہیں کرے گا، خاص طور پر اس کی بہن کی شادی کے سلسلے میں یوں اس کی تنگی کرنے کے بعد۔

"اگر تم بیس ہزار پورے کر دو تو میں تمھیں وہاں نوکری دلانے کی ضمانت دے سکتا ہوں۔ جیسا کہ رشید کے بھائی کے لیے کیا تھا۔"

مراد نے لمبی سانس کھینچی۔ "ٹھیک ہے،" وہ بولا۔

"لیکن سنو، لوگ اپنی بات سے پھر جاتے ہیں۔ میں اپنا وقت نہیں ضائع کرنا چاہتا۔"

"میں پھر جانے والوں میں سے نہیں۔"

رحال نے چائے کی چسکی لی۔ "خوب۔ جب وقت آئے گا، ہم تمھیں بتا دیں گے۔ باب العود کے ساحل پر ملیں گے۔"

"روانگی کب ہوگی؟"

"تم کب تک رقم میرے حوالے کر سکتے ہو؟"

مراد نے نظریں پھیر لیں۔ "جلد ہی،" اس نے کہا۔

کیفے لا لیبرتے سے اٹھنے کے بعد، مراد ساحل کی طرف چل دیا۔ قصبے کے پاس بحیرۂ روم کا منظر دیکھنے کے لیے اسے ایک جگہ مل گئی۔ اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ فاصلے میں ہسپانوی کنارے پر کاروں

کی بتیاں بے شمار ننھے منے روشنی کے میناروں جیسی نظر آ رہی تھیں، وہ مشعلیں جو آنے والوں کو دور رہنے کے لیے خبردار کر رہی تھیں۔ اسے ملازمتی ویزوں کا خیال آیا جن کے حصول کی درخواستیں اس نے دی تھیں۔ گزشتہ چند برسوں میں دیے جانے والے ویزوں کی مقررہ تعداد بہت جلد پوری ہو جاتی اور اس کی عرضی مسترد ہو جاتی۔ دل کی گہرائیوں میں اسے معلوم تھا کہ اسے صرف نوکری مل جائے تو بیڑا پار ہو جائے گا، وہ کامیاب ہو جائے گا، جس طرح آج اس کی بہن کامیاب تھی، جس طرح ایک نہ ایک دن اس کے چھوٹے بھائی بھی کامیاب ہوں گے۔ پھر اس کی رائے کو بے اہمیت سمجھنے کی ہمت ماں اپنے خواب میں بھی نہیں کرے گی، جس طرح اب کرتی تھی۔ اور ہسپانیہ اتنا قریب تھا، بس آبنائے کے پار ہی تو۔

وہ سوکو سے ہو کر گزرنے لگا۔ بازار میں چند سیاح گھومتے پھرتے نظر آئے۔ وہ ان غیر ملکیوں کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ کسی اچھے ہوٹل جا سکتے تھے، صاف ستھرا بستر حاصل کر سکتے تھے، ساحل پر یا پیراکی کے تالاب جا سکتے تھے، لیکن یہاں شہر کے بدترین علاقے میں سرگرداں پھر رہے تھے، کسی عجیب و غریب شے کی تلاش میں۔ اسے ان میں سے ایک دو سے بات کرنے کا خیال آیا، پوچھنے کا کہ کیا انھیں گائیڈ کی ضرورت ہے، لیکن اب اس کا دل اس سے اچاٹ ہو چکا تھا۔

بھنتے ہوئے گوشت کی اشتہا انگیز خوشبو نے اسے للچا دیا، اور وہ ایک خوانچے کے پاس آ کر رک گیا جہاں کوفتے اور سیخ کباب بکتے تھے۔ جب وہ اپنے آڈر کا انتظار کر رہا تھا اسے ایک عورت کی آواز سنائی دی جو انگریزی بول رہی تھی اور وہ اسے دیکھنے کے لیے مڑا۔ یہ وہی تھی جسے وہ دن میں پہلے دیکھ چکا تھا۔ بھلا اس کا کیا نام تھا؟ آکلین۔ اس کے ایک ہاتھ میں گائیڈ بک کھلی ہوئی تھی اور دوسرے ہاتھ سے اپنے سامنے اشارہ کر رہی تھی۔ "میرے خیال میں اس طرف ہے،" وہ بولی۔ جب عورت نے نظر اوپر کی اور اس سے نظریں چار ہوئیں تو مراد سوچنے لگا کہ کیا وہ اسے جلابے کے بغیر پہچان گئی ہوگی۔ وہ مسکرائی۔ اس کے انداز میں سہولت اور آزادی کا جو احساس تھا، طور و طریق میں جو لاپروائی تھی، زندہ رہنے کے جوکھوں سے آزادی کی جو کیفیت تھی، اس نے انھیں دیکھا اور ان کے لیے اس پر رشک کیا۔

"تمھیں پتا ہے کیفے سینٹرال کہاں ہے؟" اس نے پوچھا۔ تو ان کے بارے میں اس کا

اندازہ درست تھا— وہ بیٹس کی تلاش میں طنجہ آئے تھا۔ ان کی سیاحت میں خود کو داخل کرنا اب اس کے لیے کتنا آسان تھا— وہ انھیں اس کیفے کی زیارت کرا سکتا تھا جہاں ولیم بروز "کیف" پینے جاتا تھا، یا وہ ہوٹل جہاں اس نے The Naked Lunch لکھا تھا۔ لیکن وہ اب ان سب کو اپنے پیچھے چھوڑ آیا تھا؛ وہ تو اب نئی شروعات کی بابت سوچ رہا تھا، ایک نئی سرزمین میں۔ اس نے سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ "اس طرف،" وہ بولا۔ "پانسیوں فونیشس کے مقابل۔" پھر وہ مڑ کر اپنے آڈر کا انتظار کرنے لگا۔

دوسرا حصہ بعد

ولی

فرید نے اُسے بچایا تھا۔ بعض لوگوں کے خیال میں یہ ناممکن تھا۔ انھوں نے کہا کہ لڑکا صرف دس سال کا تھا، وہ خود اپنے کو ہی بمشکل بچا سکتا تھا۔ جب حلیمہ نے انھیں بتایا کہ اس نے ایک ڈنڈی اس کی طرف بڑھائی تھی اور اسے کھینچ کر ٹھیک ساحل تک لے آیا تھا تو کسی نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا۔ وہ پوچھنے لگے کہ ڈنڈی اسے کہاں سے مل گئی، اور حلیمہ نے جواب دیا کہ اسے نہیں معلوم کہ کہاں سے ملی۔ بادل ہے، وہ انگلیوں سے اپنی پیشانیاں تھپتھپاتے ہوئے بولے۔ وہ معافی کی مستحق ہے، اس نے بڑی تکلیفیں اُٹھائی ہیں۔

لیکن کچھ دوسرے لوگوں نے اس پر یقین کیا۔ حلیمہ اوروں کے ساتھ ہی ڈوب سکتی تھی، انھوں نے کہا۔ کنارے پہنچنے سے پہلے ہی کپتان نے انھیں کشتی سے زبردستی نکال دیا تھا پانی یخ تھا، دھارا سخت تیز، اور حلیمہ تیرنا نہیں جانتی تھی۔ اس کے باوجود فرید کسی نہ کسی طرح اسے کھینچ کھانچ کر خطرے سے نکال لایا۔ اس کے باوجود کہ ہسپانوی پولیس ٹھیک ساحل پر ان کی گھات میں بیٹھی ہوئی تھی، کم از کم وہ زندہ تو تھے۔ اس کے علاوہ، لڑکے نے اپنی بہن منیٰ کی مدد بھی کی تھی، اور اپنے چھوٹے بھائی امین کی بھی۔ وہ سب بچ گئے تھے۔ فرید ایک ولی اللہ تھا۔

اور تو اور، خود حلیمہ کے شوہر مصطفیٰ کو بھی یہی لگا کہ یہ ایک معجزہ تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ اس نے آبنائے جبل الطارق کو عبور کرنے کی کوشش کی تھی، اس نے ٹی وی کو لات مار کر اس کے اسٹینڈ سے گرا دیا تھا اور جتنے بھی کھانے پینے کے برتن بچ رہے تھے انھیں چکنا چور کر دیا تھا۔ وہ ہر ایک سے کہتا پھرا کہ اگر حلیمہ کو طلاق ہی چاہیے تھی تو اس نے اسے پیسے کیوں نہیں دے دیے، جیسا کہ اس نے کہا

تھا؟ وہ اسے طلاق دے دیتا۔ اور ایسی عورت کے لیے جس کے بھائی فرانس میں برسرِ روزگار ہوں، پانچ ہزار درہم کی کیا اہمیت ہے؟ وہ اس خرچے کو بہ آسانی برداشت کر سکتے تھے۔ لیکن اس کا بچوں کو لے کر یوں بھاگ جانا، اپنی اور ان کی زندگی کو خطرے میں ڈالنا، یہ سب بالکل ظاہر ہے کہ کسی باؤلی عورت کی حرکات ہی ہو سکتی ہیں۔ اب اگر وہ اس کی ٹھکائی کرتا ہے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ لیکن حلیمہ جیسی حمقہ [حمق] نے بھی ایک بات ٹھیک کی تھی، وہ بولا۔ اس نے اس کے لڑکے کو پیدا کیا تھا، فرید کو، اور اس کے ننھے سپوت نے اس کی جان بچائی تھی۔ وہ بڑی خوش قسمت تھی۔

جب حلیمہ کا سابلانکا لوٹی تو اپنی ماں کے یہاں رہنے نہیں گئی، جو اس کے چلے جانے کے فیصلے سے کبھی متفق نہیں ہوئی تھی، اور جو، حلیمہ کو خدشہ تھا، اسے معطی کے پاس واپس چلے جانے کے لیے کہتی۔ اس کے برخلاف، اس نے ایک بار پھر کچھ رقم قرض پر لی، اس بار اپنے کسی عم زاد سے، اور سیدی مومن میں، جو شہر کے باہر ایک پسماندہ بستی تھی، ایک کمرہ اپنے اور تینوں بچوں کے لیے کرائے پر لے لیا۔ اسے صفائی ستھرائی کرنے کی ویسی نوکری تو نہیں مل سکی جیسی جانے سے پہلے اس کے پاس تھی، چنانچہ وہ مزدوروں کی اس ٹولی میں جا شامل ہوئی جو یومیہ مارکیٹ میں اکٹھے ہوتے تھے، کچی سڑک کے کنارے اکڑوں بیٹھے بیٹھے اپنا وقت گزارتی، کسی کے سر کے اشارے سے بلانے کی منتظر جسے کپڑے دھلوانے ہوتے یا موسمی صفائی ستھرائی کی ضرورت ہوتی۔ پھیری والے سب سے پہلے وہاں پہنچتے، اپنے ٹھیلوں پر نارنگیوں یا ٹماٹروں یا مٹر کے اونچے اونچے انبار لگائے۔ پھر خریدار آ نکلتے، بھاؤ تاؤ کرتے، اور اپنی اپنی ضرورت کی اشیا خریدتے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد بازار رفتہ رفتہ خالی ہونے لگتا، اور جب عصر کی اذان دی جاتی، وہ کھڑی ہوتی اور گھر لوٹ آتی۔ بعض اوقات، جب اسے کوئی کام نہ ملتا، اور سورج اس پر اتنی بے رحمی سے اپنی آگ برساتا کہ اسے لگتا کہ اس کا سر کسی کیتلی کی طرح سیٹیاں بجانے لگے گا، تو وہ فرید پر غصہ ہو جاتی۔ اس نے آخر کیوں اس کی جان بچائی تھی؟ اس نے ان میں سے کسی کی جان بھی کیوں بچائی تھی؟ اس طرح محض جیے جانا زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہو سکتا۔

پھر ایک دن ایک خوانچہ فروش سے، جس کا ٹھیلہ دوپہر کے کھانے کے وقت تک تقریباً نبٹ

جاتا تھا، وہ اس کے بچے ہوئے بھٹے کسی نہ کسی طرح لے لینے میں کامیاب ہوگئی۔ اس کا ارادہ شام کے پکوان کے لیے بھٹے بھوننے کا تھا۔ وہ ابھی آگ کو دھونکنی سے ہوا دے رہی تھی کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ معطی اس کی دہلیز پر کھڑا ہوا تھا، دروازے کا چوکھٹا اس کے جسم سے بھر گیا تھا۔ اس کی قمیص سینے تک کھلی ہوئی تھی، جس سے اس کے سفید پڑتے ہوئے بال جھانک رہے تھے۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ حلیمہ اپنی ایڑیوں کے بل گھومی، کمرے کو نظر سے کھنگال ڈالا، اس فکر میں غلطاں کہ اتنی چھوٹی سی جگہ میں اپنے کو چھپانے کی کہاں گنجائش پیدا کرے۔ لیکن معطی نے اس کی کلائی پکڑ لی اور خود آگے بڑھے بغیر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ حلیمہ نے اپنے ہونٹ کاٹے، اور آنے والی ضرب کے خلاف اپنے کو مضبوط رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن معطی نے اسے مارا نہیں۔ اس کے بجائے، ایک کاغذ اس کے ہاتھ میں ٹھونس دیا۔ ''اگر یہی تجھے چاہیے تھا،'' اس نے کہا، ''تو لے، یہ رہا۔'' اور، جیسے اپنے اعلان نامے کو اوقاف لگا رہا ہو، اس پر تھوک دیا۔ بلغم اس کی قمیص پر آ کر گرا، لیکن حلیمہ کو صرف طلاق نامہ ہی نظر آ رہا تھا، اس کی بڑی نفیس خطاطی اور بالکل نیچے کسی شک اور مغالطے سے بالاعدول [قاضی] کے دستخط۔ وہ مڑا اور چلا گیا۔

حلیمہ، دم بخود، کھڑی رہی۔ وہ خوف، جو اب اپنے سابقہ شوہر کو دیکھ کر اس کے جوف شکم میں ایک گرہ سی ڈال رہا تھا، غائب ہونے لگا، اور اس کے بجائے خون اسے اپنی کنپٹیوں کی طرف دوڑتا ہوا محسوس ہوا۔ فرحت کا یہ احساس اس کے لیے قطعی اجنبی تھا۔ اس نے کاغذ کے اس پرزے کو حاصل کرنے کے لیے کیا نہیں کیا تھا، اور جب اس کی کم سے کم توقع کی جا سکتی تھی، یہ ٹھیک اس کے دروازے پر پہنچا دیا گیا تھا۔ معطی کے ارادے کو کس چیز نے بدل دیا تھا؟ اسے اپنی ماں سے معلوم ہوا تھا کہ اس کے بھاگ جانے کے بمشکل ایک ماہ بعد ہی معطی نے دوسری شادی کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن لڑکی کے والدین کو حلیمہ کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس کا علم ہو گیا اور انھوں نے انکار کر دیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ حلیمہ کو اپنی یاد سے محو کر کے کسی اور عورت کے ساتھ نئی زندگی کی ابتدا کرنا چاہتا ہو۔ لیکن پھر اسے طنجہ سے کاسابلانکا واپسی کا ریل گاڑی کا وہ طویل سفر یاد آیا جس کے دوران فرید نے اس کی طرف مڑ کر کہا تھا، ''کاش بابا نے پہلی دفعہ ہی جب تم نے طلاق مانگی تھی دے دی ہوتی۔'' وہ اس کے تبصرے پر زیر لب ہنس دی تھی، ہاتھ سے اس کے بال پریشاں کر دیے تھے، اور پھر مڑ کر باہر منظر کو

دیکھنے لگی تھی۔ اب اس نے کاغذ کو احتیاط سے تہہ کیا اور اپنے بٹوے میں رکھ دیا۔ ہنوز کپکپاتے ہاتھوں سے اس نے کیتلی مجمرہ پر چڑھائی اور اپنے لیے چائے دانی بھر چائے بنائی۔ فرید کی تمنا پوری ہوگئی تھی۔ وہ بیٹھی ہوئی تھی، ٹھوڑی ہاتھوں پر سہارے، اور سوچ رہی تھی کہ اس کا کیا مطلب نکلتا ہے۔ اور اسے خون رستا ہوا درخت یاد آ گیا۔

جب حلیمہ پانچ سال کی تھی، اس کی ماں بازار سے لوٹی تھی، اس خبر سے بوکھلائی ہوئی جو اس نے سنی تھی۔ ایک شجر تھا، مقدس شجر، رباط میں، جس سے خون ٹپکتا تھا۔ انھوں نے، پنا دوپہر کا کھانا باندھا تھا اور ریل گاڑی میں بیٹھے دار السلطنت روانہ ہو گئے تھے، چوتھے درجے کے ڈبے میں، جہاں لکڑی کی بنچوں پر دہقان بیٹھے ہوئے تھے، اور اپنے بوروں، ٹوکروں، اور چوزوں کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ یہ حلیمہ کا شہر کا پہلا سفر تھا، اور پُرسکوت سڑکوں اور سرکاری عمارتوں کے سامنے بڑی نفاست اور سلیقے سے پروردہ لان دیکھ کر اسے بڑی مایوسی ہوئی تھی۔ خون رستا ہوا درخت ایسے قطعے میں کھڑا تھا جس میں بہت کم پیڑ پودے لگے تھے، اور یہ پھولوں کی دکانوں کے مقابل تھا، پولیس چوکی سے چند قدم کے فاصلے پر۔ کوئی درجن بھر لوگ زیارت کے لیے وہاں پہلے سے آئے ہوئے تھے، کچھ بیٹھے تھے، کچھ کھڑے ہوئے تھے۔ انھیں سے حلیمہ اور اس کی ماں نے درخت کی کہانی سنی۔ ایک زمین کار نے اسے کاٹ ڈالنے کا ارادہ کیا تھا تاکہ وہاں کثیر منزلہ عمارت کھڑی کر سکے، لیکن جب مزدوروں نے درخت کو گرانے کی کوشش کی تو اس سے خون بہنے لگا۔ اس کے فوراً بعد ہی زائرین نمودار ہونے لگے، بعض اس سے بہتا ہوا سرخ رنگ سیال جمع کرتے کہ اسے مختلف مرکبات میں استعمال کر سکیں، بعض دوسرے اس جگہ خاص طور پر نماز پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ کام روکنا پڑا۔ آج، کسی نے بتایا، بلدیہ نے باقاعدہ ایک سائنس داں کو وہاں لوگوں کو یہ بتانے کے لیے بھیجا ہے کہ یہ کوئی معجزہ وجزہ نہیں۔

حلیمہ اور اس کی ماں کسی نہ کسی طرح راہ بناتی ہوئی ہجوم کی پہلی صف میں پہنچ گئیں، جہاں سے سائنس داں کو بہتر طور پر دیکھ سکیں۔ یہ ایک نوجوان آدمی تھا، بمشکل سے بیس سال کا، اس کے بال ایفرو طرز میں خوب ڈھلکے ہوئے تھے، جیسے ٹی وی پر دکھائے جانے والے امریکی گلوکاروں کے ہوتے ہیں۔ وہ ایک دھاری دار بٹنوں والی قمیص اور بیل باٹم پتلون پہنے ہوئے تھا۔ ایک پنسل اس کے کان کے پیچھے اڑسی ہوئی تھی۔ وہ کھڑا خاموشی کے ساتھ سورج مکھی کے بیجوں کی جگالی کر رہا تھا، تا آنکہ تمام

Scanned with CamScanner

حاضرین نے قرار پکڑا۔ پھر وہ چلتا ہوا درخت کے پاس پہنچا، اپنا سوئس آرمی چاقو کھٹ سے کھولا اور تنے پر ایک گھاؤ لگایا۔ اس نے چھال کا ٹکڑا ایک طرف ڈال دیا اور، خون رنگ چوب رس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ بالکل قدرتی مادہ ہے جو اس خاص نوع کے یوکلپٹس سے نکلتا ہے۔ اس نے درخت کو ایک عجز کیسے نام سے پکارا، جو سننے میں فرانسیسی یا ہسپانوی لگتا تھا۔ درخت سو سال سے، یا ممکن ہے اس سے بھی زیادہ عرصے سے، یہ شیرہ بنا رہا ہے۔ یہ بالکل قدرتی عمل ہے۔ کوئی معجزہ نہیں۔ کوئی قابلِ دید چیز نہیں۔ گھر جاؤ، اس نے کہا۔ لوگوں نے اپنا بوجھ ایک ٹانگ سے دوسری پر منتقل کیا، ادھر ادھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا، لیکن وہیں کھڑے رہے۔ سائنس داں نے شانے اچکائے اور چلتا بنا۔ احمق کہیں کا، لوگوں نے کہا۔ وہ کیا جانے معجزوں کے بارے میں؟ اس مقدس جگہ کو ناپاک کر گیا۔ انھوں نے نرم، مرطوب زمین کی طرف اشارہ کیا، جہاں سورج مکھی کے بیجوں کے چھلکے، اس متبرک مقام سے ان کے گزران کی شہادت کے طور پر بکھرے ہوئے تھے۔ حلیمہ کی ماں نے اپنی خمیدہ انگلیاں تنے کے سہارے سہارے پھرائیں اور کچھ شیرہ اکٹھا کر لیا، اور اسے دوا کی گولیوں کی خالی شیشی میں بھر لیا۔

رباط کے سفر سے حلیمہ کی ماں پوری امید کے ساتھ کا سامان نکالوں کہ اس کا گٹھیا جو حال میں پھر بھڑک اٹھا تھا، ماند پڑ جائے گا، کہ اس کی دعائیں پوری ہوں گی۔ حلیمہ کے باپ نے، جو ہمیشہ کونے والے دیوان پر بیٹھ بنافشہ کی سگریٹیں پھونکا کرتا تھا، سر ہلا کر کہا کہ اس کا دماغ چل گیا ہے۔ لیکن یہ بھی ہے کہ پھر کچھ عرصے کے لیے اس کی ماں کا مرض ٹھیک ہو گیا تھا۔ اس نے پھر سے بنائی شروع کر دی تھی، اور اس کی سلائیوں کی آواز ایک ماہ تک ہر شام کو بجنے والا ایک طرح کا صوتی لیکھ بن گئی تھی۔ لیکن پھر جلد ہی رباط سے خبر آئی کہ زمین کار نے وہ پیڑ کٹوا کر نئی عمارت کی تعمیر کا کام شروع کر دیا ہے۔ جب گٹھیا پھر بھڑک اٹھا تو حلیمہ کی ماں نے کہا کہ یہ پیڑ کے کٹ جانے کا نتیجہ ہے۔

حلیمہ نے چائے کی چسکی لی۔ وہ سر ہلانے لگی۔ اس کی ماں کے واسطے کوئی معجزہ رونما نہیں ہوا تھا، اور نہ شاید خود اس کے لیے ہونے والا تھا۔ اس کے باوجود، اگر وہ لوگوں کی اس بات پر خود کو یقین کرنے کے لیے آمادہ کر لیتی کہ وہ ڈنڈی اور بیوڈ کا واقعہ خود اسی کی کرامت ہے، تو بھی وہ معطی کی تبدیلیٔ قلب کو اتنی آسانی سے نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ ایک معجزہ ہی اس آدمی کو اس کی آزادی بخشنے پر

Scanned with CamScanner

تیار کر سکتا تھا۔ بعض اوقات، حلیمہ سوچتی، بہتر ہے کہ آدمی ان چیزوں کے آگے سرِ تسلیم خم کر لے جن کی سمجھ اس کی رسائی سے باہر ہے۔ اس کے بیٹے فرید نے اسے دوبارہ زندگی دے دی تھی۔ دوبارہ اسے یہ باور کرنا ہی ہوگا کہ وہ اوروں سے مختلف ہے۔

اس رات، جب وہ اور بچے چٹائی پر سونے گئے، تو وہ اپنے پہلو کے بل لیٹی گھنٹوں تک اسے تکتی رہی، اس کے بچپن کے دنوں کو اپنے ذہن میں جگاتی رہی۔ سوچتی رہی کہ کیا کوئی اور بھی معجزہ رہا ہوگا جو عدم توجہی کے باعث اس کی نظر سے بچ رہا ہو۔ اسے وہ وقت یاد آیا جب وہ اس کے ساتھ جا رہی تھی، ہاتھوں میں ہاتھ دیے، الفکری بازار کی طرف۔ وہ فٹ پاتھ سے اُتری ہی تھی کہ ایک موٹر والے نے اس تیزی سے موڑ کاٹا کہ اس کی ہونڈا گاڑی اس کی طرف جھک گئی تھی۔ عین موقعے پر فرید نے اسے پیچھے کی طرف کھینچ لیا تھا۔ وہ فٹ پاتھ ہی پر کھڑی ہو گئی تھی، اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں، ایک ہاتھ فرید کے شانے پر رکھا ہوا تھا اور دوسرے اس کے اپنے سینے پر، جیسے اس سے دھڑ دھڑاتے دل کو قرار آ جائے گا۔

اس نے اپنی آنکھیں موند لیں اور کروٹ لے کر اپنی پشت کے بل لیٹ گئی۔ اس کا لڑکا مرضی [بھاگوان] تھا، ایک متبرک بچہ۔

سالوں میں اس کی ہمسائی خدیجہ سب سے پہلی تھی۔ ایک شام وہ اپنے لڑکے عدنان کو کھینچ کھانچ کر اس کے گھر لائی اور چٹائی پر اپنے پاس بیٹھنے پر مجبور کیا۔ وہ خاموش بیٹھی رہی۔ اس درمیان میں حلیمہ جس قدر بھی پودینہ اور شکر بچ رہی تھی اس کی چائے بناتی رہی۔ فرید انھیں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، جبکہ اس کا چھوٹا بھائی اور بہن ڈوری کا کھیل کھیل رہے تھے، وہ شکلیں بنا رہے تھے جو پلنگ اور کشتیوں سے مشابہ تھیں، ڈوری ایک دوسرے کو دے رہے تھے۔ حلیمہ نے چائے پیش کی۔ رسمی باتوں کے بعد، خدیجہ اپنے گھریلو لباس کے حاشیوں کو بلاوجہ چھیڑنے لگی، ہونٹ کاٹا، اور ایک احسان کرنے کی فرمائش کی۔ بولی کہ عدنان اپنے گریڈ اسکول کا امتحان دینے والا ہے۔ اسے مدد کی ضرورت ہے، اور تھوڑی سی اچھی قسمت درکار ہے۔ ''پچھلے سال ایک بار پہلے ہی فیل ہو چکا ہے،'' اس نے بتایا۔ ''اگر اس سال بھی فیل ہو گیا تو وہ اسے اسکول سے نکال دیں گے۔ تم تصور کر سکتی ہو، یا حلیمہ؟ بتاؤ

اگر یہ ہائی اسکول نہیں گیا تو میں کیا کروں گی؟" اس نے حفظ ماتقدم کے طور پر اپنے گال پر چپت ماری۔

"تو تم اسے گھر پر کیوں نہیں رکھتیں اور پڑھائی کرنے پر کیوں مجبور نہیں کرتیں؟" اس قسم کا مطالبہ کرنے پر خدیجہ سے بیزار ہو کر حلیمہ نے پوچھا۔ ہر شخص جانتا تھا کہ عدنان اسکول گول کرنے اور سڑک پر فٹ بال کھیلنے کا رسیا تھا۔

"لیکن ہو سکتا ہے کہ تمھارا بیٹا اسے برکت دے سکے،" خدیجہ نے اصرار کیا۔ "تم نے نہیں کہا تھا کہ اس نے تمھاری جان بچائی تھی؟ تمھارے بچوں کی جان بچائی تھی؟"

حلیمہ نے تاسف کے ساتھ اقرار میں سر ہلایا۔ فرید نے اپنا سر ماں کے بازو پر رکھ دیا، جیسے اسے غلطی کرنے پر تسلی دے رہا ہو۔ حلیمہ نے اپنی ہتھیلیاں کھول کر پڑوسن کے آگے کر دیں۔ "یہ چھوٹا سا بچہ ہی تو ہے،" وہ بولی۔ "اور پھر اگر یہ معجزے دکھا سکتا تو ہم اس حالت میں رہ رہے ہوتے؟"

"فرید کو میرے بچے کو برکت دینے دو،" خدیجہ نے منت کی۔ "اسے ہمارے لیے تھوڑی سی خوش قسمتی لانے دو۔"

"اگر عدنان محنت سے پڑھے تو اسے قسمت دوست کی ضرورت نہیں،" حلیمہ بڑبڑائی۔ خدیجہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے بجائے، اس نے حلیمہ کو مجروح نگاہوں سے دیکھا۔ خاموشی بوجھل ہو گئی، اس میں خواہ مخواہ سر پر مسلط کرنے والی کیفیت آ گئی۔ اس کے باوجود خدیجہ نے رخصت ہونے کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا۔ آخر کار حلیمہ نے فرید کو شہ کا دیا۔ اس نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا، عدنان کے سر کو چھوا، اور اس تمام عرصے دوسری طرف دیکھتا رہا۔ یہ اس کی پہلی برکت تھی، بطور بادلِ ناخواستہ ولی۔

حلیمہ برتن دھو رہی تھی کہ فرید اس کے پاس آیا۔ "کیا یہ سچ ہے؟" اس نے پوچھا۔

"کیا؟"

"کہ میں ولی ہوں؟"

"شیطان کو کوسو، بچے،" وہ سر ہلا کر بولی۔ "وہ عورت تو پاگل ہے۔" اس نے سنکی اٹھائی اور صاف پانی میں کھنگالنے لگی۔ "کوڑا باہر نکالنا مت بھولنا۔"

''تو پھر تم نے مجھے اس کے لڑکے کو چھونے کے لیے کیوں کہا تھا؟''

''اس لیے کہ اسے رخصت کرنے کا یہی واحد طریقہ تھا۔ تم دیکھ نہیں رہے تھے؟''

فرید نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تمھیں اعتراض تو نہیں، ٹھیک ہے؟'' حلیمہ نے کہا، ہاتھ آگے بڑھا کر تاکہ اپنے بیٹے کے بال سلجھا سکے۔ ''اس سے کوئی تکلیف نہیں پہنچتی، ہے نا؟''

فرید نے شانے اُچکائے۔ ''نہیں۔''

''کم از کم، اس طرح وہ اپنے گھر خوش خوش تو لوٹی۔''

فرید کوڑا اُٹھا کر خاموشی سے باہر چلا۔ باورچی خانے سے حلیمہ کو امین اور منّی کے فرید کو برکت کے معاملے میں چھیڑنے کی آواز سنائی دی۔ ''میری ناک چھوؤ،'' منّی ہنستے ہوئے بولی، ''میرا خیال ہے یہ بہہ رہی ہے۔ اسے تھوڑی سی برکت کی ضرورت ہے۔''

''میرے چوتڑ کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' امین بولا۔ ''شاید میری ریح بھی عطر کی طرح مہکنے لگے۔''

فرید نے بڑے زور سے دروازہ بند کیا، لیکن ان کے قہقہے روک نہ سکا۔

گھر میں ولی کی موجودگی کے باوصف حلیمہ کو روزی تو بہرکیف کمانی ہی تھی۔ اس کی ماں نے اسے کسی وکیل کے دفتر میں ہفتے میں دو بار کی جھاڑ پونچھ کی ملازمت کی خبر دی تھی، لیکن جب وہ پوچھنے کے لیے وہاں پہنچی تو معلوم ہوا کہ یہ جگہ تو بھر گئی ہے۔ چنانچہ اس نے بازار میں بغریر بیچنا شروع کر دیا۔ ہر سال، جب لوگ عید کے موقعے پر اس کے بنائے ہوئے بغریر چکھتے، تو ان کے خوب پھولے پھولے ہونے پر اس کی تعریف کرتے۔ کبھی کبھار وہ اسکول سے گھر لوٹتے ہوئے طالب علموں کو لبھانے کے لیے تھوڑے بہت میٹھے سموسے بھی بنا لیتی۔ اسے اپنے لیے کام کرنے میں مزہ آتا تھا اور اس میں سودا بیچنے کی لیاقت بھی تھی۔ تو گویا آخرکار کام چل نکلا تھا، اس نے سوچا۔ بازار سے گھر لوٹتے وقت بعض اوقات اسے عدنان سڑک پر کھیلتا ہوا نظر آتا اور وہ اس کا کان کھینچتی ہوئی ٹھیک اس کے گھر تک لے آتی اور کہتی کہ اسے برکت دی گئی ہے، اسے یوں فٹ بال پر ضائع کرنا اسے زیب نہیں دیتا۔

اس میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ اب عدنان حلیمہ کو سر پر اپنا رافیہ سے بنا ہوا تھیلا متوازن رکھے سڑک کے نکڑ سے اندر مڑتے دیکھتے ہی اپنے گھر بھاگ کھڑا ہوتا۔

جون کے ایک دن جب حلیمہ اور بچے گھر لوٹے تو دیکھا خدیجہ وہاں ان کا انتظار کر رہی ہے، شکر کا قالب (مصری کا تکون) بغل میں دبائے۔ اس کے بیٹے نے امتحان کسی نہ کسی طرح پاس کر لیا تھا، چنانچہ اس نے تشکر کے ساتھ قالب حلیمہ کے ہاتھوں میں ٹھونس دیا۔ حلیمہ نے بڑبڑا کر اسے مبارکباد پیش کی اور تالے میں چابی لگانے کے لیے مڑی۔ لیکن خدیجہ ٹلی نہیں۔ وہ حلیمہ سے اتنے قریب کھڑی ہوئی تھی کہ اس کی گرم سانسیں اسے اپنی گردن کو چھوتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ حلیمہ نے رافیہ کے تھیلے کو نیچے کھسکایا اور اپنی کمر سے نکال دیا۔ "عدنان نے خوب محنت کی ہوگی،" اس نے کہا۔ یہ نہیں معلوم ہو رہا تھا کہ خدیجہ نے سنا ہو۔ وہ فرید کو گھورتی رہی، اور اس کے چہرے کا تاثر احترام آمیز خوف کا تھا۔ حلیمہ نے اپنے لڑکے کا کندھا دبایا اور اس کی اور اس کے بھائیوں کی اندر گھر میں قیادت کی، اس سے قبل کہ مڑ کر خدیجہ سے کہے: "انشاء اللہ اگلے سال بھی اسی طرح کامیاب ہوگا۔"

حلیمہ نے دروازہ بند کیا اور لمبی سانس کھینچی۔ "اب وہ اور زیادہ مانگے گی،" وہ بولی۔ "اور وہ دوسروں کو بھی جا جا کر بتائے گی۔"

فرید پہلے ہی سے شکر کی تکون سے نیلا کاغذ چھیلنے لگا تھا۔ اس نے تین ٹکڑے کیے اور اپنا ٹکڑا منہ میں ڈالنے سے پہلے ایک ایک اپنے بھائی اور بہن کو دیا۔ وہ دانت نکال کر ہنسا۔ "تمھی نے کہا تھا کہ اس سے کوئی تکلیف نہیں پہنچتی۔"

ایک ہفتے بعد، حلیمہ بغیر کے لیے آٹا گوندھ رہی تھی کہ اسے دستک سنائی دی۔ منی نے دروازہ کھولا۔ حلیمہ کی ماں فاتحہ پاؤں پٹکارتی، اپنی چھڑی ٹیکتی اندر داخل ہوئی۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" حلیمہ نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

"کیا میں اپنے نواسوں نواسی سے نہیں مل سکتی؟" فاتحہ نے جواب دیا، اس کی آنکھوں میں برہمی کا تاثر تھا۔ "تم انھیں ملانے کبھی لاتی ہی نہیں ہو۔ اسی لیے تو تمھاری بے چاری ماں کو بس لے کر ان سے ملنے اتنی دور آنا پڑتا ہے۔" اس نے اپنا جلابہ اتارا اور چٹائی پر بیٹھ گئی۔

حلیمہ کو خوف آ رہا تھا کہ جانے اس غیر متوقع آمد کے پیچھے کیا ہو۔ کیا اس کی ماں اسے دوبارہ معطی سے تعلق پیدا کرنے کے لیے کہے گی؟ کیا وہ اس سے بازار میں کھانے کی چیزیں بیچنا چھوڑ کر کوئی باقاعدہ ملازمت تلاش کرنے کے لیے کہے گی؟ خواہ اس کی آمد کا مقصد کچھ بھی رہا ہو، حلیمہ کو پتا تھا کہ یہ اچھا شگون بہرحال نہیں ہو سکتا تھا۔ "جاؤ باہر جا کر کھیلو،" اس نے بچوں سے کہا۔

"ٹھہرو،" فاتحہ نے کہا۔ اس نے اپنے جھولے میں کچھ ٹٹولا اور مٹھی بھر مٹھائی نکالی۔ "میں ان کے لیے تھوڑی سی چوسنے والی مٹھائی لائی ہوں۔" امین اور منی اپنا حصہ لینے بھاگے بھاگے آئے، شور مچا کر مٹھائی سے لپٹا ہوا کاغذ اتارنے لگے، رنگوں اور ذائقوں کا مقابلہ کرنے لگے۔

"فرید، تم بھی کچھ لو،" فاتحہ نے اپنے خمیدہ ہاتھ کو اپنے نواسے کے سامنے بڑھا کر اور کھول کر کہا۔

لڑکے نے انکار میں سر ہلا دیا۔ "میرا جی مٹھائی کو نہیں چاہ رہا۔"

"خیر، ذرا قریب تو آؤ، تمھیں دیکھوں تو سہی،" اس نے منت کی۔

"میں بس ابھی باہر کھیلنے جا رہا ہوں۔" اس نے بچکا ہوا فٹ بال جھپٹ کر اٹھایا اور بھاگ گیا، جلو میں اپنے بہن بھائیوں کو لیے۔

فاتحہ نے اپنی زبان چٹخی۔ "کیسے بدتمیز ہیں،" اس نے کہا۔

"کیا تم کبھی کوئی اچھی بات نہیں کہہ سکتی ہو؟" حلیمہ نے پوچھا۔ یہ بالکل اس کی ماں تھی، اس نے سوچا، جو منی، فرید، اور امین جیسے تین پیارے بچوں میں بھی کوئی نہ کوئی عیب نکالے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ فاتحہ نے اپنے ہونٹ تر کیے اور بڑی دیر تک خاموش رہی، حلیمہ کو آٹے کا تھوڑا سا آمیزہ توے پر ڈالتے دیکھتی رہی۔

"تم ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں؟" حلیمہ نے پوچھا۔

"کاہے کے لیے؟"

"گٹھیا کے علاج کے لیے۔"

فاتحہ جھینکی کہ وہ پہلے ہی بہتیرے ڈاکٹروں کے پاس ہو آئی ہے۔

"تم کو دوبارہ جانا چاہیے۔ ان کے پاس شاید ان دنوں بہتر دوائیں ہوں۔"

''مجھے دواؤں کی ضرورت نہیں۔ میں ٹھیک رہوں گی۔'' فاتحہ نے کہا۔ اس کی آواز لرز رہی تھی۔ ''اس کے علاوہ، میں اپنی فکر کیوں کرتی پھروں جب خود میری بیٹی کو مجھے تھوڑی سی برکت دلوانے کی پروا نہیں؟''

حلیمہ نے اپنا سر ہلایا۔ اس کی ماں کی میلوڈ راما رچانے کی فطری مہارت ایسی تھی جس کی وہ کبھی بھی عادی نہیں ہو سکے گی۔ وہ کبھی ایسے لوگوں کی عادی نہیں ہو سکے گی جو اپنے پر اعتماد کرنے کے بجائے اپنی مصیبتوں میں دوسروں کی مدد کے خواہاں ہوتے ہیں۔ اس نے پہلے بغریر کو توے سے اتار کر کشتی میں قرینے سے لگا دیا، پھر توے پر اور گندھا آٹا ڈالا۔

''ہم سب تمھاری پروا کرتے ہیں، اماں۔'' حلیمہ نے کہا۔ ''لو، ذرا چکھو۔''

فاتحہ نے بغریر کو لپیٹا اور ایک لقمہ توڑا۔ ''اللہ، یہ تو بڑی مزے دار ہے۔''

''میں تمھیں خود ڈاکٹر کو دکھانے لے جاؤں گی۔''

''میرے پاس ڈاکٹر کو دکھانے کے پیسے نہیں۔''

''فکر نہ کرو۔ پیسے میں دوں گی۔'' حلیمہ نے کہا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ماں کا بازو چھوا، جیسے اسے تسلی دے رہی ہو۔ پھر بغریر کو پکتے میں بلبلے چھوڑتے دیکھنے کے لیے گھومی۔ اس نے مدھم پڑتی ہوئی دوپہر کی روشنی کو نہیں دیکھا جو اس کے پیچھے سایوں کو دراز کر رہی تھی، اس کے جسم کو کسی خانقاہ کی محرابوں کی طرح چوکھٹے میں جڑ رہی تھی۔

*

حرم کی کنیز

وہ نوعمر [ٹین ایجر] فاطمہ کا پسندیدہ گاہک تھا۔ اسے ان معنوں میں باقاعدہ تو نہیں کہا جا سکتا جن معنوں میں اس کے وہ گاہک تھے جو جمعے کی رات یا مہینے کی پہلی تاریخ کو اس کے پاس آتے تھے، وہ

Scanned with CamScanner

جو یوں آتے تھے جیسے تنخواہ پانے کے دن کسی بیکری کے پاس کافی کے ساتھ کھانے کے لیے ایک زائد پیسٹری خریدنے کو رک گئے ہوں۔ ان پانچ مہینوں میں جن میں وہ اُس سے واقف ہوئی تھی، اس کے پھیرا لگانے کی کوئی بندھی ٹکی وضع نہیں رہی تھی، لیکن جب بھی وہ اس کی کار کو کالے لوسیا میں آتے ہوئے دیکھتی، اپنی کمر کو محراب کی طرح خم دیتی، اپنے کولھے کو بانکپن سے چڑھاتی، اور مسکرا دیتی۔ وہ ہمیشہ خود ہی کار سے باہر بھی نکلتا تھا، اور یہ دوسروں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھا، ان کے مقابلے میں جو اسٹیرنگ ویل پر جھکے جھکے ہی اس سے بات کرتے، یوں جیسے کسی کے ساتھ جنسی کرنے کے فیصلے پر ایک منٹ سے زائد خرچ کرنا ان کے وقت پر ناقابلِ برداشت بوجھ مسلط کرنے کے برابر ہو۔

اس کا نام مارتین تھا۔ شروع میں اسے خیال گزرا تھا کہ یہ کوئی فرضی نام ہے، لیکن ایک بار جب اس نے ابھی اس کے دام ہی چکائے تھے کہ کسی نے اسے اس کے موبائل پر فون کیا تھا، اور فاطن کو لائن کے دوسرے سرے پر ایک خرخراتی آواز اس کا نام لیتی ہوئی سنائی دے گئی تھی۔ آواز کسی سپاہی جیسی تھی۔ کسی صاحبِ اقتدار جیسی، کسی ایسے کی جسے حکم دینے کی عادت ہو۔ بعد میں اس نے مارتین سے پوچھا کہ فون پر کون تھا اور اس نے بتایا کہ اس کا باپ تھا، بارسلونا سے بول رہا تھا، یہ پوچھنے کے لیے کہ اسے اتنی دیر کیوں ہوگئی ہے، جیسے مارتین ابھی تک چھوٹا سا بالک ہی ہو۔ مارتین نے وضاحت کی کہ اس کے باپ کی دو شادیوں کی اولادوں میں وہ سب سے چھوٹی اولاد ہے۔ اس نے سر ہلایا اور فون کو علیحدہ رکھ دیا، ناگواری سے بڑبڑاتے ہوئے کہ بڈھا سٹھیا گیا ہے۔

اسے مارتین کا آخری نام معلوم نہیں تھا۔ کچھ معلوم تھا تو بس یہی کہ یونیورسٹی کمپلوتینسے میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے وہ ابھی حال ہی میں میڈرڈ منتقل ہوا ہے۔ وہ کیا پڑھ رہا تھا اس کی بات اس نے کبھی نہیں کی، اور اس نے اس ڈر سے پوچھی بھی نہیں کہ یہ اسے مراکش میں اپنے کالج کے زمانے کی زندگی یاد دلا دے گا اور وہ زندگی کے ان ایام کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی جب زندگی امید افزا توقع اور امکان سے لبریز تھی۔

ایک طرح سے فاطن کو یہ اچھا لگتا تھا کہ اسے معلوم نہ ہو کہ وہ کب اس کی طرف بھٹکتا ہوا آ نکلے گا۔ اس طرح وہ امید کے ساتھ آگے دیکھ سکتی تھی، اور اگر وہ آ نکلے گا، تو ہمیشہ کسی تحفے کے ساتھ، جسے وہ کھولے گی اور ہاتھ میں لے کر سراہ سکے گی۔ آنے میں جتنی دیر لگتی، تحفہ اتنا ہی زیادہ غیر متوقع

تعجب کا حال ہوتا۔ اور پھر یہ امکان بھی تھا کہ اگر وہ رات کو بہت دیر سے اس کے پاس آیا تو اس کا آخری گاہک ہوگا، اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ وہ اس کے ساتھ کتنی دیر تک رہتی ہے۔ اس سے اسے بری راتوں میں، جب بارش ہو رہی ہوتی یا جب دوسری لڑکیاں نوک جھونک کر رہی ہوتیں، بڑا سہارا ملتا۔ ہسپانوی لڑکیاں اکثر مراکشی یا رومینین یا یوکرینین لڑکیوں سے جھگڑتیں، لیکن یہ ایک بے فائدہ نوک جھونک تھی۔ علاقے میں ہر ہفتے ہی ایک نہ ایک نئی مہاجر لڑکی نمودار ہو جاتی۔

مارتین اسے ایک ہمسائے کی یاد دلا دیتا تھا جس پر وہ اپنے لڑکپن میں وقتی طور پر فریفتہ رہی تھی۔ اس وقت اسے اعادیر رہنے بھیج دیا گیا تھا کیونکہ اس کی ماں اسے رباط میں رکھنے کا خرچ نہیں برداشت کر سکتی تھی، اور پھر اس وجہ سے بھی کہ اس کے باپ کے بھاگ کھڑے ہونے کے بعد عدالت نے جو نان نفقہ اولاد کی دیکھ ریکھ کے لیے اس پر لاگو کیا تھا وہ بھی آ کر نہ دیا۔ فاطن چودہ سال کی عمر تک اسی ساحلی شہر میں رہی، تا آنکہ اس کے پستان پھول کر ڈی سائز کی انگیا میں سمانے کے قابل ہو گئے۔ برابر کے مکان میں رہنے والا غیر شادی شدہ آدمی اب بات بے بات اس کے گھر آنے لگا تھا، کبھی پیالہ بھر شکر مستعار لینے، کبھی گلاس بھر تیل۔ بس یہی وہ وقت تھا جب فاطن کی خالہ نے فیصلہ کر لیا کہ اس کے دارالسلطنت لوٹ جانے کا وقت آ گیا ہے۔

فاطن دوار الحاجہ کی کچی بستی میں اپنی ماں کے ساتھ رہنے آ گئی، اس قسم کی بستی میں جہاں کسکس کی تھالیاں سیٹلائٹ ڈشوں کے طور پر استعمال ہوتی تھیں۔ وہ وہاں چھ سال رہی — اور اس قلیل مدت میں اس نے کسی طرح ہائی اسکول پاس کر لیا تھا، کالج گئی تھی، خدا کو پایا تھا، اور اسلامی طلبا تنظیم میں بھرتی ہوئی تھی۔ اس کی بدقسمتی تھی کہ اس نے شاہ حسن کے بارے میں ایک اہانت آمیز فقرہ کسی چغل خور کی حد سماعت میں کہہ دیا تھا تاہم، ایک دوستانہ مفید اشارے کے طفیل، معجزانہ طور پر حراست میں لیے جانے سے بچ گئی تھی تو جب اس کے امام نے اسے ملک چھوڑ دینے کی تجویز دی تو وہ اس سے بحث نہیں کی تھی۔ اس نے وہی کیا جس کی ہدایت کی گئی تھی۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ جب ہسپانوی ساحلی پہرے داروں نے اسے اور دوسرے غیر قانونی مہاجرت کرنے والوں کو آ پکڑا تو اس کے امام صاحب پاس موجود نہیں تھے، اور نہ اس وقت وہ کہیں آس پاس موجود تھے جب اسے ہسپانیہ میں اپنا تحفظ آپ کرنا تھا۔ سو اب کسی کو یہ فیصلہ کرنے کا حق نہیں تھا کہ وہ مارتین سے مل سکتی ہے یا نہیں۔

Scanned with CamScanner

آج کی رات اچھی رہی تھی۔ اس نے کافی کما لیا تھا اور یہ بھی کہ مارتین ہی اس کا آخری گاہک تھا۔ وہ اس کی کار میں کود کر چڑھی اور مسافر والی طرف کے آئینے کو نیچے کیا، اپنے چہرے کو کلی ٹیکس سے رگڑ رگڑ کے خشک کیا اور اپنی لپسٹک دوبارہ جمائی۔ اس نے مارتین پر نگاہ ڈالی۔ اس کے ہلکے بھورے رنگ کے بال قبل از وقت جھڑنے لگے تھے، اور جب جذباتی ہو جاتا تو اس کے پتلے سے ہونٹ اور بھی باریک ہو جاتے۔ اس نے کسی گہرے رنگ کی پتلون اور ڈھیلی ڈھالی بٹنوں والی قمیص پہنی ہوئی تھی، جس میں عربی گلکاری کے حروف گہرے سرخ رنگ کے سمندر میں رقص کر رہے تھے۔ اس نے پوچھا کہ اس کا ارادہ کیا کرنے کا ہے۔

"بس باتیں،" وہ بولا، "کر سکتے ہیں؟"

"Como que no"، اس نے کہا۔

اس نے کار اسٹارٹ کی اور آہستہ آہستہ کالے لوسیا سے ہیورتاس کی طرف ڈال دی۔

قاطن نے اپنے سر کو سیٹ کی پشت پر ٹکا دیا اور اپنی ٹانگیں پھیلا لیں۔ اس کے بیر اونچی ایڑی کے جوتوں میں بڑی دیر تک کھڑے رہنے سے دُکھنے لگے تھے۔ اونچی ایڑی کا عادی ہونے میں اسے اتنی ہی مشکل پیش آئی تھی جتنی اونچے اسکرٹ کی عادت ڈالنے میں۔ اس سے پہلے، وطن میں، وہ یا فلیٹس پہنتی تھی یا سنیکرز، ٹخنوں تک کا اسکرٹ، اور ایک استعمال شدہ سویٹر۔

"ہاں، تو تم کہاں کی ہو؟"

"ربالکی۔"

"میرا خیال تھا کہ کاسابلانکا سے آئی ہو۔"

"اگر تم چاہو تو میں کاسابلانکا کی ہو سکتی ہوں۔" وہ ہنسی، تاکہ اسے پتا چل جائے کہ یہ گاہک پھنسانے کا ایک فقرہ ہی ہے، ایسی چیز نہیں جو وہ اس سے سنجیدگی کے ساتھ کہہ سکے۔ وہ چاہتی تھی کہ مارتین کو معلوم ہو جائے کہ وہ اسے دوسروں سے مختلف سمجھتی ہے۔

ایک بغلی گلی کے پاس آ کر اس نے کار روک دی۔ وہ خاموش بیٹھی سڑک کے شراب خانوں سے آنے والی روشنیاں دیکھتی رہی، یہ جاننے کی کوشش کرتی رہی کہ لاواپیس کے لحاظ سے، جہاں وہ رہتی تھی، وہ اس وقت کہاں ہو سکتے تھے۔ وہ اپنا کافی وقت سڑکوں پر گزارتی تھی، اس کے باوجود میڈرڈ

سے اچھی طرح واقف نہیں تھی۔ جب سے یہاں وارد ہوئی تھی، اس نے بہت کچھ نہیں دیکھا تھا۔ صرف سڑکیں، اپنا اپارٹمنٹ، اسپتال، اور دکانیں۔

مارتین نرمی سے بولا: "میڈرڈ میں کب سے ہو؟"

"تین سال، کم و بیش۔"

"شرط باندھ سکتا ہوں کہ تمھارے بہت سے باقاعدہ گاہک ہیں۔"

"بس چند ایک ہیں۔ بہت زیادہ نہیں۔"

"انھیں پتا نہیں کہ کس چیز سے محروم رہ رہے ہیں۔"

"بھلا وہ کیا چیز ہے؟"

اس نے اپنے گھٹنے کے گڑھے پر اپنا انگوٹھا پھیرا۔ "اتنی ساری چیزیں،" وہ بولا۔ "مجھے تمھاری جلد کی مہک بھاتی ہے — کالے زیتون کی طرح تمکین۔" اس نے فاطن کے بالوں کی ایک لٹ اپنی انگلی کے گرد لپیٹی، پھر اسے تیزی سے بل کھا کر کھل جانے دیا، اپنی انگلیاں اس کے رخساروں کی ہڈیوں کے ساتھ ساتھ پھرائیں، اس کے دائیں پستان کو اپنی مٹھی کی کپی میں بھر لیا۔ "اور تمھارے دودھ — آم کی طرح پکے پکے۔"

"تم تو مجھے پکوان بتائے دے رہے ہو،" وہ بولی۔

"تم چاہو تو مجھے اہل نظر کہہ سکتی ہو۔"

اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا، اور پہلی بار اسے خیال گزرا کہ وہ جسے معصومیت کی جھلک سمجھی ہے کہیں کچھ اور نہ ہو — چنچلتا، حتیٰ کہ شرارت کی جھلملاہٹ۔ "ایک بات ہے جو میں بڑی دیر سے تم سے پوچھنا چاہ رہی ہوں،" وہ بولی۔ "تمھارے والد کے بارے میں۔ کیا وہ سپاہی ہیں؟"

"وہ سؤر ہے۔"

"تم انھیں سؤر کیوں کہہ رہے ہو؟"

"کیونکہ وہ فاشسٹ ہے،" وہ بولا۔ بولتے ہوئے اس نے اپنا سر ہیڈ ریسٹ پر ٹکا دیا۔ اس نے اپنے باپ کے بارے میں بتایا کہ ایک سبکدوش فوجی لیفٹیننٹ ہے جو جوانی میں فرانکو کے ماتحت رہ چکا

ہے۔ یہ چھوٹی موٹی خاندانی روایت سی تھی، مارتین کا دادا بھی فرانکو کی ماتحتی میں کام کر چکا تھا۔ جنرلیسمو (Generalissimo) کا نام سنتے ہی فاطن میں اپنے نانا کی یادیں کلبلانے لگیں، ایک تحریر یفی [1] جس کی بینائی شمالی علاقے میں ہونے والی بغاوت کے دوران جاتی رہی تھی۔ یہ زہریلی سرڈ گیس کا نتیجہ تھا، اس نے اپنے بچوں کو بتایا تھا، اور وہ اپنی باقی ماندہ زندگی ایک بندوق پانے کے لیے گڑگڑاتا رہا تھا تاکہ سارا قصہ ہی پاک کر دے۔ مگر اسے سرطان ہی سے موت آئی۔ لیکن یہ فاطن کے پیدا ہونے سے دو سال پہلے کی بات ہے۔

مارتین نے بتایا کہ اس کے باپ کو مہاجرین سے نفرت ہے۔ اس نے اپنا سر ہلایا۔ "لیکن میں اُس کی طرح نہیں ہوں،" اس نے کہا۔ "میں تمھیں پسند کرتا ہوں۔"

"اچھا، واقعی؟" وہ بولی، اپنی اُسی "یہ سب میں پہلے بھی سن چکی ہوں" والی آواز میں۔

مارتین نے اس کے طنز کا برا نہیں منایا۔ "میں تمھاری مدد کرنا چاہتا ہوں،" اس نے فاطن کے بازو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ بولا کہ اسے مہاجرت کے کاغذات دلوانے میں اس کی مدد کرے گا، کہ اسے قانون سے نپٹنے کی صورتوں کا علم ہے، کہ وہ قانونی طور پر بھی رہ سکتی ہے، کہ اسے سڑکوں پر پڑے رہنے کی ضرورت نہ ہوگی، کہ اسے باقاعدہ ملازمت مل سکتی ہے، ایک نئی زندگی شروع کر سکتی ہے۔

فاطن نے کبھی کسی سے اتنے مبالغہ آمیز وعدے کرنے کی توقع نہیں کی تھی، چنانچہ اسے نہیں معلوم تھا کہ جیسے یا اس کا شکریہ ادا کرے۔ ایک لمحے کے لیے اس نے تصور کیا کہ یہاں عام زندگی کیسی ہوتی ہوگی، جس میں اسے مردوں کو نہ بھگتنا پڑے، رات کو قرینے سے سونا ممکن ہو سکے، کہ ہر عضو پر

---

[1] ریفی: مراد ریف کا رہنے والا جو مراکش کے شمال مشرقی حصے میں واقع پہاڑی علاقہ ہے اور جہاں بربر قبائل کی اکثریت ہے۔ ریف کا علاقہ 1921 میں ہسپانوی فوج کے خلاف اٹھنے والی مسلح جدوجہد کا مرکز تھا جس نے نہ صرف شمالی افریقہ میں ہسپانوی اور فرانسیسی نوآبادیاتی تسلط کے خلاف ایک بڑی تحریک کی شکل اختیار کی، بلکہ بالواسطہ طور پر خود اسپین کی سیاست میں ہلچل پیدا کر کے ہسپانوی بادشاہت کے خاتمے کا باعث بنی۔ اس مسلح مزاحمت کی قیادت ملائے عبدالکریم (1880-1963) نے کی تھی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی گوریلا جنگ کی حکمت عملیوں نے ویت نام کے رہنما ہوچی منہ اور چین کے ماؤزے تنگ کو بھی متاثر کیا تھا۔ (ا۔ک۔)

Scanned with CamScanner

پولیس کی فکر کیے بغیر اپنے اردگرد دیکھنا ممکن ہو سکے۔ وہ اس سب کی قیمت پر غور کرنے لگی۔ ظاہر ہے، اسے زمانوں پہلے ہی یہ سبق مل گیا تھا کہ کوئی چیز مفت نہیں ملتی۔ اس کی حیران نگاہی کو دیکھ کر وہ ہنس پڑا۔ "لیکن پہلے، مجھے اپنے بارے میں تو بتاؤ۔ رباط میں کہاں رہتی تھیں؟"

اس نے شانے اُچکائے۔ "اپارٹمنٹ میں۔"

"اپنے والدین کے ساتھ؟" اس نے سوال کیا۔

"اپنی ماں کے ساتھ۔"

"بھائی بہن ہیں؟"

"نہیں۔"

"یہ غیر معمولی بات ہے، نہیں؟" اس نے پوچھا "میرا مطلب ہے، تنہا اولاد ہونا، تمہارے ملک میں۔"

"ہو سکتا ہے۔"

"اور کیا تم وہ کڑھائی والے کپڑے پہنتی تھیں؟ کیا کہتے ہیں انھیں؟ قفطان؟"

"سچ پوچھو تو نہیں۔"

لگا جیسے اسے مایوسی ہوئی ہو اور وہ بیچ اسٹیرنگ ویل کو دیکھتے ہوئے اپنے ناخن کترنے لگا، دانتوں سے مردہ کھال کے پارچے ادھیڑنے لگا۔

"یہ سارے سوالات آخر کیوں؟" اس نے پوچھا۔ "کیا تم میرے بارے میں کوئی ٹرم پیپر لکھ رہے ہو؟" اس نے مذاقاً کہا۔

اس نے اپنا سر پیچھے کی طرف پھینکا اور ہنس دیا۔ "یقیناً نہیں،" اس نے کہا، چپکے سے ہاتھ اس کی ران پر سے نیچے کی طرف کھسکاتے ہوئے۔ اس نے کنڈوم کی تلاش میں اپنے بیگ کو ٹٹولنا شروع کیا اور اسے معلوم ہوا کہ ایک بھی باقی نہیں بچا ہے۔ جب اس نے اسے بتایا تو وہ بولا کہ کار کے گلو کمپارٹمنٹ میں پڑے ہیں۔ اس نے کمپارٹمنٹ کھولا اور، وہاں، سی ڈیز، نقشوں اور گیس اسٹیشن کی رسیدوں کے درمیان قرآن کا ایک نسخہ پڑا پایا۔

"یہ کیا ہے؟" فاطن نے بے ساختہ سیدھے بیٹھتے ہوئے اور کتاب کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر

Scanned with CamScanner

پوچھا۔

"اسے ہاتھ مت لگاؤ،" وہ بولا، اور اُسے واپس رکھ دیا۔

"کیوں؟ تمھارا ہے؟"

"ہاں، میرا ہے۔"

اس کی آنکھ جھپکی۔ اس کے لہجے کی رکھائی ایسی چیز نہیں تھی جس کے تجربے کی وہ عادی رہی ہو۔ "تم اسے اپنے گلوکمپارٹمنٹ میں کیوں رکھے ہوئے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"میں بس اسے پڑھ پڑھا رہا ہوں،" وہ بولا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے بالوں کو پیار سے سہلایا۔ "اب اس سے فارغ نہ ہو لیا جائے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور کنڈوم اس کی طرف بڑھا دیا۔ مردوں سے اپنے تجربے میں اس نے بہت پہلے ہی یہ سمجھ لیا تھا کہ اس وقت بھی جب وہ کہتے کہ صرف بات کرنا چاہتے ہیں، وہ اس کے ساتھ ساتھ ہمیشہ ہی کچھ کارروائی بھی چاہتے تھے۔ شاید مارتین بھی ان سے مختلف نہیں تھا۔

جب کارروائی ختم ہوئی تو اس نے اپنے منی اسکرٹ کو درست کیا اور اپنی کارڈرائے کی جیکٹ کے بٹن بند کیے۔ مارتین کے سوالوں اور مدد کی پیشکش نے اسے ناگہانی آ لیا تھا؛ وہ اس کی خواہش جماع سے کافی دل شکنی محسوس کر رہی تھی۔ ایک بالکل ویسی ہی اداسی جو اس نے اپنے بچپن میں محسوس کی تھی جب اس نے دریافت کیا تھا کہ ریشم کا وہ کیڑا جسے اس نے جوتوں کے ڈبے میں پالا پوسا تھا اور جسے بڑے پیار سے شہتوت کے پتے کھلائے تھے، مر گیا ہے، اس کی تمام تر دیکھ بھال کے باوجود۔ وہ سارا دن روتی رہی تھی، حیران کہ وہ اسے زندہ رکھنے کے لیے جو کچھ کیا تھا اس کے سوا اور کیا کر سکتی تھی۔ تا آنکہ اس کی خالہ گھر لوٹی اور اسے بتایا کہ کبھی کبھی ریشم کے کیڑوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے — تمام تر احتیاط اور دیکھ بھال کے باوجود وہ مر ہی جاتے ہیں۔

اس نے انجن اسٹارٹ کیا۔ "اگر چاہو تو تمھیں اب گھر پہنچا دوں۔"

اس نے دروازہ کھولا اور کار سے اتر گئی۔ "میں ٹیکسی لے لوں گی۔"

جب فاطن اپنے اپارٹمنٹ کی سیڑھیاں پھلانگ رہی تھی، کوڑے کرکٹ کے ٹرک اپنے گشت لگا

رہے تھے۔ اس نے ایک ٹرک والے کو دوسرے پر مراکشی عربی میں چلاتے ہوئے سنا۔ اپنی نوکری خالی کرتے ہوئے وہ اسے بتا رہا تھا کہ 565 میں جو خاندان رہتا ہے ان کے یہاں حال ہی میں ولادت ہوئی ہے۔ لوگوں کا کوڑا کرکٹ اٹھاتے ہوئے یہ کارکن ہر کسی کی زندگی کے بارے میں سب کچھ جان جاتے تھے۔ اکثر فاطن کو بھی اپنے بارے میں ایسا ہی معلوم ہوتا تھا، یوں جیسے لوگوں کے راز اس کو سونپ دیے گئے ہوں اور اس کا کام انہیں ٹھکانے لگانا ہو۔

فاطن کو اپنی ہم کمرہ، بتول، کچن میں ناشتہ کرتی ملی۔ بتول گران ویا میں ایک ہسپانوی جوڑے کے یہاں آیا کا کام کرتی تھی، اور وہاں ساڑھے چھ بجے سے پہلے پہنچنے کے واسطے، کیونکہ گھر کی مالکن کو اُسی وقت اس کی ضرورت ہوتی تھی، اسے بڑے سویرے کی بس پکڑنی پڑتی تھی۔ کبھی کبھار بتول اپنے مالکوں کی بابت بات کرنے کی خواہش کو دبا نہ پاتی، کہ بیوی ڈپریشن کی مریض ہے، کہ شوہر غسل خانے میں اخبار پڑھنا پسند کرتا ہے، پیشاب کے دھبے فرش پر چھوڑ جاتا ہے۔ لیکن فاطن کو شوہر کے بارے میں سننا پسند نہیں تھا۔ اپنے پیشے میں مردوں کی بابت سن سن کر اس کا پیٹ پہلے سے بھر گیا تھا۔

بتول مراکش کی تھی، جہاں اس کی دو چھوٹی بہنیں یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھیں، ایک بھائی فوٹوگرافر کا کام کرتا تھا، اور دوسرا ہنوز ہائی اسکول میں تھا۔ یہ ان مہاجرین میں سے تھی جو قسطوں پر رقم بھیجتے تھے — وہ اپنے بہن بھائیوں کی مدد کے لیے ڈاک کے ذریعے باقاعدہ چیک بھیجتی تھی۔ اس کے علاوہ، سال کے گیارہ مہینے وہ کسی قلاش کی طرح رہتی اور پھر اگست میں ہوائی جہاز سے گھر جاتی اور اپنے بینک کے اکاؤنٹ میں جو کچھ بچا ہوتا خرچ کر ڈالتی۔ ظاہر ہے اس کے سالانہ دوروں کو دیکھ کر لوگوں کو یہی خیال ہوتا کہ وہ بڑا مال بنا رہی ہے، چنانچہ وہ ہمیشہ فرمائشوں کی بڑی لمبی فہرست ہاتھ میں اور پریشانیوں کی تازہ لکیریں ماتھے پر لیے واپس آتی۔

مراکش میں بتول ہرگز فاطن کے ساتھ نہ رہی ہوتی، لیکن یہاں صورتِ حال مختلف تھی۔ یہاں بتول وطن کی طرح ناز نخرے نہیں کر سکتی تھی۔ وہ فاطن کے کمرے میں اس لیے اٹھ آئی تھی کہ اس سے کم کرائے پر کوئی اور جگہ مل نہیں سکتی تھی، جس کی وجہ سے گھر اور زیادہ رقم بھیجنا ممکن تھا۔

فاطن نے اپنا تھیلا اور چابیاں کاؤنٹر پر ڈال دیں۔ ''صباح الخیر۔''

''صباح الخیر،'' بتول نے جواباً کہا۔ ''تم کل رات دروازہ تالا لگائے بغیر چلی گئی تھیں۔''

''اچھا؟ مجھے افسوس ہے۔''

''تمھیں زیادہ احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ کوئی آسانی سے اندر آ سکتا تھا۔''

''معاف کرنا،'' فاطن نے کہا، ''ان دنوں میری توجہ بٹی ہوئی ہے۔''

بتول نے سر کو جنبش دی اور اپنے حصے کا مکھن لگا توس ختم کیا۔ اس نے باقی ماندہ کافی کھڑے کھڑے ہی پی ڈالی۔ پھر اس نے حب رشاد کے چند دانے پلاسٹک کی تھیلی میں ڈال کر اسے بڑی مضبوطی سے بند کیا اور تھیلی کو اپنے جھولے میں رکھ لیا۔

''یہ کاہے کے لیے ہیں؟'' فاطن نے پوچھا۔

''آنا کے لیے،'' بتول نے جواب دیا۔ آنا بچی تھی جس نے لڑکھڑا کر چلنا بس شروع ہی کیا تھا، تینوں بچوں میں سب سے چھوٹی جن کی دیکھ بھال وہ والدین کے کام پر جانے کے اوقات میں کرتی تھی۔ ''اسے کچھ زکام ہو گیا ہے۔ سو میں نے سوچا کہ اسے حب رشاد دودھ میں اونٹا کر پلا دوں گی۔''

''تم کاہے کو پریشان ہو رہی ہو؟'' فاطن نے پوچھا۔

بتول نے اپنے جھولے کی زپ بند کی۔

''یقیناً آنا کی ماں پسند نہیں کرے گی کہ تم اسے یہ سب پلاتی پھرو،'' فاطن نے کہا۔

''تم کیا جانو وہ کیا پسند کرتی ہے اور کیا نہیں؟''

''وہ تم پر ہنسے گی اور یہ سب باہر پھینک دے گی۔''

''ہنستے تو لوگ تم پر ہیں — جس طرح تم اپنا جسم بیچتی پھرتی ہو۔''

فاطن کو اپنا غصہ اپنی تھکن پر غالب آتا ہوا محسوس ہوا۔ بتول کو کمرہ شریک بنانے کے معاملے میں وہ چوکنی رہی تھی۔ اس نے ایک افواہ سنی تھی کہ وطن میں جب بتول کو پتا چلا کہ اس کا شوہر، جو ایک ٹرک ڈرائیور تھا، مکناس کی ایک ورزن کے ساتھ اُس سے جنسی بے وفائی کر رہا ہے، تو اس نے اس کے سوپ میں خواب آور تکیہ ملا دی تھی اور سوتے میں حنا سے اس کے گالوں پر X کے نشان بنا دیے تھے، اور یوں دنوں تک اسے رسوا کیا تھا۔ فاطن نے آخر کار اسے اپنا ہم کمرہ بنا لیا تھا کیونکہ اسے کسی ایسی کی ضرورت تھی جو دن میں کام پر جاتی ہو، ایسی جس کے ساتھ اسے بہت زیادہ وقت نہ گزارنا پڑے۔

''میں تمھیں یہاں رہنے پر مجبور نہیں کر رہی ہوں،'' فاطن نے کہا۔ ''بہ خوشی کہیں اور منتقل ہو

سکتی ہو۔"

دروازہ زور سے پیچھے بند کرتے ہوئے بتول چلی گئی۔

عام طور پر گھر لوٹنے کے بعد فاطن نہاتی، دو بجے دوپہر تک پڑی سوتی رہتی، اور پھر ایک سینڈوچ لے کر پارک میں آ جاتی اور عمر رسیدہ جوڑوں کو کبوتروں کو دانہ ڈالتے یا نوجوان جوڑوں کو بنچ پر بیٹھے چوما چاٹی کرتے دیکھتی رہتی۔ اگر موسم زیادہ خنک ہوتا تو وہ ٹیلی وژن دیکھتی یا خریداری کے لیے نکل جاتی۔ لیکن آج اس کا معمول ٹوٹ چکا تھا۔ وہ سو نہ سکی۔ کچھ دیر تک چھت کو گھورتی رہی اور پھر مڑ کر اپنے نائٹ اسٹینڈ پر نظر ڈالی، جہاں جیبی قرآن رکھا ہوا تھا، گرد کی باریک سی تہہ اس پر جمی ہوئی تھی۔ اسے اپنے کالج کے وہ دن یاد آئے جب اس نے حجاب پہننے کا فیصلہ کیا تھا اور ملنے والی ہر عورت کو ایسا ہی کرنے کی تلقین کرتی تھی۔ وہ کتنی بے وقوف واقع ہوئی تھی۔

اسے اپنی بہترین دوست نورا کا خیال آیا، جو پیچھے ریاط میں تھی، اور سوچا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہوگا، آیا حجاب کی پابند رہی ہوگی یا اتار دیا ہوگا۔ نورا شاید اب بھی پہنتی ہو۔ وہ مالدار تھی، اسے ایمان رکھنے کی آسائش میسر تھی۔ لیکن پھر، فاطن نے سوچا، ایمان نہ رکھنے کی آسائش بھی تو نورا کو میسر تھی! شاید اسے حجاب کچھ زیادہ ہی مانع لگا ہو اور آخر میں تج دیا ہو، تاکہ اپنے ڈزائنر کپڑوں کی نمائش کر سکے۔ پیسہ ہو تو یہی ہوتا ہے۔ اس سے آدمی کو چیزوں میں پسند کا اختیار مل جاتا ہے۔

اس نے نورا کو اپنے ذہن سے دور بھگانے کی کوشش کی۔ اس دوستی کی اسے بڑی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ نورا کے باپ نے، جس نے ان کی دوستی کو بڑی تاریک نظر سے دیکھا تھا، اپنا رسوخ استعمال کر کے اسے یونیورسٹی سے نکلوا دیا تھا۔ اگر یہ اس کا کیا دھرا نہ ہوتا تو ممکن تھا فاطن کالج پاس کر لیتی، برہمی کے اس لمحے میں اسے اتنا غیر محتاط نہیں ہونا چاہیے تھا، شاید اسے شاہ کے بارے میں وہ سب نہیں کہنا چاہیے تھا، شاید اس نے پڑھائی ختم کر لی ہوتی اور کہیں نوکری مل جاتی، شاید... شاید... شاید...

وہ بستر سے نکلی اور وشیم کی ایک ٹکیہ لینے غسل خانے گئی۔ یہاں اس زندگی کو کسی نہ کسی طرح گزارنے کے لیے ضروری تھا کہ بہت زیادہ سوچ بچار نہ کیا جائے۔ باورچی خانے میں آ کر اس نے پانی

کا گلاس بھرا۔ اس کی نظر بتول کے کیلنڈر پر جا پڑی، جو ریفریجریٹر کے پہلو میں ٹیپ سے چپکایا گیا تھا۔ عید کی چھٹیاں آنے والی تھیں اور بتول نے تاریخ پر دائرہ کھینچ دیا تھا، شاید اس لیے کہ گھر والوں کو چیک بھیجنا یاد رہے۔ اس بات نے فاطمہ کو خوشیاں منانے کے بارے میں حسرت آمیز یادِ ماضی سے بھر دیا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ ناسٹلجیا محسوس کرنے کے لیے اس کے پاس کچھ زیادہ نہیں تھا۔ جب وہ اپنی ماں کے پاس واپس رباط چلی آئی تھی تب عید کا مطلب تھا کہ رات کے وقت کھانا تھوڑا زیادہ مل جائے۔ نئے کپڑوں کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا، نہ بھیڑ کے بھنے گوشت کا، نہ جیب میں چمک دار سکوں کا جن کے لمس سے محظوظ ہوا جا سکے۔ اس کے باوجود، ان خاص موقعوں سے اُسے ایک مخصوص انسیت تھی کیونکہ کم از کم عید کے دن اس کی ماں کو کام پر نہیں جانا پڑتا تھا اور دونوں ماں بیٹی سارا دن ایک دوسرے کے ساتھ گزار سکتی تھیں۔ اس نے ان یادوں کو ذہن سے بزور خارج کر دیا اور پیر گھسیٹتی ہوئی ملاقاتی کمرے میں آ گئی۔

وہ اس انتظار میں صوفے پر لیٹ گئی کہ ویلیم اپنا کام کرے۔ ٹی وی پر اونٹوں کے بارے میں کوئی پروگرام آ رہا تھا، اور وہ نیم بستہ آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی، جب کہ ہسپانوی میں تبصرہ کرنے والا اس جانور کی عام زاد بوم کے بارے میں بتاتا رہا، اس کی کٹھن سے کٹھن حالات کو جھیلنے کی صلاحیت، اس کا خانہ بدوش طرزِ حیات، اور اس کے متعدد استعمال، جیسے بوجھ ڈھونا، گوشت اور دودھ مہیا کرنا، حتیٰ کہ اس کا گوبر بھی، جسے ایندھن کے طور پر جلایا جا سکتا ہے۔ جلد ہی فاطمہ کے پپوٹے بوجھل ہو گئے اور اسے نیند آ گئی۔

جب ایک ہفتے بعد مارٹین دوبارہ نمودار ہوا، تو اسے دیکھ کر شادمانی کا وہ احساس نہیں ہوا جو اس سے واقفیت کے گزشتہ مہینوں میں ہمیشہ ہوا تھا۔ وہ کار سے باہر آیا اور اپنے ساتھ آنے کے لیے کہا، لیکن وہ ہچکچائی۔ "کیا ہوا؟" اس نے دریافت کیا۔

اس نے شانے اُچکائے، اور آنکھیں دوسری کاروں کی تلاش میں اِدھر اُدھر منڈلانے لگیں۔ لیکن وہ وہاں سے نہیں ٹلا۔ "تم کیا چاہتے ہو؟" فاطمہ نے پوچھا۔

"تمھیں معلوم نہیں؟" وہ ہنس پڑا۔ وہ یہ نہ جان سکی کہ ہنسی اس کا ساتھ دینے کے لیے تھی یا اس پر تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا، جسے فاطمہ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کے پیچھے پیچھے کار کی طرف چل دی۔ اس بار پھر وہ بیورتاس کی طرف چل پڑا۔ سی ڈی پلیئر پر شاب خالد کا نغمہ بج رہا تھا،

Scanned with CamScanner

اور اس کے بول سنتے ہوئے وہ سوچنے لگی کہ آیا مارتین کو ان کا مطلب معلوم ہے۔

چند منٹوں بعد مارتین نے پوچھا کہ وہ کہاں پلی بڑھی ہے، جس طرح پچھلی بار دریافت کیا تھا، جیسے تحقیق کر رہا ہو کہ اس کے جوابوں میں کوئی ردوبدل تو نہیں ہوا ہے۔ اس بار، اسے کوئی خوش فہمی نہیں تھی کہ وہ کیا جواب چاہتا ہے۔ اس نے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ "کاسابلانکا،" اس نے کہا۔

اسے اپنے پہلے بیت الخلا کا خیال آیا، ہسپانیہ میں اس کا پہلا ہفتہ۔ کشتی کا وہ کپتان جو اسے یہاں لایا تھا اس نے طریقہ تک جاننے کی پروا نہیں کی تھی؛ جب وہ ساحل سے اتنے فاصلے پر آ گئے جسے بقیہ مسافت تیر کر عبور کر سکتے تھے، تو اس نے کشتی کا منھ پیچھے کی طرف کر دیا تھا۔ وہ بشتم پشتم کنارے پر پہنچ گئی تھی، جہاں ہسپانوی گارڈ یا پولیس ان کی گھات میں بیٹھی تھی۔ بعد میں، حراست کی کوٹھری میں، اس نے ایک پہرے دار کو دیکھا جو اسے گھور رہا تھا۔ یہ جاننے کے لیے کہ وہ اس سے معاملہ کرنا چاہتا ہے، فاطمہ کو ہسپانوی زبان جاننے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے معاً یاد آ گیا کہ پیچھے رباط کی خفیہ مسجد میں اس کے امام نے کیا کہا تھا — انتہائی حالات بعض اوقات انتہائی اقدام کے متقاضی ہوتے ہیں۔

پہرے دار اسے ایک شخصی معائنے کے کمرے میں لایا، باقی سب سے دور۔ اس نے اس کا اسکرٹ اوپر کیا اور تمامت وحشیانہ لاپروائی سے اس کے بدن میں در آیا۔ وہ ابھی تک وہی سرجیکل دستانے پہنے ہوئے تھا جو اس دن آنے والی مہاجرین کی جماعت کے معائنے کے لیے اس نے پہنے تھے۔ اور، اس تمام عرصے میں، وہ اسے "مخفر" کہہ کر پکارتا رہا۔ اور اس نے کچھ اور لفظ بھی کہے، لفظ جو وہ سمجھ نہ سکی، لیکن جن کی اب وہ عادی ہو گئی تھی۔ آنے والے سالوں میں، تمام فحاشیوں کو سننے کے لیے اس کے پاس وقت تھا، وہ جنھیں، اگر اس نے اپنی سند حاصل کر لی ہوتی، تو شاید تنفر سے حرم کی کنیز کے خوابوں سے تعبیر کیا ہوتا۔ اب بہرکیف وہ ایک مخزن تماش سے زیادہ نہیں تھے جنھیں اس نے منھ زبانی یاد کر لیا تھا اور اگر روزی کمائی تھی تو انھیں برداشت بھی کرتا تھا۔

"تم کہاں پلی بڑھیں؟" مارتین نے پوچھا۔

"ایک سوروش گھرانے میں۔"

"اپنے والدین کے ساتھ؟"

"مجھے اپنے باپ کو بہت زیادہ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ میں نے اپنے سارے دن حرم میں گزارے۔"

"اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ؟"

"اپنی چھ بہنوں کے ساتھ۔ انھوں نے ہی مجھے مردوں کو مسرت پہنچانے کے فن کی تربیت دی۔"

مارتین زیرِلب ہنسنے لگا۔ وہ دیکھ سکتی تھی کہ وہ اس کھیل سے بڑی فرحت محسوس کر رہا ہے۔

"تم میرے ہی پاس کیوں آتے ہو؟" فاطن نے سوال کیا۔ "بہتیری اور لڑکیاں بھی تو ہیں۔ جیسے ازابیل، اور ۔۔۔"

"اس ملک کی عورتیں،" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "وہ نہیں جانتیں کہ مرد کو کیسے خوش کرنا چاہیے، کم از کم اس طرح نہیں جس طرح تم عرب لڑکیوں کو آتا ہے۔"

فاطن کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس کا جی چاہا کہ تھپڑ مار دے۔

"میں پڑھتا رہا ہوں،" وہ بولا۔ "مرد کے لیے عورتوں کے کیا فرائض ہیں، وغیرہ وغیرہ کے بارے میں۔ بڑا دلکش موضوع ہے۔"

اس نے اس کے صاف، کھلے چہرے کو اشتیاق سے بھڑکتے ہوئے دیکھا جب وہ اسے بتانے لگا کہ وہ اس کے اور اس کے لوگوں کے بارے میں کچھ جانتا ہے۔ اور یہی اس کی مصیبت کی جڑ تھی۔ سب کچھ پڑھ لینے، فہمیدگی کے تمام دعووں کے باوجود، وہ اپنے باپ سے ذرہ برابر بھی مختلف نہیں تھا۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا۔

وہ خاموشی سے ٹکٹکی باندھے مارتین کو دیکھتی رہی، اس کوشش میں کہ خود کو مارتین کی نظر سے دیکھ سکے، جس طرح وہ اسے نظر آتی دیکھنا چاہتا تھا۔ اگر وہ اس سے ملتے رہنا چاہتی ہے تو یہ وہ قیمت ہے جو اسے ہر بار چکانی ہوگی۔ جب وہ اس سے کہنے لگا کہ وہ مہاجرت کے کاغذات کے سلسلے میں اس کی مدد کرے گا، کہ وہ اس کی بہت پروا کرتا ہے، تو اس نے اپنی ہتھیلی اٹھا کر اسے رک جانے کو کہا۔

"مجھے تمھاری مدد کی ضرورت نہیں،" وہ بولی۔

اس نے اسے یوں دیکھا کہ فاطن کو محسوس ہوا وہ اس پر یقین نہیں کر رہا ہے، پھر کلام جاری

رکھا، جیسے اس کی مدد کرنے کے معاملے میں اس کی رضامندی کی ضرورت نہ ہو، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اس کے حق میں کیا بہتر ہے۔

"وقت ختم ہوا،" وہ بولی۔

اس نے اپنا بٹوا نکالا، اور اس کی مدد کی بابت اپنے منصوبے بتاتا رہا۔

"آج کے بعد سے، اس تمام گپ شپ کے پیسے زائد ہوں گے۔" قاطن نے مزید کہا۔

اس نے باتیں کرنا بند کیا۔ حیرانی سے بھنویں اوپر کیں، اور کچھ اور نوٹ دیے جو قاطن نے اپنی جیب میں رکھ لیے۔

"میرا خیال ہے اگلی مرتبہ کے لیے تمھیں کسی اور کو ڈھونڈ لینا چاہیے،" وہ بولی۔ اس نے کار کا دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔

دس دن ہو رہے تھے اور اس عرصے میں بتول ایک بار بھی قاطن کو نظر نہیں آئی تھی۔ ان کی تحت تو تو میں میں کے بعد بتول کے نظام الاوقات میں معجزانہ طور پر تبدیلی آ گئی تھی، کچھ یوں کہ بتول کے گھر سے نکل جانے کے چند منٹ بعد ہی قاطن وہاں پہنچتی۔ قاطن اندر آتی تو تو سٹر ہنوز گرم ہوتا، ریک پر ابھی ابھی دھلے برتنوں سے پانی ٹپک رہا ہوتا۔ ویک اینڈ کے آتے آتے قاطن نے کچھ کرنے کا فیصلہ کر ڈالا۔ وہ عید کے واسطے کھانا بنائے گی اور اس لیے، سونے کے بجائے، وہ دن کے زیادہ حصے باورچی خانے ہی میں کام کرتی رہی۔ بچپنے ماں کے ساتھ گھر پر پکوان بہت سادہ سے ہوتے تھے — فول کی پھلیاں اور زیتون کا روغن، رغیف اور چائے، روٹی اور زعتون، جسے کو کسکس، جو کچھ بھی اس کی ماں کی خریدنے کی اہلیت ہوتی۔ اب، جب قاطن جو چاہتی خرید سکتی تھی، اسے پتا نہیں تھا کہ وہ پکوان کیسے بنائے جن کی اپنی نوخیزی کے زمانے میں حریص ہوا کرتی تھی۔ بھیڑ کے سالن میں نمک زیادہ پڑ گیا اور سبزیاں کچھ جلی جلی سی ہیں، لیکن اس نے امید کی کہ بتول کو بری نہیں لگے گا۔ طعام کو مکمل کرنے کے لیے وہ نکڑ کی مراکشی بیکری سے بسطیلہ (pastilla) لے آئی، پھر میز سجا کر انتظار کرنے لگی۔

آخرکار جب بتول لوٹی تو ایک لمحے کے لیے ٹھہر گئی۔ اس کے ہاتھ ہنوز دروازے کے ہتھے پر تھے۔ پھر اس نے بڑے زور سے سانس باہر نکالی۔

Scanned with CamScanner

''تمھارا دن کیسا گزرا؟'' فاطن نے پوچھا۔

''تھکن سے چور۔''

''کیا آنا ابھی تک بیمار ہے؟''

''نہیں، اب بہتر ہے،'' بتول نے بتایا۔ ''لیکن اس کی ماں سارا دن بستر میں پڑی روتی رہی۔ وہ اپنے کام پر بھی نہیں گئی۔ بولی کہ وہ بہت موٹی ہے اور اس کا شوہر اب اسے نہیں چاہتا۔ تو بچوں کو اسکول لے جانے اور آنا کو سلانے کے بعد، میں نے اسے لنچ پکا کر دیا، اور اس کی دو ایک پتلونوں کی کمر بھی ذرا چوڑی کر دی تا کہ اسے اچھی طرح آ جائیں۔''

''خیر، اب تم آرام کرو۔ میں نے کھانا پکا لیا ہے،'' فاطن بولی۔

''آج رات تم کام نہیں کر رہیں؟''

''آج نہیں،'' فاطن نے کہا۔ ''آج عید ہے۔''

یوں لگ رہا تھا جیسے بتول کھانا کھانے کے بجائے سونا چاہتی ہو، لیکن اس نے شکریہ ادا کیا، منھ ہاتھ دھونے گئی، پھر میز پر آ کر بیٹھ گئی۔ فاطن نے اسے بھیڑ کے سالن کا وافر حصہ نکال کر دیا۔ بتول نے چکھا۔ ''ذرا نمک زیادہ ہو گیا ہے، پیاری،'' اس نے کہا۔

فاطن مسکرائی، اظہار صداقت پر متشکر۔

❁

گھر واپسی

پانچ سال تک عزیز اپنی گھر واپسی کے منظر کا تصور کرتا رہا تھا۔ اپنی فنتاسیوں میں، جنھیں اس نے بڑی احتیاط سے تشکیل کیا تھا، وہ ایک خوب دھوپ نکلے دن گھر واپس لوٹتا، بڑی کڑکڑاتی ہوئی سفید قمیص اور کالی پتلون پہنے، بال کریم لگا کر پیچھے کی طرف سنورے ہوئے اور مونچھیں ترشی ہوئیں۔ اس کی نئی نویلی

کار گھر والوں کے لیے تحائف سے چھت تک بھری ہوگی۔ جب وہ دروازے کی گھنٹی بجائے گا، اس کی بیوی اور اس کے عمر رسیدہ والدین مسکراتے چہروں سے اس کا استقبال کریں گے۔ وہ اپنی بیوی کو آغوش میں لے لے گا، اسے فرش سے اوپر اٹھائے گا، اور دونوں پھر کہنے لگیں گے، جیسا کہ فلموں میں ہوتا ہے۔ واپسی کے چند ہی دن بعد، وہ انھیں کاسابلانکا کے نادار محلے کے ایک بوسیدہ مکان سے نکال کر کسی ایسی جدید عمارت میں منتقل کر دے گا جو آئے دن شہر میں نمودار ہوتی رہتی ہیں۔

لیکن مراکش واپسی کی تاریخ جوں جوں قریب آتی گئی عزیز کو لگا کہ اسے اپنے خوابوں کی تفصیلات میں کچھ ردوبدل کرنا ہوگا۔ اس نے کسی جدید ڈھب کی کار میں واپسی کا تصور کیا تھا، لیکن اب اسے خیال آیا کہ کار کا سفر غیر عملی ہوگا۔ اس کے علاوہ، اسے یہ بھی شک تھا کہ اس کی چرخ چوں فوکس ویگن میڈرڈ سے کاسابلانکا کی آٹھ سو کلومیٹر کی مسافت طے کرنے کی تاب بھی لا سکے گی۔ چنانچہ کار سے سفر کرنے کے بجائے اس نے رائل ایر مراکو کی ایک پرواز میں اپنی نشست محفوظ کرا لی تھی۔ بدتر یہ تھا کہ گھر والوں کی اپارٹمنٹ کے دروازے پر اپنی پذیرائی کی جو خیالی تصویر اس نے بنائی تھی وہ مسخ ہونے لگی تھی۔ اس کا باپ اس کی غیر حاضری میں مر چکا تھا، اور اب اس کی ماں اور بیوی ساتھ اکیلی رہ رہی تھیں۔ اسے اپنی بیوی کے چہرے کا تصور اسی آسانی سے کرنے میں بھی دقت ہو رہی تھی جس سے وہ پہلے کر لیا کرتا تھا۔ اس کی یاد میں وہ دبلی پتلی اور اس کے مقابلے میں کہیں پست قد تھی، لیکن وہ کوشش کے باوجود اس کی آنکھوں کا رنگ یاد نہ کر سکا، کہ سبز بھورا تھا یا سرمئی بھورا۔

ان ڈھیل یقینیوں کے باعث اس کے چند دن شدید دباؤ کی کیفیت میں گزرے۔ وہ اپنی پرواز سے تین گھنٹے پہلے ہی برجاس ایر پورٹ پہنچ گیا۔ بار بار اپنے پاسپورٹ اور ملازمتی ویزے کا یہ یقین کر لینے کے لیے معائنہ کیا کہ آیا اس سفر سے لوٹنے پر ہسپانیہ میں دوبارہ داخل ہونے کے لیے صحیح حالت میں ہیں۔ اور جب ہوائی جہاز میں سوار ہو گیا تو وہ ہلکا پھلکا کھانا جو گھنٹہ بھر لمبی پرواز کے دوران دیا گیا تھا کھا نہ سکا۔ اس نے اپنا کسٹم کا ڈکلیریشن فارم ملتے ہی بھر ڈالا، بار بار جانچ پڑتال کی کہ آیا اس نے اپنے پاسپورٹ سے معلومات بالکل صحیح صحیح نقل کی ہیں۔

آخر کار جب جہاز پرواز کرتا ہوا کاسابلانکا کے ہوائی اڈے پر پہنچا تو اس نے اپنی کھڑکی سے باہر نظر ڈالی، ساحلوں کو، فیکٹریوں کو، کاروں سے کھچا کھچ بھری سڑکوں کو، مسجد شاہ حسن کے مینار کو

دیکھا، لیکن مدینے کے محل وقوع یا عرب لیگ پارک کے گنبد کا تعین نہ کر سکا۔ جب جہاز نیچے اُترنے لگا تو اس نے اپنی نشست کے ہتھوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

محمد خامس ایرپورٹ، کاسابلانکا، میں عزیز کی یہ پہلی آمد تھی۔ وہ طنجہ سے ایک پھولن کشتی میں ملک سے باہر نکلا تھا، گھپ اندھیرے میں، دو درجن مہاجرت کرنے والوں کے ساتھ۔ اصیلہ میں ٹھیک ساحل پر ہسپانیہ کی گوارڈیا سِوِل کے ہاتھوں پکڑا گیا تھا اور دو دن بعد نقل وحمل کی کشتی پر بٹھا کر واپس مراکش بھیج دیا گیا تھا۔ اس نے چند ماہ طنجہ میں تگ ودو کرتے ہوئے گزارے اور گرما کی ایک سکون افزا شب دوبارہ آبنائے کے پار جانے کی کوشش کی۔ اس بار دھارے نے اس کی مدد کی، اور وہ طریفہ کے ایک خاموش سے کنارے پر جا پہنچا۔ چند دن بعد وہ کیٹالونیا میں تھا، زراعتی ملازمت کے لیے چاق وچوبند جس کو دلوانے کا وعدہ اس اسمگلر نے کیا تھا جسے اس نے پیسہ کھلایا تھا۔ یہ بڑی مشقت والا کام تھا، اور وہ اپنا دھیان اختتام پر ملنے والی رقم پر لگائے رہا۔ اس پہلی گرما کی بابت اسے سب سے زیادہ یاد رہ جانے والی بات اس کے ہم کاروں کے جسموں کی خمیدہ شکلیں تھیں اور اس دین میں جو انھیں ہر صبح کام پر لے جاتی تھی، بسی ہوئی رگ پٹھوں کے مرہم کی بو۔ لیکن جب انتظار بسیار کے بعد تنخواہ کی رقم ملی تو وہ بے حد حقیر نکلی، لیکن خوف کے مارے وہ کوئی شکایت نہیں کر سکا۔ اس نے شمال کی طرف نکل جانے اور وہاں سے فرانس میں داخل ہونے کی بابت سوچا لیکن قسمت کو یوں للکارنے سے باز رہا۔ آخر کار وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ خوش قسمت رہا تھا۔ اُس ہوا بھری مدوّر کشتی میں سفر ایسی کٹھن آزمائش ثابت ہوا تھا جسے وہ بھول جانا چاہتا تھا، اور اس نے سوچا کہ ترکاریوں کے کسی ٹرک میں گھس کر چوری چھپے سرحد پار کرنا اس سے آسان تو کیا ہوگا۔ تو وہ اس کے بجائے جنوب کی سمت میں چل دیا۔ وہ نومبر میں سیڈرڈ پہنچا، صرف کسی دوست کا مبہم سا پتا لیے جو کسی ریستوراں میں کام کرتا تھا اور ہو سکتا تھا کہ اسے بھی کوئی کام دلوانے میں مدد دے سکے۔

کاسابلانکا کا ہوائی اڈہ خاصا جاذبِ توجہ تھا۔ سنگِ مرمر کا فرش، خودکار دروازے، ڈیوٹی فری دکانیں — ہر چیز جدید عہد کے مطابق نظر آ رہی تھی۔ لیکن پاسپورٹ کی جانچ پڑتال والی قطار خاصی لمبی تھی۔ گھنٹہ بھر اپنی باری کا انتظار کرنے کے بعد عزیز ایک کھڑکی کے سامنے کھڑا ہوا تھا جہاں ایک

آفیسر نے، جس کے ادوے ہونٹ کثرت سے تمباکو نوشی کی تصدیق کر رہے تھے، چہرے پر ایک غیر دوستانہ تاثر کے ساتھ ہاتھوں پر اپنی ٹھوڑی ٹکالی۔

"پاسپورٹ،" اس نے کہا۔

عزیز نے سبز رنگ کی کتیا، جس پر بیچ کناری ستارے کا نقش تھا، شیشے کی کھڑکی کے زیریں حصے سے آگے سرکا دی۔ آفیسر نے اپنے کی بورڈ پر کچھ ٹائپ کیا، پھر عزیز کے پاسپورٹ کے ورق اُلٹ کر دیکھنے لگا۔

"تم کہاں کام کرتے ہو؟" آفیسر نے سوال کیا۔

عزیز دم بخود ہو گیا۔ "ایک آفس میں،" اس نے جواب دیا۔ یہ جھوٹ تھا۔ لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ پاسپورٹ کے معائنے کا اس کی ملازمت سے کیا تعلق ہے۔ اسے ڈر لگا کہ سچ بولنے سے، کہ وہ ایک بس بوائے[2] ہے، آفیسر کی نظر میں اس کا درجہ گر جائے گا۔

"تمھارے پاس قومی شناختی کارڈ ہے؟"

"نہیں۔" عزیز کا جسم اکڑ گیا۔ وہ پیٹھ تانے کھڑا رہا، اس تردد کی لہر پر قابو پانے کی کوشش میں جو اس پر غالب آتی جا رہی تھی۔ وہ ہراساں نظر نہیں آنا چاہتا تھا۔ آفیسر نے اونچی آواز سے ایک لمبی سانس لی اور دوبارہ اپنے کمپیوٹر پر ٹائپ کرنے لگا۔ اس نے پاسپورٹ پر ٹھپا لگایا اور کاؤنٹر پر اس کی طرف ڈال دیا۔ "اگلی بار شناختی کارڈ ساتھ رکھنا۔"

عزیز کیچ ایریا میں اپنا سامان اٹھانے پہنچا۔ کسٹم آفیسر نے اسے سوٹ کیس کھولنے کو کہا، اور اپنی چھڑی سے اس کے مشمولات کو الٹ پلٹ کرنے لگا۔ اسے دس بنیانوں کا ایک پیکٹ نظر آیا جو ہنوز پلاسٹک کے لفافوں میں رکھی تھیں۔ "کیا انھیں بیچنے کا ارادہ ہے؟" اس نے پوچھا۔

عزیز کو اس قماش کے لوگوں کی خوب پہچان تھی۔ یہ مہاجرت کرنے والوں کو ڈراتے دھمکاتے تھے تاکہ وہ چپکے سے ایک آدھ نوٹ ہاتھ میں تھما دیں۔ وہ یہ کھیل نہیں کھیلنا چاہتا تھا۔ جب اس نے نفی میں جواب دیا تو اس کی آواز پرسکون اور سرد مہر تھی۔ آفیسر نے عزیز کے پیچھے کھڑی قطار کو دیکھا، پھر سوٹ کیس بند کیا اور سفید چاک سے اس پر نشان لگا دیا۔ عزیز باہر جانے کے لیے آزاد تھا۔

---

[2] بس بوائے Bus boy ہوٹل کا ویٹر جو استعمال شدہ برتن اُٹھاتا ہے اور میز لگاتا ہے۔

وہ ایسکیلیٹر کے ذریعے نیچے ریل گاڑی کے اسٹیشن پر پہنچا۔ شٹل ٹرین کا نام اولمپک کے گولڈ میڈلسٹ کے نام پر، محمد رکھ دیا گیا تھا، کیونکہ یہ تیز رفتار تھی اور ہمیشہ وقت کی پابند۔ اب عزیز اس خیال کے باعث مسکرا دیا کہ اس کے ہم وطن ہمیشہ کتنی جلدی سے ہر چیز کے لیے کوئی نہ کوئی مزاحیہ نام ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ اس نے ٹرین میں ایک نشست سنبھالی۔ گاڑی ٹھیک وقت پر روانہ ہو گئی۔ باہر سڑک پر کالے پلاسٹک کے تھیلے بکھرے پڑے تھے۔ درخت، جن کے پتے خشک اور زرد پڑ گئے تھے، ہوا میں ہلکورے لے رہے تھے۔ دور فاصلے میں ایک پرانا ٹرک پہلو کے بل پڑا تھا، اس کے پہیے ہوا میں معلق تھے۔ جلد ہی گاڑی فیکٹریوں اور اپارٹمنٹ والی عمارتوں کے شہری علاقے میں داخل ہوئی۔

وہ اپنے پرانے محلے سے قریب ترین اسٹیشن 'کاسابلانکا پورٹ' پر اترا۔ اسٹیشن کی لابی میں قدم رکھتے ہی اس نے خود کو سگریٹ بیچتے لڑکوں، جوتوں پر پالش کرنے والوں، اور ریزگاری مانگتے ہوئے بھکاریوں کے ہجوم میں پایا۔ اس نے اپنے سوٹ کیس اور ہینڈ بیگ پر ہاتھ کی گرفت مضبوط کر لی۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ وہ بڑے مشتاق قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ اپارٹمنٹ اسٹیشن سے کم ہی فاصلے پر تھا اور ٹیکسی لینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ کاغذ کے کونے نما پڑوں میں اُبلے چنے بیچنے والا ٹھیلا اب بھی وہیں سڑک پر تھا اور اخباروں کے تھڑے پر اب بھی وہی بوڑھا آدمی نیلا لیب کوٹ اور اونی ٹوپی پہنے اپنے کام میں مصروف تھا۔ اسکول جاتی ہوئی نو عمر لڑکیوں کی ایک ٹولی نے عزیز کی سمت میں سڑک پار کی۔ ان میں سے کئی لڑکیوں کے سروں پر حجاب بندھے تھے، اور وہ بے ساختہ ان کو گھورتا رہا تا آنکہ وہ پاس سے ہو کر گزر گئیں۔

جب وہ بازار کے داخلے پر پہنچا تو دکاندار ہنوز اپنی دکانیں کھول رہے تھے، اپنے پھل ترکاریوں اور مسالوں کو سجا رہے تھے۔ ایک قصائی کھال اُتری بھیڑیں اور گائے کے پائے ٹانگنے میں مصروف تھا۔ گوشت کا منظر دیکھ کر عزیز کو مالش ہونے لگی۔ اس کے عقب میں گاڑیاں چوں چوں کرتی رہیں کیونکہ ڈرائیوروں کو مال پہنچانے کی جلدی تھی۔ ''بالک!'' [خبردار! ہوشیار!] کی صداؤں نے اسے ایک طرف ہو جانے کے لیے متنبہ کیا، اور گاڑی کے نیچے کچلے جانے سے بچنے کے لیے اسے دو بار ایک دیوار سے چپک جانا پڑا۔ اسے پسینے کے قطرے اپنی پیشانی پر جمع ہوتے ہوئے محسوس ہوئے، اور سینے پر سویٹر کا ناقابل برداشت بوجھ۔ اس کا جی چاہا کہ اسے اُتار دے، لیکن اس کے دونوں ہاتھ گھرے ہوئے تھے اور وہ گھر پہنچنے سے پہلے کہیں رکنے کے خیال سے گھبرا رہا تھا۔

Scanned with CamScanner

عزیز ایک تنگ سی گلی میں مڑا اور چلتا گیا تا آنکہ عمارت کے دروازے پر پہنچ ہی گیا، یہ ایک بے ڈھنگا، پرانے وقتوں کا ریاض[3] تھا جسے چھوٹے چھوٹے اپارٹمنٹوں میں بدل دیا گیا تھا۔ عزیز نے اندرونی صحن پار کیا اور اپارٹمنٹ کے دروازے پر دستک دی۔ ملنے والا تنہا جواب اس کے شکم سے آیا، جو گرہ پڑنے سے گڑگڑاہٹ کی آواز نکالنے لگا تھا۔ اس نے اوپر کھڑکی کی طرف نظر اُٹھائی اور دیکھا کہ جھلملی کھلی ہوئی ہے۔ اس نے دوبارہ دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس بار، اسے قدموں کی آواز سنائی دی جو جلدی جلدی اُتر رہے تھے، اور یہ ہی وہ، اس کی بیوی۔

''علی سلامتک!'' زہرہ چلائی۔

''اللہ یسلمک!'' اس نے جواب میں کہا۔ اس نے اپنے بازو عزیز کے گرد ڈال دیے اور دونوں ہم آغوش ہوئے۔ شروع شروع میں ہم آغوشی ڈھیلی ڈھالی سی رہی لیکن بعد میں تنگ ہونے لگی۔ عزیز کی ماں آہستہ آہستہ کھسکتی کھسکتی دروازے پر آئی، اور اپنا ایک بازو اس کے گرد لپیٹ لیا، اور دوسرے سے اپنی چلنے کی چھڑی پکڑے رہی۔ اس نے رونا شروع کر دیا۔ عزیز نے دونوں عورتوں کی گرفت ڈھیلی کی، اپنا سوٹ کیس اور ہینڈ بیگ اٹھایا، اور اندر داخل ہوا۔

اپارٹمنٹ اس سے زیادہ اندھیرا تھا جتنا اسے یاد تھا۔ دیواروں پر چڑھے رنگ کے پتے اُترنے لگے تھے۔ فرانسیسی طرز کی کھڑکیوں میں سے ایک کا ایک شیشہ غائب تھا، اور اس کی جگہ پر ایک کھوکھے کا پٹرا لگا دیا گیا تھا؛ لیکن دیوان کے غلاف چمچماتے نیلے تھے، اور کمرے کے وسط میں ایک بالکل نئی میز پڑی تھی۔

عزیز کی ماں نے ایک طویل ہائے ہو مچانی شروع کی۔ اس کی زبان اس کے بے دانت کے منہ میں ایک طرف سے دوسری طرف جنبش کرنے لگی۔ وہ چاہتی تھی کہ سارے پڑوسیوں کو خوش خبری ہو جائے۔ زہرہ بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئی، اس کی آواز مقابلتاً زیادہ اٹھی ہوئی تھی۔ عزیز نے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا، اور ذرا سی دیر میں وہ سب ملاقاتی کمرے میں کھڑے ہوئے تھے، ہنس رہے تھے، ٹسوے بہا رہے تھے، باتیں کر رہے تھے۔

زہرہ کچھ زیادہ دبلی اور چھوٹی نظر آ رہی تھی، اور اس کی ماتھے پر لکیریں بھی ابھر آئی تھیں۔ اس

[3] ریاض وسیع اراضی پر واقع باغوں والا قصر یا کشادہ حویلی۔

کے بال ایک پونی ٹیل کی شکل میں بندھے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں پر — اب اس نے دیکھا کہ ان کا رنگ سرمئی بھورا تھا — کحل کی لکیر کھنچی ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر نارنجی سے رنگ کا شائبہ تھا۔ ضرور اس نے اپنے منھ کو سواک کی جڑ سے مانجھا ہوگا تاکہ دانت خوب چٹے ہو جائیں۔

"بھوک لگی ہے؟" زہرہ نے پوچھا۔

"نہیں،" عزیز نے جواب دیا، اس کا ہاتھ پیٹ پر تھا۔ "میں کچھ کھا نہیں سکتا۔"

"تو کم از کم میں چائے ہی بنا لاتی ہوں۔" عزیز کو معلوم تھا کہ وہ نا نہیں کر سکتا، پھر یہ بھی کہ وہ دوبارہ پودینے کی چائے کا ذائقہ چکھنا چاہتا تھا۔ زہرہ باورچی خانے میں غائب ہو گئی اور وہ اپنی ماں کے برابر بیٹھ گیا۔ ماں کی آنکھوں نے اس کا بغور معائنہ کیا۔

"تم دبلے نظر آ رہے ہو،" وہ بولی۔ وہ خود بھی سکڑی ہوئی لگ رہی تھی، اور اس کے کندھے بھی خم کھا گئے تھے۔ ظاہر ہے، اس نے اپنے آپ سے کہا، چند سال گزر گئے ہیں، بالکل قدرتی بات ہے۔ "اور تمھاری جلد کا رنگ بھی نسبتاً صاف ہے،" ماں نے اضافہ کیا۔ عزیز کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کا کیا جواب دے، چنانچہ وہ صرف مسکراتا رہا اور ہاتھوں میں اس کے جھریوں پڑے ہاتھ تھامے رہا۔

زہرہ چائے کی سینی لیے آئی۔ عزیز تن کر بیٹھ گیا۔ وہ اب بھی حسین ہے، اس نے سوچا۔ جب اس نے اسے گرم گرم چائے کا گلاس دیا تو اس نے دیکھا کہ عمر بڑھنے کا اثر اس کے ہاتھوں پر اس کے بقیہ جسم کے مقابلے میں کہیں زیادہ سرعت سے ہوا ہے، ان کی جلد ناہموار اور خشک ہو گئی ہے، اس کے گئے سوجے سوجے اور سرخ ہو گئے ہیں۔ اسے احساسِ جرم کی ہلکی سی چبھن محسوس ہوئی۔ جو پیسے وہ بھیجتا تھا شاید ناکافی پڑتے ہوں اور گزارے کے لیے اسے اس کے خیال سے کہیں زیادہ کام کرنا پڑتا ہو۔ لیکن زندگی خود اس کے لیے بھی آسان نہیں تھی۔ اس نے چائے کی چسکی لی۔

"آؤ تمھیں دکھاؤں، تمھارے لیے کیا لایا ہوں،" وہ بولا۔ اس نے اپنا گلاس رکھ دیا اور سوٹ کیس کھولنے گیا۔ اس نے وہ پارچہ نکالا جو ماں کے لیے لایا تھا، لباس جو زہرہ کے لیے تھے، کریمیں، خوشبوئیں۔ ہر چیز پر دونوں عورتیں آہا اور اوہو کرتی رہیں۔

جب اس نے سلائی کی دستی مشین نکالی تو زہرہ نے اسے تعجب سے دیکھا۔ "مشین تو میں نے پچھلے سال ہی خریدی ہے،" وہ بولی۔ اس نے پرانی سنگر مشین کی طرف اشارہ کیا جو کمرے کے ایک

کونے میں رکھی ہوئی تھی۔

"یہ بجلی کی ہے،" اس نے فخر سے کہا۔ "میں ابھی اسے لگا دوں گا۔ تم دیکھنا یہ کتنی تیزی سے چلتی ہے۔"

اس کی آمد کے ایک گھنٹے ہی میں، ملاقاتیوں کا ایک ریلا عزیز سے ملنے کے لیے بہتا ہوا چلا آیا۔ چھوٹا سا اپارٹمنٹ لوگوں سے بھر گیا، اور زہرہ چائے دانی اور حلوے کی پلیٹ کو بار بار بھرنے کے لیے باورچی خانے اور ملاقاتی کمرے کے پھیرے لگاتی رہی۔

"ہمیں بتاؤ،" کسی نے پوچھا۔ "ہسپانیہ کیسا ہے؟"

"تمھارے لیے کھانا کون پکاتا ہے؟" کسی اور نے پوچھا۔

"تمھارے پاس اپنی کار ہے؟" ایک تیسرے نے سوال کیا۔

عزیز نے میڈرڈ کا حال بتایا، وہاں کتنی سخت سردی پڑتی ہے، بارش بنا تھمے دنوں تک کھڑکیوں کو جاتی رہتی ہے۔ اس نے "پرادو" کے پاس واقع پلازا ایمپیرٹو کا ذکر بھی کیا جہاں گرمیوں کے دنوں میں سیر گشت کرنا، اور وہاں سیاحوں، خوانچہ فروشوں، اور کبوتروں کا نظارہ کرنا اسے بھاتا تھا۔ اس نے ریستوراں میں اپنے کام کا بتایا اور یہ کہ اس کا منیجر اسے اتنا پسند کرتا تھا کہ اسے برتن دھونے سے ترقی دے کر میزیں صاف کرنے کا کام دے دیا تھا۔ اس نے لاواپیس میں واقع اپارٹمنٹ کا نقشہ کھینچ کر بتایا، جہاں وہ دو اور ہجرت کرنے والوں کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ باری باری کھانا بناتے تھے۔

"تم نے دوست دوست بھی بنائے؟" کسی نے پوچھا۔

"چند ایک،" عزیز نے کہا۔ اس نے اپنے پڑوسی کا ذکر کیا، جو ہمیشہ اس کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آتا تھا، اور ریستوراں میں اپنے باس کا۔ لیکن اس نے اس واقعے کا کوئی ذکر نہیں کیا جب وہ ایل کورتے انگلو میں جیکٹ خریدنے گیا تھا اور پہرے دار اس کے پیچھے پیچھے گھومتا رہا تھا جیسے وہ کوئی چور ہو۔ اس نے یہ بھی نہیں بتایا کہ کس طرح، جب وہ گروسری اسٹور جاتا، کیشیئر دوسرے گاہکوں کی پذیرائی ہیلو اور شکریہ کہہ کر کرتے لیکن اس کے پاس سے ان کی نگاہیں ہمیشہ یوں گزر جاتیں جیسے وہ نظر ہی نہ آ رہا ہو، اور نہ اس نے اس مسلسل ہونے والی شناختی چھان بین کا کوئی ذکر کیا جو پولیس ان گزشتہ

دو سالوں میں کرتی رہی تھی۔

زہرہ کی ماں بھی، جو اسی سڑک پر ذرا آگے رہتی تھی، آ نکلی تھی، اور اس تمام گفتگو کے درمیان خاموش بیٹھی رہی تھی آخرکار اس نے پوچھا: ''تم وہاں کیوں کام کرتے ہو جب کہ تمھاری بیوی یہاں بیٹھی ہوئی ہے؟'' اس نے ناراضگی کے اظہار میں اپنی زبان سے ٹک ٹک کی آواز نکالی۔ عزیز نے زہرہ کی طرف دیکھا۔ وہ اس بارے میں اُس سے بات کرنا چاہتا تھا، لیکن ابھی تک انھیں ایک دوسرے کے ساتھ تنہا ہونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور اپنی ساس کا گلاس دوبارہ چائے سے بھر دیا۔

''لحسن کہاں ہے؟'' عزیز نے پوچھا۔ ''میرا خیال تھا کہ وہ اب تک یہاں پہنچ گیا ہوگا۔''

شروع شروع میں اس نے اور لحسن نے ایک دوسرے کو خط لکھے تھے، لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا، ان کا رابطہ ٹوٹ گیا۔ عزیز کو لحسن کا آخری پوسٹ کارڈ دو سال پہلے ملا تھا۔

''وہ نقل مکانی کر کے مراکش شہر چلا گیا ہے،'' زہرہ نے بتایا۔ ''اب ہر ایرے غیرے کے پاس موبائل فون آ گیا ہے، اس لیے اسے فون کارڈ بیچنے میں مشکل ہونے لگی تھی۔''

جب مہمان رخصت ہوئے، عزیز کی ماں رات گزارنے کسی پڑوسی کے یہاں چلی گئی تاکہ عزیز اور زہرہ اپارٹمنٹ میں تنہا ہو سکیں۔ عزیز سونے کے کمرے میں داخل ہوا تاکہ کپڑے بدل کر شب خوابی کا لباس پہن لے۔ وہ بستر کے کنارے پر بیٹھ گیا اور چاروں طرف نظر ڈالی۔ اس کی ایک رنگ اڑی تصویر کپڑوں کی پرانی الماری کے آئینے کے ایک کونے میں اُڑسی ہوئی تھی، اور ایک اور تصویر، جو شادی کے دن لی گئی تھی، فریم میں جڑی ہوئی دروازے کے پاس دیوار پر ٹنگی تھی۔ اسے گدا اپنے نیچے سخت محسوس ہوا۔ وہ اس پر چند بار اچھلا کودا تو اسپرنگ زور سے چرخ چوں کرنے لگے۔

زہرہ کچھ دیر تک باورچی خانے میں مصروف رہی، اور آخرکار بتیاں گل کر کے سونے کے کمرے میں آئی۔ دن میں تو وہ خوب پُرجوش اور باتونی رہی تھی، لیکن اب خاموش نظر آ رہی تھی، بلکہ شرمیلی۔ عزیز پیچھے ہو کر تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور آلتی پالتی مار لی۔

''تم تھک گئے ہو گے،'' زہرہ نے کہا، اس کی آنکھیں اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔

''مجھے ابھی نیند نہیں آ رہی،'' عزیز بولا۔

زہرہ نے اپنے سامنے باہر سڑک کی بتیوں کو دیکھا۔

''مجھے تم سے کچھ کہنا ہے،'' وہ بولا۔ اس کو بات کرتے ہوئے خاصی دقت ہو رہی تھی۔ زہرہ نے اسے بڑی تیز نظروں سے دیکھا۔ ''میں نے کچھ رقم بچائی ہے۔ لیکن...'' اسے پھر دقت محسوس ہوئی۔ ''میرے خیال میں یہ کافی نہیں۔''

زہرہ بستر کی پشت پر بیٹھ گئی۔ ''کتنی؟'' اس نے پوچھا، چہرے پر ہراس کی کیفیت تھی۔

''پچاس ہزار درہم،'' اس نے بتایا۔ ''زیادہ ہو سکتی تھی، لیکن پہلا سال بہت کڑا نکلا۔''

زہرہ نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''جانتی ہوں۔''

''کرایہ دینا تھا۔ اور کاغذات کے حصول کے لیے وکیل کی فیس۔ اور جو پیسے مجھے ہر مہینے گھر بھیجنے ہوتے تھے وہ الگ۔''

''پچاس ہزار کافی رقم ہے۔ تم اس سے شروعات کر سکتے ہو۔ اپنا کاروبار کیوں نہیں شروع کر لیتے؟''

عزیز نے سر ہلایا۔ ''کافی نہیں ہے۔''

''کیوں نہیں؟''

''اس سے تو جگہ کے سال بھر کی پگڑی کی ادائیگی ہی مشکل سے ہو سکے گی۔ پھر بیچنے کے مال اور دیکھ بھال کا خرچہ بھی تو ہے۔'' عزیز نے سر ہلایا۔ ''اور لکھا پڑھی اس کے علاوہ۔'' اسے سرکاری دفاتر کے باہر لگی قطاریں یاد آئیں جو اس نے دیکھی تھیں، جہاں لوگ اس تاک میں رہتے کہ کسی افسر کو رشوت دے کے اپنے کاغذات آگے بڑھوا لیں۔

''تو پھر ہم کیا کریں گے؟'' زہرہ نے پوچھا۔

''واپس ہسپانیہ جاؤں گا،'' عزیز نظریں نیچی کر کے بولا۔ اس کی بیوی پہلے ہی اتنی بہت سی قربانیاں دے چکی تھی۔ اس کے والدین اسے اپنی لڑکی دینے پر صرف اس وجہ سے راضی ہو گئے تھے کہ ان کے خیال میں چوبیس سالہ کنواری ہونے سے یہ زیادہ بہتر تھا کہ زہرہ شادی شدہ ہو، چاہے شوہر بے روزگار ہی کیوں نہ ہو۔ وہ اس کے قریب رہی تھی اور سفر کے لیے پیسے بچانے میں اس کی مدد

کی تھی، اس کا انتظار کیا تھا، لیکن کم از کم اب اسے اور زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔" اور میں نے تمھارے کاغذات کے حصول کا ڈول ڈال دیا ہے، سو تم جلد ہی میرے پاس آ جاؤ گی، انشاء اللہ۔"

زہرہ نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اقرار میں سر ہلایا۔ پھر وہ اٹھی اور بتی گل کر دی۔ اس نے اس کے اپنا دن کا لباس اُتار کر بستر میں داخل ہونے کی آواز سنی، جہاں وہ کروٹ کے بل لیٹ گئی۔ جب وہ اس سے قریب ہوا تو اس نے جنبش نہ کی، اپنے گھٹنے اپنے سینے سے لگائے رکھے۔ وہ بستر پر اپنے والے سرے کی طرف ہٹ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

اگلی صبح پانچ بجے ہی عزیز سارے شہر سے اٹھتی ہوئی موذنوں کی آواز سے مزید اکر بیدار ہو گیا۔ اس نے چند لمحوں کے لیے تکیے سے اپنا سر اوپر اٹھایا اور پھر رکھ لیا، آنکھیں موند لیں، اور اذانوں کو سننے لگا۔ ہسپانیہ میں اسے ان اذانوں کی کمی محسوس ہوتی تھی، جو یہاں ہر چیز کے اوقات متعین کرتی تھیں۔ وہ مسکرایا اور واپس سو گیا۔ بعد میں، اپارٹمنٹ سے چند بلاک دور صنعتی شاہراہ پر زناٹے کے ساتھ گزرتی ہوئی کاروں اور ٹرکوں کی آواز بھی اسے نہ جگا سکی۔ لیکن رغیف کی مہک، جنھیں زہرہ پکا رہی تھی، آسانی سے نظر انداز نہیں کی جا سکتی تھی، اور آخر کار وہ کوئی نو بجے بستر سے نکلا۔

جب وہ باہر آیا، اس کی ماں ملاقاتی کمرے میں دیوان پر بیٹھی ہوئی تھی، شاہانہ اور بے تعلق انداز میں۔ اس نے ماں کے ہاتھ کی پشت پر بوسہ دیا، اور وہ جواب میں بولی، "اللہ تم سے راضی رہے۔" زہرہ ملاقاتی کمرے میں داخل ہوئی اور، اسے وہاں دیکھ کر، کھانے کی سینی لینے واپس باورچی خانے چلی گئی۔ اس نے کنبے کی مشترکہ پلیٹ میز کے وسط میں رکھ دی، اور عزیز سے تھوڑی تریب کر دی۔ چائے گلاسوں میں ڈالی اور سب کو پیش کی۔ پھر وہ عزیز کی ماں کے واسطے پانی کا گلاس اور تکیہ لے کر آئی۔

"یہ تکیہ کاہے کے لیے ہے؟" عزیز نے پوچھا۔

"خون کے دباؤ کے لیے،" زہرہ نے بتایا۔ وہ بیٹھ گئی اور کھانا کھانے لگی۔

"مجھے پتا نہیں تھا۔" عزیز نے کوشش کی کہ کوئی اور بات کرے۔ "رغیف بے حد لذیذ بنی ہیں۔"

"تمھاری صحت کے لیے،" اس نے جواباً کہا۔

وہ اشتیاق سے کھانا چبانے لگا، مطمئن کہ چونکہ منہ بھرا ہوا ہے اب کچھ نہیں کہنا پڑے گا۔ خوش قسمتی سے دروازے پر ہونے والی دستک نے کچھ دھیان بٹا دیا۔ ایک چھوٹی سی لڑکی، قبل اس کے کہ اُسے اندر بلایا جائے، بھاگتی ہوئی داخل ہوئی۔ وہ کوئی چھ سال کے لگ بھگ لگ رہی تھی۔ اس کے بال پگ ٹیل کی شکل میں گندھے ہوئے تھے اور اس کا نیلا پاجامہ ٹخنوں کے اوپر پھٹا ہوا تھا۔

''کون ہے؟'' عزیز نے ماں سے پوچھا۔

''مریم، پڑوسی کی لڑکی۔ وہ ہمیشہ یہیں ہوتی ہے۔''

بچی چھلانگ لگا کر زہرہ کے بازوؤں میں آ گئی، اور زہرہ نے ہنس کر اس کے گالوں کو زور سے تھپتھپایا۔ ''کچھ کھاؤ گی؟'' زہرہ نے پوچھا۔ اس نے بچی کو گود میں لے لیا اور ایک لپٹی ہوئی رغیف پکڑا دی، جو پگھلے ہوئے مکھن اور شہد میں تر تھی۔ اس نے اس کے بال سلجھائے اور اس کی پگ ٹیلز کو مضبوطی سے باندھ دیا۔ بعد میں زہرہ مریم کو لے کر باورچی خانے چلی گئی، اور جب وہ دونوں دوبارہ نمودار ہوئیں تو بچی تازہ گندھے ہوئے آٹے کی ایک چوبی ٹرے اپنے سر پر سنبھالے ہوئے تھی۔ وہ اسے باہر تندور پر لے جا رہی تھی۔ ''اللہ تم سے خوش ہو،'' زہرہ نے جاتی ہوئی مریم سے کہا۔ زہرہ پھر بیٹھ گئی۔ ''پیاری نہیں؟'' اس نے کہا۔ عزیز نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

انھوں نے ناشتہ ختم کیا۔ زہرہ نے میز صاف کی اور پھر بتایا کہ ان سب کو اس کی بہن سمیرہ کے گھر، جو زنانہ میں رہتی تھی، دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا گیا ہے۔ وہ اپنا جلابہ لینے اور گھر کے لباس کے اوپر پہننے کے لیے سونے کے کمرے میں گئی۔ ''اگر میں تمھارے ساتھ ہسپانیہ چلی گئی تو تمھاری والدہ کی دیکھ بھال کون کرے گا؟'' اس نے پوچھا۔

''میری بہنیں،'' عزیز نے ہاتھ ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''یہ ان کے یہاں جا کر رہ سکتی ہیں۔ تم نے پہلے ہی ان کی بہت خدمت کی ہے۔'' عزیز بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹا تھا، اور ماں کی دیکھ بھال عام طور پر بہنوں کی ذمے داری تھی، یا پہلوٹھی اولاد کی، اور وہ ان دونوں میں سے نہیں تھا۔

زہرہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر اس نے سانس کھینچا اور بولی، ''لیکن مجھے تو ہسپانوی بولنا نہیں آتی۔''

''سیکھ جاؤ گی۔ جس طرح میں سیکھ گیا۔''

"کیا یہاں نہیں رہ سکتے؟"

عزیز نے سر کو جنبش دی۔ اسے اپنے ہونٹ خشک محسوس ہوئے اور اس نے زبان پھرا کر انھیں تر کیا۔ "اس کے بارے میں بعد میں بات کریں گے،" وہ بولا۔

سمیرہ کے گھر جانے کے لیے انھوں نے بس پکڑی۔ عزیز کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا اور سڑکوں کو گزرتا ہوا دیکھنے لگا۔ جہاں دیکھو نئی نئی عمارتیں جست لگا کر کھڑی ہو گئی تھیں، چوڑے چوڑے، سپاٹ اپارٹمنٹ ہاؤس جن کی کھڑکیاں چھوٹی چھوٹی سی تھیں اور انھیں زیادہ جاذب بنانے کی ناکام کوشش میں ان کے چوطرفہ رومی طرز کے ٹائل جڑ دیے گئے تھے۔ انٹرنیٹ کیفے اب درزیوں اور حجاموں کی دکانوں کے درمیان پھیلے ہوئے تھے۔ دوسری سمت سے آتی ہوئی بس جب انچوں کے فاصلے سے پاس سے گزری تو وہ چونک کر کھڑکی سے دور ہٹ گیا۔ ہر طرف کاروں کے ہارن گونج رہے تھے اور چوراہوں پر موٹر سائیکلیں بمشکل ہی رفتار کم کر رہی تھیں۔

وہ بس سے اُترے اور پیدل چلنے لگے۔ جلتے ہوئے ربڑ کی چراند عزیز کے نتھنوں میں بھر گئی۔

"تم سونگھ رہی ہو؟" اس نے پوچھا۔ زہرہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "بڑی سخت بدبو ہے،" وہ بولا۔ زہرہ نے شانے اُچکائے۔ وہ ایک اسکول کے پاس سے گزرے اور میدانوں میں بچوں کو فٹ بال کھیلتے ہوئے دیکھا۔ اس سے اسے اپنا بچپن یاد آ گیا اور وہ مسکرا دیا۔ وہ ظہر کی نماز کے تھوڑی ہی دیر بعد وہاں پہنچے۔ سمیرہ دستک سن کر دروازے پر آئی، اور عزیز کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کا سر پوری طرح اسلامی حجاب سے ڈھکا ہوا تھا جن کی تعداد لگتا تھا اس کے روانگی کے بعد بہت بڑھ گئی تھی۔ اپنے حواس مجتمع کر کے وہ اس سے بغل گیر ہونے کے لیے آگے کو جھکا، لیکن وہ پیچھے ہٹ گئی اور بولی، "خوش آمدید، خوش آمدید۔"

عزیز سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ زہرہ بے دھڑک اندر داخل ہو گئی اور جلا بہ اُتار دیا۔ وہ فوم کی گدیوں والے دیوان پر بیٹھ گئے، اور منیر، سمیرہ کا شوہر، نمودار ہوا۔ عزیز مسلسل سمیرہ کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے پوچھا، "تم نے حجاب کب سے پہننا شروع کر دیا؟"

"دو سال سے،" اس نے جواب دیا، "الحمدللہ۔"

"کیوں؟" عزیز نے سوال کیا۔

"کیونکہ یہی سیدھا راستہ ہے۔" زہرہ نے جواب دیا۔

زہرہ کیوں حجاب کی مدافعت کررہی تھی؟ عزیز پیچھے ہو کر بیٹھ گیا۔ "تو اس کا مطلب ہوا کہ اس سے پہلے تم غلط راہ پر تھیں؟" اس نے پوچھا۔ زہرہ نے اسے یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ بس اب بند بھی کرو۔ اس نے یوں ظاہر کیا جیسے اس نے دیکھا ہی نہ ہو۔ "ہاں تو؟"

سمیرہ نے اپنا سر ایک طرف جھکا لیا۔ "دعا ہے کہ خدا ہم سب کو راہِ راست پر لائے۔ آمین۔"

وہ اٹھی اور کھانے کے لیے میز لگانے لگی۔

"کب تک کا قیام ہے؟" سمیرہ نے پوچھا۔

"صرف دس دن،" عزیز نے بتایا۔

"پھر کچھ عرصے کے لیے واپس جا رہے ہیں،" زہرہ بولی۔

سمیرہ کسکس کی پلیٹ لے کر آئی۔ "تم کو چاہیے کہ اس کے ساتھ جاؤ،" وہ بولی۔ "شوہر اور بیوی کو ایک ساتھ رہنا چاہیے۔"

عزیز، زہرہ کے ردِعمل کو غور سے دیکھتا رہا۔ شاید خود اس کی بہن اس کو اس کے مقابلے میں بہتر طور پر قائل کر سکے۔

"میں نہیں جانتی کہ میری زندگی کو ویسا ہی ہونا چاہیے،" زہرہ نے کہا۔ لیکن اس کا لہجہ کمزور تھا، اور عزیز دیکھ سکتا تھا کہ اس کی بہن نے ایک بیج بو دیا ہے جس کی وہ پرورش کر سکتا ہے تاآنکہ اسے قائل کر لے۔

اس رات زہرہ سونے کے کمرے میں آئی اور بتی بجھا دی۔ لیکن اس بار جب عزیز اس کی طرف بڑھا تو اس نے منہ نہیں پھیرا۔ اس نے اسے اپنی آغوش میں بھر لیا۔ اس کے ساتھ دوبارہ جسمانی صحبت کرتے ہوئے بڑا عجیب سا لگا۔ وہ بھول گیا تھا کہ وہ کتنی چھوٹی سی ہے، اور جب وہ اس کے اوپر تھا، اسے یہ خوف ہوا کہ کہیں اس کا بوجھ اس کی برداشت سے باہر نہ ہو، چنانچہ وہ اپنے بازوؤں سے خود کو سہارے رہا۔ اس کے جسمانی قرب نے اسے وہ عورتیں یاد دلا دیں جن کے ساتھ وہ گویا اپنی نیند میں ہم بستر ہوا تھا۔ اسے یوں جسمانی بے وفائی کرنے پر ندامت محسوس ہوئی، لیکن اس

نے دلیل دے کر خود کو سمجھایا، وہ بالکل اکیلا تھا اور آخرکار انسان ہی تھا۔ اس نے خود سے کہا کہ اس کی نیت اپنی بیوی سے بے وفائی کرنے کی نہیں تھی، کیونکہ جن عورتوں کے ساتھ اس نے ہم بستری کی تھی ان سے اسے کوئی لگاؤ نہیں تھا، بالکل جس طرح، اسے یقین تھا، انھیں بھی اس سے کوئی لگاؤ نہیں ہوگا۔ اب اس نے تعجب سے خیال کیا کہ جنسی طور پر بھڑکانے والی بغیر فیتوں کی تنگ انگیا میں اس کی بیوی کیسی لگے گی، اس پر سوار، بازو ہوا میں اٹھائے، لذت کے مارے بلند آواز میں کراہتی ہوئی۔ وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ زہرہ یہ سب کرے گی۔ مگر شاید کر ہی لے، اگر وہ درخواست کرے تو۔ وہ اس سے علیحدہ ہوا اور اس کے نیچے اپنا بازو ڈال دیا تاکہ اسے اٹھا کر اپنے اوپر لٹا لے، لیکن اس نے اپنا سر اٹھایا اور مارے دہشت کے اس کے بازو کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کی آنکھوں نے اس سے سوال کیا۔ وہ ایک بار پھر اس کے بدن میں داخل ہوا اور جنسی کے سلسلے کو جاری رکھا۔ جب یہ سب ختم ہوا اور وہ اندھیرے میں پڑا ہوا تھا، اسے خیال گزرا کہ زہرہ کے ذہن میں کیا آیا ہوگا۔ اسے ڈر تھا کہ یہ صرف ایک ہی بات ہوگی۔ اس نے دیکھا تھا کہ وہ کن نظروں سے ہمسائے کی بچی کو تک رہی تھی اور اس نے سوچا کہ شاید آج رات اسے اس سے دور ہی رہنا چاہیے تھا۔ اس نے اپنے سے کہا کہ اگلی مرتبہ اسے کنڈوم استعمال کرنا ہی ہوگا۔ وہ اس وقت بچہ پیدا کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا، اس طرح تو نہیں، اس وقت جب انھیں اس کے کاغذات کا انتظار کرنا تھا، اس وقت تک نہیں جب تک ایک کنبے کی کفالت کی اہلیت اس میں پیدا نہیں ہو جاتی۔ وہ بستر پر پڑا رہا، نیند سے محروم۔

چند دن بعد عزیز اپنے والد کی قبر کی زیارت کو گیا۔ زہرہ، صبح کی روشنی میں جگمگاتی ہوئی الواحِ مزار کی قطاروں کے درمیان بڑی پھرتی سے چلتی ہوئی اس کی رہنمائی کرتی رہی۔ ایک قبر کے پاس پہنچ کر وہ یکبارگی رک گئی۔ اس پر عزیز کے والد کا نام عبدالرحمٰن حمود کندہ تھا، جس کے بعد ایک مرنے والوں کی دعا لکھی تھی: "یا ایتھا النفسُ المطمئنۃُ ارجعی الی ربکِ راضیۃً مرضیۃً فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔" اس کے بعد اس کی تاریخِ وفات: 27 رمضان 1420ھ۔

عزیز کو سنہ 2000 کا وہ دن یاد آیا جب ایک خط کی آمد نے اسے اپنے والد کے انتقال کی اطلاع دی تھی۔ زہرہ کے پاس ٹیلیفون نہیں تھا، تو اس نے سبزی فروش کو فون کر کے اسے بلانے کے لیے

کہا تھا۔ پندرہ منٹ بعد اس نے پھر فون کیا تھا، لیکن، عجیب بات ہے، کہنے کے لیے بہت کم تھا۔ لیکن ظاہر ہے اس وقت تک اس کے باپ کو مرے ایک مہینہ ہو چکا تھا، اور واقعے کی فوری شدت باقی نہ رہی تھی۔ اپنے آنسو نہ نکلنے پر اسے بڑی سخت ندامت محسوس ہوئی تھی۔ میڈرڈ میں، زندگی اپنی روش پر چلتی رہی، اور اس کی دل گرفتگی، جس کو کہیں ڈالنے کے لیے کوئی لنگر نہ تھا، ملتا تھا بھی ظاہر ہی نہ ہوگی۔

"کاش میں ان کے آخری وقتوں میں ان کے پاس ہوتا۔" عزیز نے کہا۔

"درب کے سارے لوگ سوگ منانے آئے تھے۔" زہرہ نے بتایا۔

عزیز گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور زہرہ کے بیگ سے صفائی کا برش نکالا۔ کتبے پر سے اس نے تمام مردہ پتوں کو جھاڑ پونچھ کر ہٹایا۔ "کاش میں یہیں ہوتا۔" اس نے دوبارہ کہا۔

زہرہ نے بھی اس کے برابر گھٹنے ٹیک دیے۔ "میں نہیں چاہتی کہ ہمارے ساتھ بھی یہی ہو۔ ہم دونوں کو ساتھ ہی ہونا چاہیے۔"

عزیز نے ایک گہرا سانس لیا۔ وہ اس کے فیصلہ کرنے کا منتظر رہا تھا، اور اب جبکہ وہ اس سے موافقت کرتی معلوم ہو رہی تھی، اسے خوشی کا وہ احساس نہیں ہوا جس کی اسے توقع تھی۔ جب وہ قبرستان سے نکل رہے تھے تو اس نے زہرہ سے کہا کہ وہ رات کے کھانے سے پہلے ٹہلنے جانا چاہتا ہے، اور جب وہ بس میں بیٹھ کر گھر چلی گئی، وہ خود شہر کے تجارتی علاقے کی طرف نکل گیا، شاہی فوج سے موسوم شاہراہ کی طرف۔ اس نے کیفے سعادہ میں جھانکا اور دیکھا کہ گاہک بار کے پاس کھڑے ہوئے یا کرسیوں میں بیٹھے ہوئے، اپنے بیئر یا جن اینڈ ٹانک کے گلاسوں پر جھکے ہوئے ہیں۔ ٹیرس پر گاہک پودینے کی چائے کی پیالیاں لیے کامل الوجودی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے باہر ہی ایک نشست کا انتخاب کیا، دھوپ میں، اور ایک ایسپریسو کافی کا آرڈر دیا۔ اس نے اپنے اردگرد نگاہ ڈالی۔ کوئی بات اسے عجیب سی لگ رہی تھی، لیکن وہ اس کا ٹھیک سے تعین نہیں کر سکا۔ جب ویٹر کافی لے کر آیا تبھی جا کر اسے احساس ہوا کہ وہاں عورتیں بالکل نہیں تھیں۔

کچھ لوگ شطرنج کھیل رہے تھے، کچھ تسبا کو نوشی کر رہے تھے، زیادہ تر اخبار پڑھ رہے تھے۔ جو راہ گیروں کے دھارے سے قریب تر بیٹھے ہوئے تھے وہ لوگوں کا مشاہدہ کر کے، اور اگر کوئی حسین لڑکی نظر آ جاتی تو کبھی کبھار سیٹی بجا کر، وقت گزاری کر رہے تھے۔ عزیز کو حیرت ہوئی کہ بدھ کے دن ٹھیک

Scanned with CamScanner

سہ پہر کے بیچوں بیچ یہ جگہ لوگوں سے اس قدر کیوں بھری ہوئی ہے، لیکن لوگوں کے چہروں کی گمبھیرتا نے اسے اپنے سوال کا جواب فراہم کر دیا۔ یہ بے روزگار لوگ تھے۔ عزیز نے اپنی کافی ختم کی اور بڑی فیاضانہ بخشش چھوڑ کر شاہراہ پر آ کر چلنے لگا۔ پرتکلف دکانوں میں چرمی اشیا، چینی کے برتن، ریشمیں گاؤ تکیے، یادگاری چیزیں، قیمتی سامان جن کے بارے میں اسے یقین تھا کہ اس کے محلے والے زندگی میں کبھی خریدنے کے اہل نہیں ہوں گے، بڑی زیبائش سے سجائے گئے تھے۔

کاسابلانکا میں اپنے دوسرے ہفتے کے شروع میں، عزیز ہر بہن بھائی، کزن، پڑوسی، اور دوست سے مل چکا تھا۔ اس نے شادیوں، ولادتوں، اور اموات کے ذکر سن لیے تھے۔ وہ یہ دیکھ کر کہ اس کے بھانجے بھتیجے، بھانجیاں بھتیجیاں کتنے بڑے ہو گئے ہیں، حسبِ ضرورت متعجب بھی ہو لیا تھا۔ لیکن اس سے زیادہ کرنے کے لیے اسے کچھ نہیں ملا۔ سینماؤں میں وہ فلمیں دکھائی جا رہی تھیں جنھیں وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ اس نے نائٹ کلب جانا چاہا ہوتا، لیکن وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ زہرہ اس کے ساتھ چلے گی یا اسے اکیلا ہی جانے دے گی۔ ٹی وی پر دکھائے جانے والے زیادہ تر پروگراموں سے اسے بیزاری محسوس ہوتی تھی، اور ان کے تمام ہمسایوں کے برخلاف زہرہ سیٹلائٹ ڈش لگوانے کی بالکل انکاری تھی۔ وہ ہمیشہ ایک ہی بات کہتی: ''گھر میں غلاظت لانے کی کوئی ضرورت نہیں، سڑک پر بہتیری پہلے سے ہی پڑی ہے''۔ چنانچہ وہ گھر ہی بیٹھا رہا، دیوان پر براجمان، اور وقت کے گزرنے کا منتظر۔

اپنی روانگی سے پہلے کے دن، عزیز نے کپڑوں کی الماری سے اپنا سوٹ کیس نکالا اور سامان باندھنے لگا۔ زہرہ پلنگ پر بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔ جب اس نے کام ختم کر لیا تو اپنے سوٹ کیس کی اندرونی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی۔ رقم اس نے زہرہ کے ہاتھوں پر رکھ دی۔ ''میرے پاس بس اتنے ہی ہیں۔''

زہرہ نے جنبش نہ کی۔ صرف اسے دیکھتی رہی۔

''میں اور پیسے بچاؤں گا،'' وہ بولا، ''اور پھر واپس آ جاؤں گا۔''

زہرہ کی آنکھوں میں بے یقینی کا تاثر تھا، جس سے عزیز کو بے چینی محسوس ہوئی۔ وہ اس سے کس چیز کی متوقع تھی؟ وہ کام کرنے کا موقع صرف اس لیے نہیں ٹھکرا سکتا تھا کہ اس کے پاس گھر بیٹھا

رہے۔ اسے ذرا بھی اندازہ ہے کہ بسپین میں کامیاب ہونے کے لیے اسے کیا کچھ کرنا پڑا ہے؟ اب وہ اس سب سے کیسے دستبردار ہو سکتا ہے؟ اسے کام پر لوٹنا ہی پڑے گا۔

گرانڈ فادر کلاک نے گھنٹہ بجایا۔

''تم مجھے کاغذات کب بھجوا رہے ہو؟'' آخرکار اس نے پوچھا۔

''مجھے معلوم نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

زہرہ رونے لگی۔ عزیز نے تسلی دینے کی بھونڈی سی کوشش میں اس کا شانہ تھپتھپایا۔ وہ میڈرڈ میں اپنے ساتھ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس بات کی عادی تھی کہ ہمسائے کی بچی دروازے کو دھکا دے کر کھولے اور اندر آ جائے۔ وہ محلے کے بازار کی عادی تھی جہاں ہر چیز کا بھاؤ تاؤ کر سکے۔ وہ عادی تھی کہ اس کے رشتے دار جب چاہتے آ جھمکیں۔ وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ زہرہ میں یہ صلاحیت ہے کہ جب وہ کام پر گیا ہو، وہ اپارٹمنٹ میں تنہا رہ سکے جہاں اس سے بات کرنے کے لیے کوئی نہ ہو۔ اور اب، جو اس کی بھی نئی عادتیں پڑ گئی تھیں۔ اس نے اپنا سوٹ کیس بند کیا اور بستر سے اٹھایا۔ وہ اسے جب لایا تھا اس کے مقابلے میں کم وزنی محسوس ہوا۔

٭

قصہ گو

مراد کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا کہ دو عورتیں اندر داخل ہوئیں۔ یہ ایک خاموش سی سہ پہر تھی، جس میں صرف اس کے پاؤں کے پاس پڑے ریڈیو کی آواز خلل ڈال رہی تھی جس سے بس تال شماری ہی کی جا سکتی تھی۔ اس کے باوجود ناول کی خیالی دنیا میں کھو جانے میں اسے سخت مشکل پیش آ رہی تھی، حالانکہ اس کا محلِ وقوع طنجہ تھا یا شاید اسی لیے کہ اس کا منظر نامہ طنجہ میں جمایا گیا تھا اسے زیرِ مطالعہ ناول کی افسانوی دنیا کی اس دنیا سے مطابقت پیدا کرنے میں جس کا وہ روز تجربہ کرتا تھا

Scanned with CamScanner

ناکامی ہو رہی تھی۔ اس نے خود کو مصنف کی نثر میں قطع و برید کرتے ہوئے پایا— ایک غلط حوالے کی تصحیح کرتے اور کرداروں کے مکالموں کی زبان بدلتے ہوئے— لیکن بات صرف اتنی نہیں تھی، کوئی چیز غائب تھی۔ یہ کتاب وہ امریکن لینگویج سینٹر سے لایا تھا، جہاں کام کی زیادتی کے شکار دونوں کلرکوں نے اجرا کا ٹھپا لگا کر کتاب اس کے حوالے کرنے سے پہلے اس کے رکنیت کے کارڈ کی جانچ پڑتال نہیں کی تھی جس کی میعاد ختم ہوئے کافی وقت ہو چکا تھا۔ وہ کام کے بعد وہاں کئی گھنٹے گزارتا تھا، اس کوشش میں کہ فکشن والے حصے میں کوئی ایسی چیز مل جائے جو اس نے ہنوز نہ پڑھی ہو۔ سینٹر جانے کی ایک وجہ اور بھی تھی— بڑی دلکش آنکھوں والی وہ لڑکی جسے اس نے جب پہلی بار وہاں دیکھا تھا تو وہ اپنی Heart of Darkness کے اوپر سے اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی تھی۔ ابھی چند مہینے پہلے ہی انھوں نے ایک دوسرے سے ملنا شروع کیا تھا۔ مراد نے سوچا کہ وقت کے ساتھ ساتھ وہ اسے اپنے چند پسندیدہ ناولوں سے متعارف کرائے گا، جو ناول فی الوقت اس کے ہاتھ میں تھا وہ اس فہرست میں شامل ہونے کے قابل نہیں تھا۔

"بطبول بازار اینڈ گفٹس" میں ان دو عورتوں کے داخلے نے ایک پُر انبساط تفریح کا سامان فراہم کر دیا، چنانچہ اس نے کتاب ایک طرف ڈالی اور فوراً کھڑا ہو گیا۔ دکان کا دوسرا ایلز مین انس کونے میں ایک کرسی پر ڈھیلا ڈھالا سا بیٹھا تھا اور ہلکے ہلکے خراٹے لے رہا تھا، جیسا کہ وہ بیشتر دوپہروں میں کرنے کا عادی تھا۔ دکان کا مالک چھٹیاں گزارنے آگادیر گیا ہوا تھا، اور دکان کی چابیاں مراد کو سونپ دی گئی تھیں، جو انس کو بہت ناگوار گزرا تھا؛ وہ وہاں مقابلتاً زیادہ عرصے سے ملازم تھا۔ اس کے باوجود، مراد کا اس کے ساتھ ٹھیک ٹھاک گزارہ ہو رہا تھا، زیادہ تر اس لیے کہ جب انس سگریٹ خریدنے کے بہانے دیر تک باہر رہتا یا پوری دوپہر پڑا اونگھتا رہتا تو مراد اس کا برا نہیں مانتا تھا۔ انس کے سر نے جھک کر جھٹکا کھایا جس سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دکان میں نظریں دوڑائیں، ان دو عورتوں کو دیکھا، اور ایک دم چاق و چوبند ہو گیا۔

دونوں عورتیں جوان تھیں، شاید بیس کی دہائی کے آخری سالوں میں۔ ایک نے جینز اور ڈھیلی ڈھالی ٹینلی قمیص زیب تن کی ہوئی تھی اور ہاتھ میں پٹ سن کا تھیلا اٹھائے تھی جس کی پٹیاں اس کے سینے پر ایک دوسرے کو ترچھا قطع کرتے ہوئے اس کے پستانوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ کر

رہی تھیں۔ اس کے اسٹرابری کے رنگ کے سنہری بال سر کے پیچھے ایک چوپ اسٹک کے سہارے بندھے تھے۔ اس کی دوست، گہری رنگت کے بالوں والی ایک بھاری بھرکم عورت، ابھی ابھی باہر پہاڑی جیسے چڑھاؤ والی سڑک پر چلنے کی وجہ سے خوب ہانپ رہی تھی۔ اس کی نیلے رنگ کی قمیص پر بغلوں کے نیچے نمی کے دھبے تھے، اور وہ ایک ہینڈ بیگ اٹھائے ہوئے تھی جس کے پہلو میں ڈزائنر کا نام بڑے نمایاں طور پر اپنی نمائش کر رہا تھا۔ وہ سیدھی زیورات کے کیس کی طرف بڑھی، جہاں مرجان نجوے کڑوں اور عنبریں دانوں کے ہار کے برابر چاندی کے آویزوں کی نمائش کی گئی تھی۔ ''تمھارے خیال میں یہ کیسے رہیں گے، سینڈی؟''

سینڈی شوکیس پر جھکی کھڑی رہی، بیزار اور وہاں سے رخصت ہونے کی جلدی میں۔ ''زیور بڑی ذاتی چیز ہوتے ہیں،'' اس نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے تمھارا انتخاب تمھاری کزن کو پسند نہ آئے۔''

''آؤ، دیکھیں تو سہی۔ اس کڑے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''اوہ، کرستا،'' سینڈی بولی، اس کے شانے قدرے جھک گئے۔ ''میرے خیال میں شادی کے تحفے کے لیے یہ مناسب نہیں۔ تم اسے گھریلو استعمال کی کوئی چیز کیوں نہیں دے دیتیں؟''

کرستا نے بڑے ڈرامائی انداز میں لمبی سی سانس لی، جیسے سینڈی اسے دوپہر بھر دوڑاتی پھری ہو اور اب وہ بھر پائی ہو۔ ''ٹھیک ہے،'' وہ بولی، زیورات کے کیس سے ان میزوں کی طرف بڑھتے ہوئے جو یادگاری اور نمائشی چیزوں سے اٹی تھیں۔ ایک شیلف پر چوبی تختیوں کے ایک دستے پر نظر پڑتے ہی وہ چلائی، ''دیکھو!''

تختیاں خود سرادنے، اپنے باس کے نمائندے کے طور پر، کسی جائیداد کی فروخت کے موقعے پر چند ہفتے پہلے ہی خریدی تھیں۔ یہ قرآنی مدرسوں میں 1940 کی دہائی تک استعمال ہوتی تھیں، لیکن اب، ظاہر ہے، بالکل نایاب ہوگئی تھیں۔ ایک تختی کے پیچھے اس لڑکے کا نام لکھا تھا جس نے اسے استعمال کیا تھا (طاہر) اور تاریخ (1935)۔ یہ غیر معمولی بات تھی کہ اس قسم کی شناختی تفاصیل موجود ہوں، کیونکہ جب بچے پڑھائی ختم کر لیتے تو تختیاں اکثر مدرسے کو لوٹا دی جاتی تھیں اور دوسرے طالب علم انھیں دوبارہ استعمال کرتے تھے۔ تختی کے سامنے والی طرف، لڑکے نے قرآن کی سورت 69 کی ایک آیت لکھی تھی، اتاری جانے والی سب سے پہلی آیت۔ ''اقرا باسم ربك الذی

خلق"۔ مراد نے اکثر اس لڑکے کے بارے میں غور کیا تھا جس کی تختی آخر کار "بطیول بازار اینڈ گفٹس" میں آ پہنچی تھی، کہ وہ قرآنی مدرسے سے فارغ ہو کر کسی پرائیویٹ اسکول میں داخل ہوا ہو گا یا اسے کام سیکھنے کے واسطے بھیج دیا گیا ہو گا۔ وہ طاہر کی زندگی کو تصور میں لاتا، اور اس کے واسطے والدین اور دوست گھڑتا جاتا — ایک باپ جس نے عبدالکریم کی حمایت میں ریف کی شورش میں حصہ لیا تھا؛ ایک ماں جو بڑی شدت سے بیٹی ہونے کی تمنا کرتی تھی؛ پانچ بڑے بھائی، ایک سبسی ["کیف" پینے کا پائپ] پینے والا ہمسایہ جس نے اسے رات کے وقت نے اور گمبری بجانا سکھایا تھا؛ جو خود اپنی گلی میں آگے کے کسی مکان میں رہنے والی کسی لڑکی پر مرتا تھا۔

کرستا نے تختی اٹھائی اور روشنی کے سامنے لا کر لکھائی کو پڑھنے کی کوشش کی۔ "خطاطی بے حد خوبصورت ہے،" وہ بولی۔

"حروف کے پیچ و خم مجھے بے حد دلکش لگ رہے ہیں،" سینڈی نے موزونیت اور عمدگی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

"میرے خیال میں کافی قدیم وقتوں کی چیز ہے۔"

سینڈی نے اپنی جینز کی جیب میں ہاتھ گھسیڑتے ہوئے سرگوشی کی، "بہت زیادہ دلچسپی کا اظہار مت کرو، کرستا، ورنہ قیمت بڑھا دیں گے۔" اس نے انس کو دکھانے کے لیے مطلق بے تعلقی کا سوانگ رچایا، جو کونے میں بیٹھا انھیں دیکھ رہا تھا۔

"معاف کرنا،" کرستا نے کہا۔ وہ ایسی عورت نظر آ رہی تھی جو بات بات پر معذرت کرتی ہو۔ اس نے تختی کو احتیاط کے ساتھ میز پر رکھ دیا، پھر اپنے لمبے بالوں کو پکڑ کر گردن سے ہٹایا اور ہاتھ سے پسینہ پونچھنے لگی۔ "یہ مناسب رہے گی، کیا خیال ہے،" اس نے ساز باز کرنے والے لہجے میں پوچھا، "داخلے کی میز پر؟"

سینڈی نے تو ثیق میں سر ہلا دیا۔ "شرطیہ کہتی ہوں کہ تمھاری کزن کو پسند آئے گی۔"

لیکن تختی کو کچھ دیر تک دیکھنے کے بعد کرستا آگے بڑھ گئی، سینڈی پیچھے پیچھے گھسٹتی آئی۔ "کیا ہوا؟ دل سے اتر گئی کیا؟" اس نے پوچھا۔

"معاف کرنا،" کرستا بولی۔ "میں دیکھنا چاہتی تھی کہ ان کے پاس اور کیا ہے۔"

''یہاں سے فراغت پا کر چلو پال بولز کا مکان دیکھنے چلیں،'' سینڈی بولی۔

مراد نے حیرت سے سوچا کہ کیا کبھی پال بولز سے پیچھا چھڑانا ممکن ہو سکے گا، اور ان درجنوں سیاحوں سے جو اس کی خاطر کھنچے کھنچے طنجہ چلے آتے تھے، اس زمانے کے بارے میں تاسف محسوس کرتے ہوئے جسے انھوں نے دیکھا بھی نہ تھا۔ کیا یہ اُس کی جیک کیروواک اور ایلن گنز برگ سے دوستی کا نتیجہ تھا؟ اسرار کی وہ فضا جس میں اس کی شادی اور معاشقے لپٹے ہوئے تھے؟ وہ اسطور جو وہ گھڑتا رہتا تھا؟ اور ان سے بھی بالا، مراد کو گمان تھا، یہ اس کی کہانیاں ہی تھیں جو سالہا سال انھیں جوق در جوق یہاں لے آتی تھیں۔ مراد کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب وہ اس مصنف کو ایک ترغیب کے طور پر استعمال کرتا تھا، سیاحوں کو شہر کے گائیڈڈ ٹورز پر لے جانے کے لیے اس کا لالچ دلاتا تھا، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ اس سے بیزار ہو گیا تھا۔

وہ کاؤنٹر پر پھر اپنی کہنیاں ٹکا کر جھک گیا اور دوبارہ اپنی کتاب کھول لی۔ وہ یہ تاثر دینا چاہتا تھا جیسے مطالعے میں کھویا ہوا ہو، اور اسے امید تھی کہ انس، جو اپنے اسٹول سے بس کھڑا ہو رہا تھا، ان دونوں عورتوں کو بھگت لے گا تاکہ اسے بھگتنا نہ پڑے۔

''کاش وہ داخلے کے لیے کھلا ہوا ہو۔ شاید ہم وہاں ایک تصویر لے سکیں،'' سینڈی نے کہا۔ اپنے پٹ سن کے تھیلے کو تھپتھپاتے ہوئے اس نے اضافہ کیا، ''میں کیمرا ساتھ لیتی آئی ہوں۔''

''میں آج فوٹو کھنچوانے کی حالت میں نہیں ہوں۔''

''ارے چھوڑو۔ تم بالکل ٹھیک ٹھاک نظر آ رہی ہو۔''

''پتا ہے، مجھے نہیں معلوم کہ میں نے بولز کی کوئی کتاب پڑھی ہو۔''

''ہوش میں تو ہو؟ The Sheltering Sky بھی نہیں؟''

کرسٹا نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''معاف کرنا۔''

''ہیں؟ تب تو ہمیں وہاں ضرور جانا چاہیے۔ مزہ آئے گا، تم دیکھنا۔''

''تو وہ طنجہ میں رہا تھا؟''

''ہاں۔ انیس سو تیس کی دہائی میں یہاں آیا تھا۔ اسے ایلس بی ٹوکلس نے مراکش جانے کا مشورہ دیا تھا،'' سینڈی نے بتایا۔ ''اور گرٹروڈ اسٹائن نے تائید کی تھی، چنانچہ وہ یہاں آ پہنچا۔''

''اوہ، واقعی؟'' کرستا نے خالی الذہنی سے کہا۔ ''اسے دیکھو۔'' اس نے ٹھوس پیتل کے ایک گھڑنعل کی شکل کے آئینے کی طرف اشارہ کیا جو دیوار پر لگا ہوا تھا، اور اپنا عکس دیکھ کر اپنے بھورے بھورے بال چہرے سے ہٹائے اور اپنی قمیص کو کھینچا۔

مراد کے لیے اپنے سوانگ کو قائم رکھنا دوبھر ہو رہا تھا، خود کو عورتوں کی گفتگو کی سن گن لیتے پا کر کتاب کی سطریں پھر اس کے سامنے گڈمڈ ہونے لگی تھیں۔ اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اسے انگریزی بھی آتی ہے، اور اگرچہ انس برنر، عربی، اور ہسپانوی بولتا تھا، اس کی انگریزی محض ہیلو اور گڈبائی تک محدود تھی۔ مراد کو پتا تھا کہ اگر عورتوں نے کچھ خریدنے کا فیصلہ کیا تو انجام کار اسے یہ انکشاف کرنا ہی ہوگا کہ وہ ان کی باتیں سمجھ گیا ہے، لیکن اس وقت وہ اپنی آنکھیں اپنی کتاب پر ہی جمائے رہا، ہر چند کہ ان کی گفتگو بھی سنتا رہا۔

''وہ اپنی موت تک یہیں رہا تھا۔''

''کون؟''

''بولز،'' سینڈی نے جواب دیا، برہمی کی وجہ سے اس کی آواز اونچی ہو گئی تھی۔

''معاف کرنا،'' کرستا نے کہا۔ ''تو اس کا مطلب ہے، وہ مراکش سے اچھی طرح واقف تھا۔''

''خود مراکشیوں سے زیادہ اچھی طرح۔''

جب وہ چھوٹا سا لڑکا تھا، مراد نے یاد کیا، اس کا باپ رات کے وقت رافیہ کی چٹائی پر آلتی پالتی مار کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا اور اسے اور اس کی بہن لامیہ کو کہانیاں سنایا کرتا۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب ان کا کنبہ ہنوز شہر کے بیوپاری علاقے کے ایک اپارٹمنٹ میں رہتا تھا، جڑواں بچوں اور ایک اور بچے کی پیدائش سے پہلے، اس سے پہلے جب انھیں باپ کے مرنے کے بعد مدینہ کے ایک اپارٹمنٹ میں اٹھ آنا پڑا جس میں سونے کا ایک ہی کمرہ تھا۔ وہ کہانیاں اسے صرف کہیں کہیں سے یاد رہ گئی تھیں، چند نام جیسے نجا اور عائشہ اب اس کے شعور میں بیدار ہو رہے تھے، کسی منحنے کے ٹکڑوں کی طرح جنھیں وہ از سرِ نو مرتب کرنے سے قاصر تھا۔ اس احساس کے ساتھ وہ بیک وقت خود کو برہم اور

رنجیدہ محسوس کرنے لگا، جیسے ابھی ابھی معلوم ہوا ہو کہ اس کی ذات کا ایک حصہ کہیں گم ہو گیا ہے۔ وہ بڑی دیر تک صفحے کو تکتا رہا، کسی ایک مکمل کہانی کی یاد کی بازیافت کی کوشش میں۔

اس کی چشم خیال میں غولوں اور جنوں کے پیکر ٹمٹما گئے، لیکن وہ ان میں سے کسی ایک کو بھی گرفت میں قائم نہیں رکھ سکا۔ اس کا باپ ہر کہانی کی ابتدا ''یکی بود، یکی نبود''، یعنی ''یکی بود، یکی نہ بود'' یا ''ایک دفعہ کا ذکر ہے'' سے کرتا تھا۔ زمان و مکان کی قیود سے آزاد یہ ابتدا بہت مناسب تھی، اسے خیال آیا، اس کیفیت کے لیے جس کا وہ اس وقت تجربہ کر رہا تھا، یہ یقین سے جاننے سے قاصر کہ وہ کہانیاں جو اسے یاد آ رہی تھیں حقیقی تھیں یا اس کے طلسم خیال کی گرہ۔ اس کے باپ کی عمیق دبی دبی سی مردانہ آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگی، قوی اور بڑی سہار والی، اور اچانک وہ کارایک کہانی آہستہ آہستہ سلجھنے لگی، عائشہ قندیشہ کی کہانی۔ باپ سے یہ کہانی سننے کے کئی دن بعد تک مراد کو بڑے ڈراؤنے خواب نظر آتے رہے تھے کہ بکری کے پایوں والی ڈائن اس کا تعاقب کر رہی ہے، بڑی میٹھی آواز میں اس کا نام لے لے کر پکار رہی ہے، اور مراد کو پلٹ کر اسے دیکھنے کی اکساہٹ ہو رہی ہے، لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ اسے معلوم ہے کہ وہ اس پر جادو کر دے گی۔

''اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' کرستا نے پوچھا۔ اس نے ایک بربر غالیچے کی طرف اشارہ کیا جو چھت سے ٹنگا تھا۔

''بے حد خوبصورت ہے،'' سینڈی نے کہا۔ ''ہاتھ کا بہت اچھا کام بھی ہے۔''

''مجھے تو بس یہ جانوروں کے نقش بڑے لبھاؤنے لگ رہے ہیں،'' کرستا بولی۔ ''یہ شادی کے تحفے کے طور پر بے مثال رہے گا، ہے نا؟''

''ہوشیار، تم کچھ زیادہ ہی اشتیاق کا اظہار کر رہی ہو،'' سینڈی نے کہا۔

''ہیلو،'' انس بولا۔

''دیکھا،'' سینڈی نے کہا۔ وہ انس کی طرف دیکھ کر مسکرائی، لیکن ایک دوری کے سے انداز سے، جس سے عیاں تھا کہ اسے کوئی خاص دلچسپی نہیں، چنانچہ، براہ کرم، اس کا ذکر بھی نہ کریں۔ انس خوش دلی سے مسکرایا، اس کی انگریزی دانی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ وہ ایک فٹ بال شرٹ اور رنگ اڑی جینز پہنے، اور اپنے زرد رنگ کے بلغہ میں پیر گھسیٹتے ہوئے بتی کے سوئچ کی طرف بڑھا اور اسے

Scanned with CamScanner

دبا دیا، جس سے شوکیس منور ہو گئے۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ خواتین اگر چاہیں تو بڑی خوشی سے بالائی منزل کا مال بھی دیکھ سکتی ہیں، لیکن وہ اپنی جگہ ہی پر رہیں، غالیچے کے بارے میں مکمل یقین۔

ایک سال پہلے جب مراد طنجہ واپس ہوا تھا تو سیدھا گھر گیا تھا اور باہر نکلنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ خاندانی تقریبات سے دور رہتا، باہر کے چھوٹے موٹے کام کرنے سے انکار کر دیتا، ہمسایوں کے ساتھ سا کر کھیلنے کی پیشکشیں ٹھکرا دیتا۔ ہر کسی کو معلوم تھا کہ اس نے ہسپانیہ جانے کی کوشش کی تھی، اور اب ان سبھوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ وہ پکڑا گیا تھا اور زبردستی واپس اپنے ملک بھیج دیا گیا تھا۔ چنانچہ وہ گھر ہی پر اپنی ماں کے ساتھ رہنے لگا تھا، پڑوس کے دوسرے بے روزگار نوجوانوں کے ساتھ کیفے لا لیبرتے میں چائے کا ایک گلاس پینے سے بھی عاجز۔ وہ گھر میں اپنی ماں کو کام کرتے دیکھتا رہتا، صفائی کرتے یا کھانا پکاتے ہوئے ہاتھوں کی ہر جنبش کے ساتھ اس کی کلائی کے کڑے کھنکتے رہتے۔ اس نے ان کڑوں کو مانگنے سے پہلے ایک اچھی خاصی مدت کے گزر جانے کا انتظار کیا تھا، پھر اس سے کہا تھا کہ انھیں بیچ دے تا کہ وہ ہسپانیہ جانے کی ایک اور کوشش کرے۔ ''تمھارا دماغ تو نہیں چل گیا؟'' ماں نے کہا۔ ''ابھی تک سبق نہیں سیکھا؟ میں یہ کبھی نہیں بیچنے والی، سو مجھ سے دوبارہ مت کہنا۔'' لیکن مراد اس سے بار بار کہتا رہا، اور ہر بار ماں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ ''روٹی ادھر دو،'' وہ کہتی، یا ''لگتا ہے بارش ہونے والی ہے۔'' وہ یوں ظاہر کرتی جیسے اس کی غیر محتاط بات سے صرف نظر کر کے وہ اس پر احسان کر رہی ہے۔ اس طرح نظر انداز کر دیے جانے پر اسے اشتعال محسوس ہونے لگتا۔ اس وقت وہ ماں کے ساتھ اپنا بیشتر وقت گھر ہی پر گزار رہا تھا۔ بہن کی شادی ہو چکی تھی اور وہ اپنے گھر سدھار گئی تھی، جڑواں بھائی ہنوز کالج میں پڑھ رہے تھے، اور چھوٹا بھائی دن کا زیادہ حصہ اسکول میں گزارتا تھا۔ وہ ایک عمر رسیدہ جوڑے کی طرح تھے، ساتھ ساتھ ناشتہ کرتے، ساتھ ساتھ ٹی وی دیکھتے، اور وہ آوازیں جو سارا دن نکالتے ان کے تیزی سے عادی ہوتے جا رہے تھے — اس پانی کی غڑغڑاہٹ جو وہ وضو کے لیے استعمال کرتی، الماری کے دروازے کی چرچراہٹ جب وہ اپنی قمیص نکال رہا ہوتا۔ جب اس کے بہنوئی، لامیہ کے شوہر، نے بتایا کہ اس کے کسی گاہک کو، ایک بوڑھے کو جس کے بچے ہجرت کر کے اسرائیل چلے گئے تھے، اپنی دکان میں ایک مددگار کی ضرورت ہے، تو مراد نے اس پیشکش کو جھٹ قبول کر لیا۔

ملازمت کر کے بھی مراد یہ سوچنے سے باز نہیں رہا کہ آگے کیا ہے۔ اگر اس نے ہسپانیہ میں قدم نہ دھرا ہوتا تو ہو سکتا تھا کہ فلاسیوں کو ذہن سے خارج کرنا زیادہ آسان ہوتا؛ لیکن وہ طریفہ تک پہنچ گیا تھا، سو اب وہ ہر روز بیٹھا اس زندگی کے دن سپنے دیکھتا رہتا جو وہ سوچتا کہ اس کی ہو سکتی تھی۔ اب اسے احساس ہوا کہ اس سے غلطی ہوئی ہے۔ وہ اپنے متخیلہ مستقبل میں یوں ڈوب گیا تھا کہ اس طرف اس کی توجہ ہی نہیں گئی کہ یہ کس طرح، تھوڑا تھوڑا کر کے، اس کے اندر کسی چیز پر حاوی ہوتا جا رہا ہے۔ وہ مستقبل میں زندگی گزار رہا تھا، اپنے ساری آئندہ کلوں کا کسی بہتر جگہ میں تصور کر رہا تھا، یہ احساس تک کیے بغیر کہ اس کا ماضی اس کے ہاتھ سے دور نکلا جا رہا ہے۔ اور اب، جب اس نے مستقبل کا خیال کیا، اس نے خود کو اپنے بچوں کے سامنے دیکھا، ایک گونگے کی طرح، جیسے اس کی زبان کاٹ دی گئی ہو، انھیں وہ کہانیاں سنانے سے قاصر ہو جو اس نے بچپن میں سنی تھیں۔ اس نے حیرت سے سوچا کہ کیا مستقبل کی خاطر ہمیشہ ماضی کو قربان کرنا پڑتا ہے؟ یا یہ ایسی بات تھی جس کا تنہا وہی مرتکب ہوا تھا، کوئی چیز جو صرف اسی سے مخصوص تھی، اپنے کو بہت زیادہ بھر لینے کی نااہلیت، چنانچہ متخیلہ مستقبل کے ہر ٹکڑے کے لیے اسے بڑے ٹھوس ماضی سے دست کش ہونا ضروری ہے؟

"بے حد شاندار ہے،" کرسنا نے سرگوشی کی۔

"بے حد خوبصورت (Muy lindo)،" انس نے کہا۔

کرسنا اوپر ہندسی صورت کو دیکھتے ہوئے شائستگی سے مسکرائی۔ سینڈی نے لمبی سانس بھری۔

"خیر، اب کہ وہ یہاں آ ہی چکا ہے، اس سے پوچھو کہ یہ غالیچہ مراکش کے کس علاقے کا ہے۔"

کرسنا انس کی طرف مڑی اور اپنے غیر ملکی ہسپانوی لہجے میں سینڈی کا سوال دہرا دیا۔ اس نے جواب کا انتظار کیا اور پھر سینڈی کے لیے اس کا ترجمہ کیا۔ "ناظر کا؟ ناظور؟ ایسی ہی کسی جگہ کا۔"

"آہ۔ روایتی بربر قالین عام طور پر حرارت کا تاثر دینے والے رنگوں کے ہوتے ہیں، جیسا یہ ہے۔ اور جانوروں کے موتیف کو تو دیکھو۔ قدیم امریکی باشندوں کی تصویروں کی یاد تازہ کر دیتے ہیں، ہے نا؟"

کرسنا نے تائید میں سر ہلا دیا۔

غالیچہ ایک ایسی کارگاہ سے آیا تھا جو "فیلول بازار اینڈ گلفس" سے بیس سال سے زیادہ عرصے

Scanned with CamScanner

سے لین دین کر رہی تھی۔ صرف دو ماہ پہلے ہی اس کا مالک فوت ہوا تھا اور اس کا لڑکا تازہ ترین کھیپ لے کر آیا تھا، اور ایک ایک قالین کو خود ہی ڈھو کر دکان میں پہنچا بھی گیا تھا۔ یہ یاد ایک اور یاد کو اپنے جلو میں لے آئی، اور یوں مراد کو اپنے باپ کی سنائی ہوئی ایک اور کہانی یاد آ گئی، ایک نوجوان قالین ساز کی کہانی اور اس انتقام کی کہانی جو اس نے ان لوگوں سے لیا تھا جو اس کی محبوبہ کو اٹھا لے گئے تھے۔

''چائے پئیں گی؟'' انس نے پوچھا۔

''اوہ، اس کی ضرورت نہیں،'' کرستا نے کہا۔ ''پوچھ رہا ہے کہ کیا ہم چائے پینا پسند کریں گی۔''

''میں سمجھ گئی تھی،'' سینڈی بولی۔ ''یقین جانو، یہ چاہتے ہیں کہ تم چائے پیو۔''

کرستا اپنی دوست پر یقین کرتی ہوئی نہیں لگی، لیکن بہرحال اس کی بات رکھ لی۔

''سی [ہاں]،'' سینڈی نے انس سے کہا، خوب زور سے سر ہلا کر۔

انس مسکرایا اور مراد کو اشارہ کیا کہ چائے لینے جا رہا ہے۔

''یہ تمھیں بے وقوف بنا کر کچھ نہ کچھ ضرور خریدوا ہی دیں گے، یہ تو ہونے ہی والا ہے،'' سینڈی نے کہا، ''تو جب تک یہاں ہیں کم از کم چائے ہی پی لیں۔'' وہ کونے میں ایک کرسی پر جا بیٹھی اور اپنے اردگرد دیکھنے لگی۔ ''شاید بعد میں ہم ان میں سے ایک آدھ کیفے کی زیارت بھی کر لیں جہاں بوژ جایا کرتا تھا،'' اس نے امید کے ساتھ کہا۔ اچانک اپنے دائیں طرف ایک چرمی ٹرنک کو دیکھ کر وہ اس پر جھکی اور میخوں سے جو نقش بنا تھا اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھنے لگی۔ گرد کی تہہ پر اس نے اپنی انگلی سے کچھ لکھ دیا۔

کرستا، جو اپنا پرس گود میں ڈالے خاموش بیٹھی تھی، مراد کو دیکھنے کے لیے مڑی اور، یہ جانتے ہوئے کہ اس نے اسے ایسا کرتے ہوئے دیکھ لیا ہے، اسے معذرت کی نگاہ سے دیکھا۔ مراد اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا اور کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل آیا۔ وہ چائے کی ایک گول میز کو گھسیٹتے ہوئے لایا اور اسے لڑکیوں کے سامنے ٹانگوں پر کھڑا کر کے جما دیا۔ ''ویلکم، ویلکم،'' اس نے کہا۔

اگر سینڈی کو تعجب ہوا تھا تو بھی اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا، جیسے وہ اس کے انگریزی میں بولنے کی پہلے ہی سے متوقع ہو۔

''سچ مچ، چائے کی کوئی ضرورت نہیں،'' کرستا نے کہا۔

''براہ مہربانی،'' وہ بولا۔ ''ہمیں اس سے بڑی مسرت ہوگی۔'' وہ بیٹھ گیا، اپنی ایک ٹانگ دوسری پر چڑھالی۔ ''تو آپ پال بوئر میں دلچسپی رکھتی ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''بالکل،'' سینڈی نے کہا۔ اس کا چہرہ دمکنے لگا۔ ''آپ نے اسے پڑھا ہے؟''

مراد نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

''مجھے اس کی کتابوں سے عشق ہے،'' وہ اپنے چہرے سے ہاتھ ہلا کر مکھی کو اڑاتے ہوئے بولی۔ اس کی سبز رنگ کی آنکھوں پر کجل کی لکیر کھنچی تھی۔ ''وہ اتنا زبردست قصہ گو ہے۔''

''تو پھر، ہم جب تک چائے کا انتظار کر رہے ہیں، کیا میں آپ کو ایک کہانی نہ سناؤں؟'' مراد نے پوچھا۔

سینڈی کی آنکھیں اشتیاق سے چمکنے لگیں، اور اس نے بڑے لطف سے کرسی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''بالکل!''

''ایک دفعہ کا ذکر ہے، غوماری نام کا ایک قالین ساز ہوا کرتا تھا۔ ملک بھر میں اس کے بنائے ہوئے گلکاری کے قالینوں کی دھوم تھی اور انھیں سراہا جاتا تھا، اور لوگ بڑی دور دور سے اس کی صناعتوں کو خریدنے آتے تھے۔ غوماری ایک نوخیز حسین دوشیزہ سے محبت کرتا تھا، جس سے اس کی شادی کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ وہ ایک موذن کی بیٹی تھی اور اس کا نام جان آرا تھا۔ گاہے بگاہے جان آرا غوماری کو کام کرتا دیکھنے چلی آتی تھی، اور وہ اس سے پوچھتی کہ اس کے جہیز کے لیے مناسب رقم جمع کر لینے میں اسے کتنا وقت لگے گا۔ 'مجھے مزید دس قالین بیچنے ہوں گے،' وہ کہتا، 'یا صرف سات اور، میری جان،' اور وہ جواب میں مستقل یہی کہتی، 'اچھا، تو پھر جلدی کرو اور انھیں بیچو، تاکہ ہماری شادی ہو جائے۔'

''ایک دن بھری دوپہر میں جان آرا غوماری کو اپنی دکان میں کام کرتا دیکھنے پہنچ گئی۔ چونکہ گرمی ناقابل برداشت تھی، بے چاری نوخیز جان آرا سڑک کے رخ اپنے چہرے سے نقاب اٹھا کر بیٹھ گئی۔ ٹھیک اسی لمحے، بونا عربو، جو اتنا ہی بدصورت تھا جتنا شر پسند، اتفاق سے وہاں سے گزرا، اور جب اس نے دیکھا کہ غوماری کسی سے بات کرنے میں مصروف ہے جو اسے نظر نہیں آ رہا، وہ دکان میں کود کر آیا اور جان آرا کو بے پردہ دیکھ لیا۔ وہ اس کے حسن پر دم بخود رہ گیا۔ اور جب غوماری نے

اسے کوستے ہوئے دکان سے باہر نکال دیا اس وقت بھی اس کی زبان گنگ تھی۔

"بس تبھی سے عربو جان آرا کو ڈرانے دھمکانے لگا؛ وہ جہاں کہیں بھی ہوتی، خواہ بازار جا رہی ہوتی خواہ حمام، یونہی اس سے اپنی محبت کا اظہار کرتا۔ جان آرا اس پر چلاتی۔ 'تیری بیوی بننے سے تو میں مر جانا بہتر سمجھتی ہوں۔' عربو انتقام لینے کے منصوبے بناتا ہوا چلا جاتا۔ وہ اپنے آقا سلطان کے پاس گیا اور بولا کہ اس نے پورے ملک میں حسین ترین عورت کو دیکھا ہے، لیکن اس کا بیاہ ایک گنوار قالین ساز کے ساتھ طے کر دیا گیا ہے۔ یہ سن کر سلطان نے کہا، 'یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک قالین ساز کی بیوی میری بیوی سے زیادہ حسین ہو۔ سو تم وہی کرو جو تمھیں کرنا چاہیے۔' تو یوں ہوا کہ عربو موذن کے مینار پر چڑھ کر اذان دینے کی گھات میں بیٹھ گیا تا کہ جان آرا کو گھر سے اٹھا کر سلطان کے حرم میں پہنچا دے۔ بے چاری لڑکی بے رحم سلطان سے زبردستی بیاہ دیے جانے پر بڑے دنوں تک آنسو بہاتی رہی، اور سلطان کا کوئی تحفہ بھی اسے رونے سے باز نہ رکھ سکا۔

"بے چارے غوماری کو معلوم تھا کہ سلطان سے لڑنے کا، جس نے اس کی محبوبہ کو اغوا کیا ہے، کوئی فائدہ نہیں ہوگا، سو اس نے اپنی ساری توجہ اپنے منقش قالینوں کو بنانے پر مرکوز کر دی اور ان میں اپنا سارا غم نچوڑ کر ڈال دیا۔ اس نے ایک قالین بافت کیا جس میں جان آرا کو اس کے حسن کی تمام جلوہ سامانی کے ساتھ دکھایا، چہرہ بے نقاب، ہاتھوں میں ایک لمبی سی چھری، جس سے غوماری کی خواہش انتقام کی نمائندگی ہوتی تھی۔ جب قالین مکمل ہوا تو وہ خود اپنی تخلیق کی کاملیت پر انگشت بدنداں رہ گیا، جو اتنی جیتی جاگتی تھی کہ یوں معلوم ہوتا جیسے جان آرا بہ نفس نفیس بالکل اس کی نگاہوں کے سامنے کھڑی ہو، وار کرنے کے لیے تیار۔ غوماری نے اپنے اور جان آرا کے باپ کو بلایا اور انھیں قالین دکھایا۔ وہ بھی اسے دیکھ کر حیران رہ گئے، چنانچہ انھوں نے یہ بات جا کر اپنی بیویوں کو بتائی، جنھوں نے اپنی بہنوں کو بتائی، جنھوں نے اپنے شوہروں کو...

"اور یوں، ہر رات، اندھیرا پھیلنے کے بعد، غوماری اپنی دکان بند کرتا اور اس غایت درجے کے شاندار قالین کو دکھانے کے لیے مجلسیں کرتا، تا آنکہ عربو تک بھی اس کی خبر پہنچ گئی۔ اس نے سلطان کو قالین کا ماجرا سنایا، اور اسے، ظاہر ہے، جلد ہی ضبط کر لیا گیا اور غوماری کو قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ جب سلطان نے قالین پر نگاہ ڈالی تو ایک بار پھر جان آرا کے انتہائی حسن سے متاثر ہوا، لیکن

اس سے بھی زیادہ اس کے چہرے کے خوفناک تاثر سے۔ اس نے قالین اپنے درباریوں کو دکھایا اور ان کے ردِعمل سے لطف اندوز ہوا، اور اسے اپنی خواب گاہ میں ٹنگوا دیا۔ جب اس نے جان آرا کو اگلی مرتبہ دیکھا تو اسے بتایا کہ اگلی صبح خماری کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ جان آرا نے اپنے منگیتر کی موت پر کسی رنج و غم کا اظہار نہیں کیا۔ سلطان نے اپنے وفادار عربو سے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ عربو نے کہا کہ شاید جان آرا کو آخر کار عقل آ گئی ہے۔ "اگلے چند ہفتوں میں جان آرا خوش نظر آئی، عربو سے گپ شپ اور لطیفے بازی کرتی رہی۔ 'تو عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں،' عربو نے اپنے آقا سے کہا۔ 'کبھی کبھی ان کے ساتھ سختی برتنی پڑتی ہے جس سے پہلے وہ نہیں جانتیں کہ کیا چیز ان کے لیے بہتر ہے۔'

"ایک رات جان آرا نے عربو سے کہا اسے مدتوں سے ایک خوبصورت دست بند کی آرزو رہی ہے، لیکن اس کا مالک، جو اس کے محلے کا ایک جوہری ہے، اسے خود سے جدا نہیں کرنا چاہتا۔ عربو نے کہا، 'مالکہ، آپ فکر نہ کریں، میں یہ آپ کے لیے آج رات ہی لے آؤں گا۔' اور یوں عربو، اپنے آقا کا پہرا دینا چھوڑ کر، ملح کی طرف روانہ ہوا۔ جان آرا، چھری ہاتھ میں اُٹھائے سلطان کی خواب گاہ میں داخل ہوئی۔"

انس ایک چائے دانی اور تلے اوپر رکھے چار گلاس لیے لوٹا جنھیں اس نے میز پر رکھ کر چائے ڈالنی شروع کی۔ "بڑی میٹھی ہے،" کرستا نے اپنی چائے چکھ کر کہا۔ "بے حد لذیذ۔"

"تمھاری کہانی کا انجام کیا ہوتا ہے؟" سینڈی نے پوچھا۔

"جان آرا نے چھری سلطان کے گلے پر رکھ دی، جو دہشت کے مارے اُٹھ بیٹھا۔ اس نے اپنے وفادار عربو کو آواز دی، لیکن بونا تو تخیلی دست بند لینے گیا ہوا تھا۔ سلطان نے بڑی آہ و بکا کی اور خوف کے مارے تلملانے لگا۔ اس کے درباری بھاگے بھاگے آئے اور جان آرا دیوار پر ٹنگے قالین کے پیچھے چلی گئی۔ 'وہ مجھے قتل کرنے کے درپے ہے!' اس نے چیخ مار کر کہا اور نوجوان لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ 'لیکن، جہاں پناہ، یہ تو دیوار پر آپ کا قالین لٹکا ہوا ہے۔' سلطان نے چلا کر اسے گرفتار کرنے کے لیے کہا، لیکن اس کے خدام میں سے کسی نے جنبش تک نہ کی۔

"'اس کی عقل جاتی رہی ہے،' وزیرِ اعظم نے کہا، اور وہ سلطان کے چھوٹے بھائی کو یہ خبر سنانے چل دیا، جسے سلطان نے ایک اندھیری کوٹھڑی میں قید کر رکھا تھا۔ وزیر اس آدمی کی خوشامد

درآمد میں لگے رہنا چاہتا تھا جو جلد ہی اس محل کی جگہ تخت پر بیٹھنے والا تھا۔ درباری اپنے آقا کے پاگل ہو جانے پر تاسف سے سر ہلاتے ہوئے ایک ایک کر کے وہاں سے سرک گئے۔ جب دروازہ بند ہو گیا، تو جان آرمانے بالآخر چھری سلطان کے نرخرے پر رکھی اور اسے قتل کر دیا۔

''اس نے اور غوماری نے انتہائے کار اپنا انتقام لے لیا۔''

''اوہو،'' سینڈی نے کہا۔ ''بڑی بہیمانہ حرکت تھی۔''

کرستا غالیچے کو دیکھنے کے لیے پیچھے مڑی۔ انس نے گلاس دوبارہ بھر دیے اور پوچھا، ''غالیچہ آپ کو پسند آیا؟''

''سی،'' کرستا نے کہا۔

سینڈی ہنس پڑی۔ ''واقعی، کرستا، بس اتنے ہی میں لٹو ہو گئیں؟''

''خیر، میرا خیال ہے یہ میری کزن کے ملاقاتی کمرے میں خوب جچے گا،'' کرستا نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں اسے خرید رہی ہوں۔''

''ٹھیک ہے،'' سینڈی نے کہا۔ ''چلو اب لے کر یہاں سے رخصت ہوں۔ میں اس سے پہلے کہ داخلے کا وقت نکل جائے میں بولٹر کے گھر پہنچ جانا چاہتی ہوں۔'' اس نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔

''کیا قیمت ہے؟'' کرستا نے دریافت کیا۔

''Mil quiniento،'' انس نے جواب دیا۔

''پندرہ سو مانگ رہا ہے،'' کرستا نے ترجمہ کیا۔

مراد کو خیال گزرا کہ لڑکی شاید انس کو بہت زیادہ پسند آ گئی ہے، کیونکہ اس نے بھاؤ تاؤ اتنی کم قیمت سے شروع کیا تھا۔ غالیچے کی صحیح قیمت بارہ سو تھی، اور اگر یہ بازاری علاقے کی کسی بھڑکیلی دکان میں فروخت ہوتا تو اس سے کہیں زیادہ۔

''یہ بہت زیادہ ہے،'' سینڈی نے اپنی کرسی پر آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا، جیسے بھاؤ تاؤ کرنے کی مشتاق ہو۔ اس کی گائیڈ بکس نے شاید اسے ایسا کرنے کی ہدایت کی ہوگی۔ ''چھ سو۔''

مراد نے اپنی ایک بھوں اوپر اٹھائی۔

''بالکل یہی چاہتی ہو؟'' کرستا نے اپنی دوست سے پوچھا، اس کی طرف دیکھنے کے لیے

مڑتے ہوئے۔ سینڈی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ریڈیو چار بجے کی خبریں نشر کرنے کے لیے کڑکڑایا۔ مراد نے چائے کے گلاس کو چند بار اپنے ہاتھ میں گھمایا۔ "میرے دوست سے بھول ہوگئی ہے۔" اس نے آخرکار کہا۔ "قیمت اٹھارہ سو ہے۔"

سینڈی نے پلک جھپکائی۔ "ایک ہزار،" وہ بولی۔

"بارہ سو،" مراد نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "میری آخری قیمت۔"

"ٹھیک ہے،" کرستانے کہا، اپنا پرس کھولتے ہوئے۔

"تمھیں ای بے (eBay) پر شاید اس کے تین گنا دام مل جائیں،" سینڈی نے کہا اور کندھے جھٹکے۔

کریڈٹ کارڈ پر حساب کتاب کرنے اور غالیچے کو پیک کرنے کا کام انس پر چھوڑ کر مراد کاؤنٹر کے پیچھے اپنی نشست کی طرف لوٹا۔ اس نے اپنی کتاب اٹھائی، اس صفحے کے کونے کو سیدھا کیا جسے نشان لگانے کی خاطر موڑ دیا تھا، اور کتاب ہمیشہ کے لیے بند کر دی۔ اس قسم کی کہانیوں کو مزید پڑھنے کا کیا فائدہ تھا، ضرورت اس بات کی تھی کہ وہ خود کہانیاں لکھے۔ اس نے اپنے باپ کے بارے میں سوچا جو اپنے بچوں کو کہانیاں سناتا تھا، اور کس طرح آج وہ کہانیاں اس کے ذہن سے فراموش ہوگئی تھیں۔ انس نے کیش رجسٹر کو ایک زوردار گھنٹی بجا کر بند کیا، لیکن مراد نے کوئی توجہ نہ دی: وہ اس کہانی میں کھو گیا تھا جسے لکھنا آج رات شروع کرنے والا تھا۔

❀❀

آج کی کتابیں

کہانیاں

آئینۂ حیرت اور دوسری تحریریں	سید رفیق حسین	Rs. 375
عطرِ کافور	نیر مسعود	Rs. 80
تربدا اور دوسری کہانیاں	اسد محمد خان	Rs.180
خطِ مرموز	فہمیدہ ریاض	Rs.100
ایک اور آدمی	حسن منظر	Rs.85
عاقبت کا توشہ	نگہت حسن	Rs.85
دور کی آواز	فیروز ناطق خسرو	Rs.150
صحرا کی شہزادی	سکینہ جلوانہ	Rs.120

کہانیوں کے ترجمے

ایرانی کہانیاں	انتخاب اور ترجمہ نیر مسعود	Rs.90
عربی کہانیاں	ترتیب اجمل کمال	Rs.180
ہندی کہانیاں (جلد 1)	ترتیب اجمل کمال	Rs.180
ہندی کہانیاں (جلد 2)	ترتیب: اجمل کمال	Rs.180
کارل اور اینا	(منتخب ترجمے) محمد سلیم الرحمٰن	Rs.80
گم شدہ خطوط	(منتخب ترجمے) محمد عمر میمن	Rs.90
مہرِ سکوت	(منتخب ترجمے) زینت حسام	Rs.120
کلی سنجارو کی برفیں	(منتخب ترجمے) محمد خالد اختر	Rs 120

نیر مسعود کی کتابیں

عطر کافور

(کہانیاں)

قیمت 80روپے

ایرانی کہانیاں

(ترجمے)

قیمت:90روپے

انیس

(سوانح)

قیمت 375روپے

مرثیہ خوانی کا فن

(تنقید و تحقیق)

قیمت:150 روپے

منتخب مضامین

(تنقید و تحقیق)

قیمت 280روپے

کافکا کے افسانے

(افسانے)

قیمت 70روپے

معرکۂ انیس و دبیر

(تنقید و تحقیق)

قیمت:150روپے

گنجفہ

(کہانیاں)

قیمت 200روپے

اقضال احمد سید

بونیر اسٹریٹ کی رقاصہ

نظم
ان تمام لوگوں سے معذرت کے ساتھ
جن کا گلا
چوک ذبح خانے پر کاٹا گیا،
اس وقت
صرف بونیر اسٹریٹ کی رقاصہ کا تذکرہ کرتی ہے
جسے اس کے گھر سے گھسیٹ کر لایا گیا
اور
ذبح کر دیا گیا

نظم کو نہیں معلوم
اس کی لاش پر پھینکی جانے والی
اس کی تصویریں
اور اس کے محنت سے حاصل کیے ہوئے کرنسی نوٹ

بونیر اسٹریٹ: سوات کی ایک سڑک۔

اٹھا کر لے جانے والے
کون تھے

نظم
صرف یہ جانتی ہے
اُس نے اشتباہ کی مزاحمت کی تھی
اور چاہتی ہے
اُس سے تربیت حاصل کرنے والی
نوعمر لڑکیاں
اپنی مشق جاری رکھیں

آخر میں
نظم اُسے موہن جودڑو کی رقاصہ
(جس کی پرستش کی جاتی تھی)
کے برابر کا درجہ دیتی ہے

تاریخ
نظم سے مشتق ہے

Scanned with CamScanner

اہم جغرافیائی محل وقوع

نیلم، اختر
شیریں جناح
اہم جغرافیائی محل وقوع پر آباد ہیں
کلفٹن اور ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
کے نزدیک
جہاں
ملک کے تمام متوقع اور غیر متوقع مقامات سے
لوگ کھنچ کھنچ کر آ رہے ہیں
جن میں
سجاد بھی ہے

جس سے ایک دن
نادانستہ طور پر ایک نیم بیش قیمت چیز ٹوٹ جانے کے بعد
پوچھا گیا
"یہ کیسے ہوا؟"
"ایسے!"
اس نے کہا
اور اس کی پورے مہینے کی تنخواہ کٹ گئی

شان دار مستقبل میں

ان ٹمک ڈویلپرز
ڈیٹس اور کھٹن سے متصل
لگژری پروجیکٹس اور
زیرِ آب یہ ورثہ مکمل کر دیں گے

اور پھر ایک دن

سجاد
کسی ایسی ہی غلطی پر
اپنی سال بھر کی تنخواہ کٹوانے کے بعد
دوسری صبح
اپنے کام پر حاضر ہو جائے گا
تاخیر کے
بغیر

زمین کا نمک

لیورکوسن میں
ایک دوپہر
ملتان کے ایک ماہر حشرات الارض نے
ریستوران میں اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص سے کہا

"تم دنیا کے نمک ہو" انجیل متی۔

لیورکوسن Leverkusen جرمنی کا ایک قصبہ۔

Scanned with CamScanner

"میرے کھانے میں نمک کم ہے"
"نمک منگوالو"
"نہیں"
اس نے نوجوان ویٹرس پر نظر ڈالتے ہوئے کہا
"تھوڑے سے ذائقے کے لیے
میں اسے تکلیف نہیں دینا چاہتا"

اس کی میز سے
کچن تک کا فاصلہ
دس میٹر سے کم تھا

پائریز یعنی ہم

مشرقی یورپ کے ایک ملک میں
رائے دہندگان کی اکثریت نے
عربوں، سیاہ فاموں، ترکوں
اور دوسری کئی نسلوں کے تارکین وطن
کو مسترد کرنے کے ساتھ ساتھ
سب سے زیادہ پائریزوں کو پناہ دینے
کی مخالفت کی

پائریز: Pirez۔

پائریز
ان کے خیال میں
مکروہ نقوش، پرانی طرز کے لباس پہننے والے،
بسیار خور اور مغلوب الغضب
لوگ ہیں
جو خواتین کا احترام
اور
پھولوں سے محبت کرنا نہیں جانتے

پائریزوں کی
صحیح طور پر ان کے معاشرے میں کوئی جگہ نہیں
پائریزوں کی روئے ارض پر کوئی جگہ نہیں

صرف ان کا نام سردے میں
رائے دہندگان کو گمراہ کرنے کے لیے
ڈالا گیا تھا

❁❁

معین ربانی

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

ایک نئے فلسطین کا جنم

27 دسمبر 2008 کو دن کے ساڑھے گیارہ بجے کے کچھ بعد، جب غزہ میں ہفتے کے پہلے دن کی چہل پہل عروج پر تھی اور بچوں کی ٹولیاں صبح کی شفٹ کے اسکولوں سے گھر لوٹ رہی تھیں، تقریباً 90 اسرائیلی جنگی طیاروں نے غزہ کی پٹی کے 139 مربع میل علاقے کے کوئی سو مقامات پر 100 ٹن سے زیادہ دھماکا خیز مواد برسا دیا۔ چند منٹ کے اندر اندر بیک وقت کیے جانے والے ان حملوں نے 225 سے زیادہ لوگوں کو ہلاک اور کم سے کم 700 کو زخمی کر ڈالا جن میں سے 200 سے زیادہ شدید زخمی ہوئے۔ ان ابتدائی حملوں میں اس سے زیادہ لوگ ہلاک ہوئے جتنے غربِ اردن اور غزہ میں مجموعی طور پر جون 1967 میں اسرائیل کے ان علاقوں پر قبضہ کرنے کے بعد سے کسی بھی ایک دن کے دوران میں ہوئے تھے۔

متواتر ہوائی اور بحری جہازوں سے غزہ کی پٹی کے طول و عرض میں کی جانے والی اس بمباری کا ایک ہفتہ گزرنے پر، 3 جنوری کو اسرائیل نے اس حملے میں توپ خانے کی گولہ باری اور زمینی لشکر کشی کا بھی اضافہ کر دیا۔ جیسا کہ توقع تھی، اس نئے مرحلے نے ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی تعداد میں، جن میں بڑی تعداد فلسطینی شہریوں کی تھی، فوری اور ہولناک اضافہ کر دیا۔ ہلاک ہونے والوں کی تعداد اب 625 تک جا پہنچی۔ کئی واقعات میں محلوں کو فری فائر زون میں تبدیل کر کے پورے پورے خاندان ہلاک کر دیے گئے۔

6 جنوری کو، غزہ شہر میں اقوام متحدہ کے تحت چلائے جانے والے اسما ایلیمنٹری اسکول پر اسرائیلی بمباری میں تین عم زاد بچوں کے مارے جانے کے بعد، جبلیہ پناہ گزیں کیمپ میں واقع الفخورہ اسکول پر — یہ بھی اقوام متحدہ کے زیر اہتمام چلایا جا رہا تھا — شیلنگ کے نتیجے میں 45 فلسطینی شہری ہلاک اور 100 زخمی ہوئے۔ ''اس کے کچھ ہی دیر بعد،'' اگلے دن فنانشل ٹائمز نے خبر دی، ''اسرائیلی فوج نے ای میل کے ذریعے صحافیوں کو یوٹیوب پر ایک وڈیو کا لنک بھیجا جس میں شدت پسندوں کو غزہ میں اقوام متحدہ کے زیر اہتمام ایک اسکول سے فائرنگ کرتے دکھایا گیا تھا — لیکن اس کلپ پر اکتوبر 2007 کی تاریخ پڑی تھی۔'' گارڈین کے مطابق اقوام متحدہ نے ''جواب دہی کے مکمل فقدان'' پر احتجاج کیا اور اس خونریزی کی آزادانہ تحقیقات کا مطالبہ کیا۔ اخبار کے مطابق اقوام متحدہ اسکولوں کو نشانہ بنائے جانے پر خاص طور پر برہم تھی، کیونکہ اسرائیلی فوج کو معلوم تھا کہ یہ اسکول شہریوں کے خاندانوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے ہیں کیونکہ ہوا سے چھپے ہوئے اعلانات گرا کر اور لاؤڈ سپیکروں کے ذریعے انھیں اپنے گھر خالی کر دینے کا حکم دیا گیا تھا۔ اقوام متحدہ کا کہنا تھا کہ اس نے اسرائیلی فوج کو ان اسکولوں کے پناہ گزیں کیمپوں میں تبدیل کیے جانے سے مطلع کر دیا تھا اور گلوبل پوزیشننگ سسٹم (GPS) پر ان کے محل وقوع کی نشان دہی بھی کر دی تھی۔

اس دوران اسرائیل نے اپنے سیاسی ہدف کا صاف لفظوں میں اعلان نہیں کیا ہے۔ ملک کے جنوبی علاقے میں سلامتی کی مساوات تبدیل کرنے کے عنوان کی تشریح کرتے ہوئے اسرائیلی کابینہ کے ارکان نے مختلف قسم کے نتائج حاصل کرنے کی وکالت کی ہے، جن میں حماس کے ساتھ اسرائیل کی تجویز کردہ شرائط پر جنگ بندی کے معاہدے سے لے کر ساحلی علاقے میں حکومت کی تبدیلی اور وہاں سے اسلام پسند حماس تحریک کا مکمل خاتمہ تک شامل ہے۔ اسی طرح اسرائیلی رہنما فیصلہ کن نتائج حاصل کرنے والی مختصر مہم سے لے کر سست رو نتائج والے طویل اور دشوار حملے تک مختلف پیش گوئیاں کرتے رہے ہیں۔

لبنان کے خلاف اسرائیل کی 2006 کی ناکام جنگ کی یادیں چونکہ سیاسی بساط پر موجود ہر فریق کے ذہن میں تازہ ہیں اس لیے موجودہ جنگ کے تقریباً ہر پہلو کو اُسی پچھلی جنگ کے معیارات سے جانچا جا رہا ہے۔ تاہم زیادہ قریبی جائزے سے اشارہ ملتا ہے کہ موجودہ حملوں کا موازنہ 2002

میں غرب اردن کے شہروں پر اور 1982 میں لبنان پر کیے جانے والے اسرائیلی حملوں سے کیا جاتا زیادہ موزوں ہے۔ اُن حملوں پر غور کرنے سے ہمیں یہ بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ غزہ میں آگے کیا ہونے والا ہے۔

19 جون 2008 کو مصر کے توسط سے اسرائیل اور حماس کے درمیان طے پانے والی چھ مہینے کی جنگ بندی ایک اہم سیاسی سنگ میل کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس سے پہلے حماس اور دیگر فلسطینی مسلح تنظیموں کی جانب سے یک طرفہ جنگ بندی کے اعلانات کو اسرائیل یہ کہہ کر مسترد کرتا آیا تھا کہ یہ ''دہشت گردوں کے مابین ہونے والے معاہدے'' ہیں جن کا اسرائیل کے طرزِ عمل پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ دوسری صورت میں اسرائیل صرف ان فلسطینی مذاکرات کاروں سے بات چیت کرنے کے لیے عارضی جنگ بندی پر رضامند ہوتا تھا جو اسرائیل کی پیشگی شرائط کی طویل فہرست کو قبول کر لیتے تھے۔ اس کے برعکس جون 2008 کا معاہدہ، جسے ''تہدیہ'' کا نام دیا گیا، بالواسطہ طور پر ایک ایسی تحریک کے ساتھ کیا گیا جو اسرائیل کو تسلیم نہیں کرتی، 1990 کے عشرے میں شروع ہونے والے اوسلو ''عمل امن'' کو مسترد کرتی ہے اور مزاحمت کو ایک قابلِ عمل متبادل قرار دیتی ہے۔ اسی طرح حماس نے امریکہ کی قیادت میں عائد کیے جانے والا سخت بائیکاٹ، اسرائیل اور مصر کی جانب سے محاصرہ اور اسرائیل کے روز بروز بڑھتے ہوئے خونریز حملے برداشت کرنے کو ترجیح دی اور امریکہ اور یورپ کے یہ مطالبات (جن کی پشت پناہی اقوام متحدہ اور کسی قدر نیم دلی سے روس بھی کر رہا تھا) مسترد کر دیے کہ وہ 1993 کے (اب کالعدم) وسلو معاہدے اور (مردہ پیدا ہونے والے) 2003 کے ''روڈ میپ'' کی مختلف شرائط کو قبول کر لے۔ حماس کا موقف تھا کہ اس کی طرف سے ان دونوں دستاویزات کو قبول کر لینے کا مطلب خود کو اس ''نئے مشرقِ وسطیٰ'' کا ایک ضمنی حصہ بنا لینا ہوگا جس کے ''دروزہ'' کی نشان دہی امریکی سیکرٹری خارجہ کونڈولیزا رائس نے 2006 میں لبنان پر ہونے والی بمباری میں کی تھی۔

اسرائیل کے لیے تہدیہ 1981 میں — امریکہ اور اقوام متحدہ کے توسط سے — اپنے سابق بڑے حریف پی ایل او کے ساتھ ہونے والی جنگ بندی سے کم بڑی سیاسی ضرب نہ تھی۔ ایک بار پھر اسے اپنے ایک ایسے دشمن کے ساتھ معاہدہ کرنا پڑا تھا جسے ناجائز ٹھہرانے کی اس نے ہر ممکن کوشش کی

تھی اور کسی ملک کو اس کے ساتھ مذاکرات کرنے کی اجازت نہ دی تھی۔ 1980 کے عشرے کے اوائل کے پی ایل او کی طرح یہ دشمن بھی صیہونیت کو سختی سے مسترد کرتا ہے اور خود اپنے مسخ انداز میں واضح کر دیتا ہے کہ وہ دو ریاستوں والا حل قبول کرنے کو تیار ہے۔

تہدیہ بھی وسیع معنوں میں اسی قسم کے اسباب سے کیا گیا۔ 1981 کی جنگ بندی اس لیے درکار تھی کہ پی ایل او کے توپ خانے اور میزائل کے حملوں کو ختم کیا جا سکے جن کے باعث، 1981 کی "چھوٹی جنگ" میں شمالی اسرائیل میں، سیاحوں کے سیزن کے عروج پر، زندگی ٹھپ ہو کر رہ گئی تھی اور اس کے شدید اقتصادی نقصانات ہو رہے تھے، جبکہ 2008 کے آغاز سے اسرائیلی فوجی تجزیہ کار حماس کے فوجی بازو عز الدین القسام بریگیڈ کی صلاحیت میں آنے والی حقیقی تبدیلی کا ذکر کرنے لگے تھے۔ تجزیہ کاروں نے القسام بریگیڈ کو زیادہ مربوط، منضبط اور موثر ہوتی ہوئی فوجی قوت قرار دیا جس کی کمانڈ اور فوری حکمت عملی کی صلاحیتیں بڑھتی جا رہی تھیں اپنے حریف الاقصیٰ شہید بریگیڈ سے (جو 2000-2001 میں مقبوضہ علاقوں میں دوسرے انتفاضہ کے دوران ابھرا تھا اور جس کی وفاداری رسمی طور پر فلسطینی مخلوط حکومت میں شامل بڑے حزب الفتح سے تھی) اس کی مماثلت روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی۔ القسام بریگیڈ کی کارروائیوں سے روز بروز شمال میں واقع اسرائیل کے مضبوط حریف حزب اللہ کی خصوصیات ظاہر ہونے لگی تھیں۔

ایک اضافی پیچیدگی یہ بھی تھی کہ فلسطینی حکومت کا صدر محمود عباس اب اسلام پسندوں کی طرف سے معاہدہ کے لیے دستیاب نہ رہا تھا۔ جون 2007 میں جب غزہ میں حماس نے اقتدار حاصل کیا تو صدر کا ایجنڈے پر سب سے اہم (بلکہ کم و بیش واحد) شق اس "بغاوت" کو ختم کرنا تھا۔ عباس کے کلیدی معاون اور رام اللہ میں مقیم وفادار حکومت کے اہلکار — بعض اوقات آن دی ریکارڈ مگر بیشتر نجی گفتگو میں — اسرائیل اور رام اللہ کی فلسطینی حکومت کو ایک اتحاد کے فریق قرار دیتے جو ایک "مشترکہ دشمن" کا مقابلہ کر رہے تھے اور مزید یہ کہ ان کا دشمن ایران اور شام کی شہ پر کارروائیاں کر رہا تھا۔ عباس کے کیمپ میں بہت سے لوگ معاملے پر کچھ یوں نظر ڈالتے تھے، غزہ میں حماس کے اقتدار کے لیے خطرہ بن سکنے والے الفتح اور دیگر گروہوں کو غیر مسلح اور بے اثر کر دیا گیا تھا: اسلام پسندوں کے خلاف کسی عوامی احتجاج کے امکانات نہایت قلیل تھے، اور بائیکاٹ اور محاصرے سے ان

کے فلسطینی حریف کا اقتدار متاثر نہیں ہو رہا تھا۔ چنانچہ اسرائیلی فوج ہی ان کی تقدیر میں کسی تبدیلی کی بہترین، اور شاید واحد امید تھی۔

تاہم اسرائیل اس وقت تک اتحاد میں عملی شراکت کے لیے تیار نہ تھا۔ 2006 میں لبنان میں اپنی ناکامی کا داغ مٹانے اور اس کو نہ دہرانے کے عزم کے ساتھ اسرائیلی وزیر دفاع ایہود باراک، چیف آف اسٹاف گابی اشکنازی اور دوسرے سینئر اہلکاروں کا خیال تھا کہ حملے کے لیے تیار ہونے میں ابھی اور وقت درکار ہے، خواہ اس مہلت کے دوران حماس کو اپنی قوت بڑھانے کا موقع ہی کیوں نہ مل جائے۔ جیسا کہ دسمبر 2008 کے اسرائیلی اخبارات میں بتایا گیا، منصوبہ بندی 2007 کے اوائل میں شروع ہوئی جبکہ آپریشن کی تیاریوں کا آغاز تہدیہ کے مذاکرات کے دوران کیا گیا اور تہدیہ کے نتیجے میں ہونے والی جنگ بندی کے دنوں میں ان کی رفتار تیز کر دی گئی۔ بنیادی نقشے کی تکمیل نومبر 2008 کے شروع میں ہوئی اور باراک نے اسے 19 نومبر کو منظور کیا، جبکہ وزیر اعظم ایہود اولمرٹ کی توثیق کے لیے اسے 19 دسمبر کو بھیجا گیا۔

اگرچہ تہدیہ تحریری معاہدہ نہیں لیکن مصر نے، جس کے توسط سے یہ انجام پایا، اس کی شقوں کو اتنے تفصیل سے بیان کر دیا ہے کہ اس میں تخیل کی کارفرمائی کی گنجائش بہت کم رہ گئی ہے: اسرائیل اور غزہ کی پٹی کے درمیان فوری، ہمہ گیر اور دوطرفہ جنگ بندی، جس کے بعد اسرائیلی محاصرے کے مرحلہ وار اور مکمل خاتمے کا عمل شروع ہوگا (سوائے میزائلوں اور دھماکا خیز مواد پر عائد بندش کے)، اور اسرائیل اور فلسطین کے درمیان قیدیوں کے تبادلے پر مذاکرات اور فلسطین اور مصر کے درمیان رفاہ کی چوکی کے سلسلے میں بات چیت دوبارہ شروع ہوگی۔ مصریوں کے مطابق تہدیہ میں فلسطینیوں کی ہتھیاروں کی اسمگلنگ پر پابندی کا کوئی ذکر نہیں۔ نومبر 2007 میں آناپولس، میری لینڈ، امریکہ میں صدر جارج ڈبلیو بش نے امن کے عمل کی بحالی کی توید سنائی تھی جس سے حماس کو قطعی طور پر باہر رکھا جانا تھا۔ تاہم، آناپولس کی کانفرنس کے بعد سے عباس اور اس کے ساتھیوں نے اسرائیلی مذاکرات کاروں کے ساتھ گفتگو میں جو ہزاروں گھنٹے صرف کیے، ان کے باوجود اسرائیل اور فلسطین کے درمیان اہم ترین معاہدہ وہ تھا جو اسلام پسندوں کے ساتھ ہوا۔

تہدیہ کی خلاف ورزی اسرائیل اور مختلف فلسطینی تنظیموں، دونوں کی طرف سے ہوئی۔ اگرچہ

ن خلاف ورزیوں کا نتیجہ بعض موقعوں پر ہلاکتوں کی صورت میں نکلا — ہلاک ہونے والے 128 افراد سب کے سب فلسطینی تھے۔ اسرائیلی ذرائع نے تسلیم کیا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فلسطینی تنظیموں کی جانب سے خلاف ورزیوں کی تعداد میں کمی ہوتی گئی۔ مثلاً دسمبر 2008 میں انٹیلی جنس اینڈ ٹیررزم انفارمیشن سنٹر کی جاری کردہ رپورٹ کے مطابق غزہ سے اسرائیل پر ہونے والے میزائل حملے، جن کی تعداد تہدیہ سے پہلے کے چھ مہینوں میں 2278 تھی، مذاکرات کے دوران گھٹ کر 329 رہ گئے اور ان میں سے بھی بیشتر 4 نومبر کو جھڑپیں دوبارہ شروع ہونے کے بعد ہوئے۔ ان کے علاوہ باقی میزائل حملے جنگ بندی کے پہلے دس روز میں ہوئے جب حماس ان فلسطینی گروپوں پر قابو پانے کی کوشش میں تھی جو اسرائیل کے ساتھ ایسے کسی معاہدے کو تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے جس کی عملداری صرف غزہ کی پٹی تک محدود ہو، یا پھر جن کے پاس تہدیہ کی مخالفت کی دوسری وجوہ تھیں۔

چنانچہ نیویارک میں اسرائیلی کونسلیٹ کے جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق یکم جولائی 2008 سے یکم نومبر 2008 تک فلسطینی حملوں کی کل تعداد چندرہ مارٹر گولوں اور گیارہ راکٹوں پر مشتمل تھی جن میں کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ جنوبی اسرائیل کا قصبہ سدیروت (Sderot) اگر پوری طرح محفوظ نہ بھی ہوا ہو تو یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ راکٹوں کے بے تحاشا حملوں کی زد میں رہ رہا تھا۔

اس کے باوجود اسرائیل اور مصر نے محاصرہ ختم کرنے سے انکار کر دیا جو حماس کا کلیدی مطالبہ تھا اور اس کے معاہدے میں شامل ہونے کا بنیادی سبب تھا۔ اگرچہ بہت سی بنیادی چیزوں کے سلسلے میں محاصرے میں نرمی کر دی گئی (لیکن سب چیزوں کے لیے نہیں)، پھر بھی درآمدات فلسطینی ضروریات سے بہت کم تھیں اور برآمدات بالکل نہیں۔ زیادہ اہم بات یہ کہ، انٹرنیشنل کرائسس گروپ کے مطابق، اسرائیلی حکام کا کہنا ہے کہ وہ "کراسنگ پوری طرح کھولنے کا ارادہ نہیں رکھتے اور ان کو توقع ہے کہ اس سے سنگین تنازع پیدا ہوگا۔"

تصادم کی آہٹ 19 دسمبر کو جنگ بندی کی میعاد ختم ہونے پر سنائی دینی شروع نہیں ہوئی بلکہ اس سے بہت پہلے 4 نومبر کو۔ جس وقت پوری دنیا امریکی صدارتی انتخاب کا ڈراما دیکھنے میں محو تھی، اسرائیل نے بلا کسی اشتعال کے غزہ کی پٹی پر حملہ کر دیا جس میں چھ فلسطینی باشندے ہلاک ہو گئے، جو

سب کے سب القاسم بریگیڈ سے تعلق رکھتے تھے۔ اسرائیل نے دعویٰ کیا کہ اس نے اسرائیلی کارپورل گیلاد شالت (Gilad Shalit) کی، جسے جون 2006 میں فلسطینی فائٹروں نے گرفتار کیا تھا، تنہائی دور کرنے کے لیے مزید اسرائیلی فوجیوں کے اغوا کی کوشش ناکام بنادی۔ لیکن اس دعوے کا اسرائیلی جنگی نامہ نگاروں نے بہت مضحکہ اڑایا۔ اس سے زیادہ معتبر اس خیال کو سمجھا گیا کہ یہ ایک سوچا سمجھا اور منصوبہ بند حملہ تھا جس کا مقصد حماس کو جواب دینے کے لیے مشتعل کرنا تھا جس سے جنگ بندی کے خاتمے کا جواز نکل سکے۔

4 نومبر سے 19 دسمبر تک کا عرصہ — جس کے دوران ہلاک ہونے والے باشندے، ایک بار پھر، سب کے سب فلسطینی تھے — دونوں جانب سے تصادم میں شدت سے عبارت تھا، جس کے دوران اسرائیل اور مصر کی طرف سے محاصرہ اتنا سخت کر دیا گیا کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ افلاس کی سطح اور اونچی ہوگئی، غذائیت کے فقدان میں بے تحاشا اضافہ ہو گیا اور ہر قسم کے سامان کی قلت پیدا ہو گئی۔ اقوام متحدہ اور ریڈ کراس کی جانب سے تازہ ترین ہنگامی حالات کے اعلان اور آنے والی سنگین صورت حال کے انتباہ سے پہلے ہی اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کی سابق کمشنر میری رابنسن نے اپنے 4 نومبر کے دورے میں غزہ کے شہریوں کے ''اتنے سارے انسانی حقوق کی صدمہ انگیز اور ناقابل یقین خلاف ورزیوں'' پر بین الاقوامی بے حسی کی مذمت کی تھی۔ ''ان کی پوری تہذیب تباہ کر دی گئی ہے،'' میری رابنسن نے نتیجہ اخذ کیا۔ ''اور میں مبالغہ نہیں کر رہی ہوں۔''

آخرکار 18 دسمبر کو حماس نے اعلان کیا کہ وہ جنگ بندی کی میعاد ختم ہونے پر اس میں یک طرفہ طور پر توسیع نہیں کرے گی اور صرف اسی صورت میں اس انتظام کو بحال کرے گی اگر اسرائیل محاصرہ ختم کرنے کے اپنے گزشتہ وعدے کی پاسداری کرے۔ اگر نومبر کے شروع میں اسرائیل کی طرف سے تشدد کا سلسلہ جاری نہ ہوتا تو ممکن ہے کہ حماس اپنی مارٹر توپوں اور راکٹ لانچروں کا استعمال پہلے کی طرح روکے رکھتی، اور تہدیہ کی میعاد میں توسیع کرنے سے بظاہر انکار کرتی رہتی اور جنگ بندی کی توثیق کی عدم موجودگی کو محاصرہ اٹھائے جانے کے حربے کے طور پر استعمال کرتی۔

اگرچہ اسلام پسندوں کی صفوں میں اس جنگ بندی کی توسیع کے خلاف خاصا غم وغصہ پایا جاتا تھا جس کا نفاذ اسرائیل کی طرف سے اب تک نہیں کیا گیا تھا (اور جس کے دوران دونوں فریق

قیدیوں کے تبادلے کے سلسلے میں بھی کسی سمجھوتے پر پہنچنے میں ناکام رہے تھے)، لیکن زیادہ اہم عنصر یہ تھا کہ تہدید کی عوامی مخالفت بھی پھیلتی جا رہی تھی اور تحریک کے اندر ہم خیال ارکان کے ہاتھ مضبوط کرتی جا رہی تھی۔ رائے عامہ کا لحاظ کرتے ہوئے حماس نے صرف تصادم روکنے کا مقصد حاصل کیا تھا جس کے فوائد محاصرے کے جاری رہنے کے نقصانات سے کم تھے۔ حماس کو اس شکایت کا احساس تھا کہ غزہ کے نئے حکمران اسرائیل کے ساتھ اس معاہدے کو برقرار رکھنے کے لیے، جس سے انھیں برسرِ اقتدار رہنے کی اجازت ملتی تھی، فلسطینیوں کو افلاس میں غرق اور بھوک سے ہلاک ہوتے ہوئے دیکھنے کو بھی تیار ہیں۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اسرائیل اپنی زمین پر ہونے والی بے پناہ شیلنگ کا جواب دے رہا تھا، یہ صرف اسی حد تک درست ہے — جیسا کہ جون 1982 میں بھی ہوا تھا — کہ اس نے جان بوجھ کر یہ صورت حال پیدا کی تھی تاکہ تہدید کا خاتمہ کر کے جنگ شروع کرنے کا جواز حاصل کر سکے۔ راکٹ فائر کا خاتمہ کرنے سے زیادہ، جو 4 نومبر سے پہلے بہت کم اور محض سرحدی علاقوں تک محدود رہے تھے، آپریشن کاسٹ لیڈ (Operation Cast Lead) کا اصل مقصد حماس کی فوجی نشوونما کا رخ پھیرنا اور تصادم کے خاتمے کے بعد اس کی موجودہ صلاحیتوں میں اضافے کو روکنا تھا۔

لیکن اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس سے قطع نظر، غزہ پر ہونے والے حملے کا اصل مقصد فوجی نہیں بلکہ سیاسی نوعیت کا تھا۔ زیادہ درست طور پر حماس کی اس صلاحیت کے اظہار نے کہ وہ اسرائیل کے ساتھ معاہدہ کر کے اس پر قائم بھی رہ سکتی ہے، اسرائیل کو ایک مخمصے میں مبتلا کر دیا، خاص طور پر اس بات نے کہ اسلام پسند 2006 کے بعد سے اسرائیل کے ساتھ بقائے باہم پر، یہاں تک کہ دو ریاستوں والے فارمولے کو قبول کرنے پر بھی تیار ہوتے جا رہے تھے۔ ایک نیا معاہدہ — خصوصاً اگر اس کو حماس اور محمود عباس کے مابین سمجھوتے سے تقویت حاصل ہوتی ہو — یورپی اور دیگر ملکوں کو — جو واشنگٹن کے نوقدامت پسندوں کا بہت دیر تک اور بہت دور تک ساتھ دیتے رہے ہیں — حماس سے رابطے قائم کرنے کا جواز فراہم کر دے گا۔ یہ بات بھی کہ اس تحریک نے، اسرائیل کی وزارت خارجہ کی ویب سائٹ کے مطابق، مارچ 2005 سے اب تک اسرائیل پر کل ایک خودکش حملہ کیا ہے

(گزشتہ جنگ بندی سے کچھ پہلے — باقی بیشتر حملوں کی ذمے داری اسلامی جہاد نے قبول کی) یوروپی اور دوسرے ملکوں کے حماس سے رابطے کرنے کے عمل میں مددگار ہوسکتی تھی۔

درحقیقت 2008 کے موسم بہار اور گرما کے دوران یوروپی سفارت کار اور اہلکار زیادہ سے زیادہ کھلے طور پر یہ باتیں کرتے رہے ہیں کہ کس طرح، کب اور کن حالات میں وہ سورج کو (یوروپی یونین کے خصوصی نمائندے) ہاوئیے سولانا (Javier Solana) کی انگلی سے ڈھانپنے کی اپنی احمقانہ پالیسی ترک کرنا شروع کریں گے۔ جیسا کہ 1982 میں ہوا تھا، علاقائی اور بین الاقوامی حساب کتاب میں اسلام پسندوں کے شامل کیے جانے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اسرائیل کی نئی یہودی بستیاں قائم کرنے کی پالیسی پر نئے سرے سے توجہ مرکوز ہوجائے گی؛ اس بات کا امکان بہت کم ہے، کم از کم فی الحال، کہ حماس اور اس کے سلسلہ وار مذاکرات کاروں کی طرح اسلام پسندوں اور ان میں شامل دھڑوں کو بھی مستقبل کی کسی ایسی ہیئت کے وعدے پر متواتر ٹالا جاسکے گا جو طویل تر دیواروں اور وسیع تر یہودی بستیوں کی حقیقت کی پردہ پوشی کرسکے۔ یہ امکان بھی کچھ زیادہ روشن معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اس قسم کے کسی مستقل بندوبست کو جیسا بش نے تجویز کیا تھا — جسے یاسر عرفات نے مسترد کردیا تھا لیکن عباس نے بہت عرصہ ہوا اپنا لیا ہے — نہ صرف قبول کریں گے بلکہ اس پر عمل بھی کرسکیں گے۔ زیادہ اہم بات یہ کہ جہاں بش کے ذہن میں یہ تصور ہے کہ مستقبل کے کسی فلسطینی رہنما کو معالی ایدومیم یا آریئل جیسی بستیوں میں جانے کے لیے اسرائیلی ویزا لینا ہوگا جس کے نتیجے میں غرب اردن کا علاقہ تین لمبی قاشوں میں کٹ کر رہ جائے گا، حماس کا اب تک یہی اصرار رہا ہے کہ اسرائیل کی 1967 کی سرحدوں تک مکمل واپسی — اور اس کے نتیجے میں اس علاقے میں قائم کی گئی تمام یہودی بستیوں کا خاتمہ اور مشرقی یروشلم سے اسرائیل کا مکمل انخلا — ہی قابل قبول بندوبست ہوگا۔ اس لیے تھوڑے کی ایک ضرب جو تحریک کو چکنا چور کردے اور اس کے ٹکڑے ایسی سمتوں میں بکھر جائیں جو ان سب کو منظر سے باہر دھکیل دے، ان تیسرے فریقوں کو دور رکھنے کا واحد طریقہ ہے جو اس نتیجے پر پہنچتے جارہے ہیں کہ حماس کو خارج کرنے کے بجائے اس سے معاملہ کرنا ہی امن کے امکانات کو بڑھا سکتا ہے۔ اور اگر، اپنی سزا بھگت لینے کے بعد، حماس کے رہنما خود کو "نئے مشرق وسطیٰ" کے تصور کے مطابق ڈھال لیں اور مسلح فائٹروں کے بجائے بے شمار مذاکرات کاروں میں تبدیل کرلیں، تو اور بھی اچھا ہوگا۔

Scanned with CamScanner

جہاں تک غزہ پر کیے جانے والے حملے کے وقت کے انتخاب کا تعلق ہے، 10 فروری کو ہونے والے اسرائیلی انتخابات اس کی محض جزوی طور پر وضاحت کرتے ہیں، کیونکہ اس سے اگر ایک طرف انتخابات میں فائدہ حاصل کرنے کا موقع فراہم ہوتا ہے تو دوسری طرف ایک مصنوعی حتمی تاریخ بھی عائد ہو جاتی ہے جو اسرائیل کی فوجی مہم میں بڑی پیچیدگی پیدا کر سکتی ہے۔ اس کے بجائے، زیادہ معنی خیز تاریخ 19 دسمبر 2008 معلوم ہوتی ہے جب تہدیہ کی میعاد ختم ہو رہی تھی اور اسرائیل کو ایک نئے معاہدے کی ہولناکی کا سامنا کرنے پر مجبور ہونا تھا۔ دوسرے یہ کہ اسلام پسندوں کو اصرار ہے کہ 9 جنوری کو محمود عباس کی صدارت کی میعاد ختم ہو جائے گی اور اس کے بعد وہ اس کے مینڈیٹ کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوں گے، چنانچہ اس تاریخ کے آنے سے پہلے ہی حماس کو حملہ کر کے کمزور کر دینا زیادہ فائدہ مند سمجھا گیا۔ اور آخری بات یہ کہ باراک اوباما کے صدارت سنبھالنے سے پہلے پہلے اس فوجی مہم کو ختم کر لینا بھی اسرائیلی حساب میں شامل رہا ہوگا — تاکہ اوباما کو وائٹ ہاؤس میں داخل ہوتے ہی ایک بحران کا ناگزیر طور پر سامنا کرنے کے بجائے عرب اسرائیل والی فائل کو پیچھے پھینک دینے میں سہولت ہو سکے۔ ایک متبادل توضیح یہ ہو سکتی ہے کہ بعض لوگوں نے اس حکمت عملی کی وکالت کی ہو کہ بش کے صدارت چھوڑنے سے پہلے پہلے اسرائیل اور فلسطین کے تعلق کے خدوخال تبدیل کرنے کی ایک آخری کوشش کر لی جائے تاکہ اوباما کے خلوص کا امتحان کرنے کے لیے اسے یہودی ریاست اور ان شیطانی دہشت گردوں کے درمیان لا کھڑا کیا جائے جو اس کی بیٹیوں کو اس کے عہدۂ صدارت کے آغاز میں قتل کر دینے پر آمادہ ہیں۔

غزہ کی پٹی پر اسرائیل کے حملے کا آغاز وہاں کے پندرہ لاکھ باشندوں پر اندھا دھند بمباری سے نہیں ہوا، اور نہ حماس کی قیادت، چین آف کمانڈ، فوجی صلاحیت اور تنظیمی ڈھانچے پر منظم حملے سے ہوا۔ اس کے بجائے، مارچ سے مئی 2002 تک غرب اردن کے خلاف مہم کے ابتدائی مرحلے کی طرح (اور 2006 میں لبنان کے خلاف جنگ کے قطعی برعکس) بمباری کا متعین ہدف سرکاری عمارتیں، خصوصاً سکیورٹی فورسز کے استعمال کی عمارتیں بنیں تاکہ ان دونوں ہیکلوں کو مفلوج کر دیا جائے۔

اسرائیلی رہنماؤں نے اس کا اشارہ پہلے ہی یہ کہہ کر دے دیا تھا کہ حماس کے ساتھ ساتھ اسلام پسند تحریک سے وابستہ کسی ڈھانچے، ادارے، سہولت یا شخص کو جائز ہدف تصور کیا جائے گا۔ اس بات کے پیش نظر کہ حماس کا جون 2007 سے غزہ کی پٹی پر مکمل کنٹرول رہا ہے، اس دھمکی نے پورے علاقے اور اس میں رہنے والوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ درحقیقت ابتدائی ہوائی حملوں میں مارے جانے والے بیشتر افراد کا تعلق القاسم بریگیڈ سے نہیں بلکہ شہری پولیس فورس سے تھا (جن میں سے بہت سے نئے کیڈٹ تھے جو اپنی تربیت مکمل کرنے کی تقریب میں شریک تھے)۔ اس روز مارا جانے والا سب سے سینئر اہلکار، پولیس کمانڈر جنرل توفیق جبر الفتح کا رکن تھا جو اپنی وفاداری تبدیل کر کے 2007 میں حماس سے وابستہ ہوا تھا۔

اسرائیل کے اختیار کردہ طریقوں کا ایک اور اشارہ حزب اللہ، شام یا حماس کے خلاف جنگ کی متبادل منصوبہ بندی کی پریس کوریج سے ملا۔ 15 اکتوبر 2008 کو اسرائیلی اخبار ہاریٹز (Ha'aretz) نے اسرائیلی فوج کے شمالی کمانڈر گادی آئزنکوٹ (Gadi Eisenkot) کی زبانی ''ضاحیہ نظریے'' کی وضاحت شائع کی (''ضاحیہ'' بیروت کا ایک مضافاتی علاقہ ہے جسے اسرائیل نے 2006 میں شدید بمباری کر کے بالکل تباہ کر ڈالا تھا)، ''جس گاؤں سے اسرائیل کی سمت گولی چلائی جائے گی، ہم غیر متناسب طاقت استعمال کرتے ہوئے اسے شدید نقصان پہنچا کر تباہ کر دیں گے۔ ہمارے نقطۂ نظر سے ہر ایسا گاؤں ایک فوجی اڈا ہے۔ اور یہ محض کوئی تجویز نہیں ہے۔ یہ منصوبہ ہے جس کی منظوری دی جا چکی ہے۔'' اسی طرح نائب وزیر دفاع ماتن ولنائی (Matan Vilnai) نے فروری 2008 میں غزہ کو اسرائیل کی سرحد کے پار فلسطینی راکٹ چھوڑے جاتے رہنے کی صورت میں ''شوعاہ'' (Holocaust) نازل کرنے کی دھمکی دی تھی۔

اخبار ہاریٹز کے مضمون میں اسرائیلی ریزرو فوج کے ایک کرنل گابریئل سیبونی (Gabriel Siboni) کی تیار کردہ رپورٹ کی قبل از اشاعت کاپی کا حوالہ دیا گیا تھا جس میں ''دشمن کے قلب کے کمزور مقام پر غیر متناسب طاقت سے ضرب لگانے'' کی تجویز پیش کی گئی تھی، ''اور اس حملے کے مقاصد میں راکٹ چھوڑنے کی صلاحیت کو تباہ کرنا ثانوی درجہ رکھتا ہے۔ جوں ہی تصادم کا آغاز ہو، اسرائیلی [فضائی اور بری افواج] کو تیز رفتاری، عزم، اور غیر متناسب طاقت کے ساتھ دشمن کی

کارروائی کے خلاف اقدام کرنا ہوگا۔" اس اقدام میں کیا کچھ شامل ہوگا اس کی تفصیل ایک اور منصوبہ رپورٹ میں ملتی ہے جو اسرائیل کی نیشنل سکیورٹی کاؤنسل کے سابق سربراہ گیورا ایلینڈ (Giora Eiland) کی تیار کردہ ہے اور جس میں دشمن کے فوجی، سرکاری اور شہری بنیادی ڈھانچے کو مکمل طور پر تباہ کر ڈالنے کی سفارش کی گئی ہے۔

ایک ٹن انتہائی طاقتور بارود کو درست نشانے کے ساتھ دنیا کے گنجان آباد ترین خطے کے رہائشی علاقوں میں موجود ہدف پر برسائے جانے کے اس کے اردگرد کی آبادی پر جو اثرات ہوں گے ان سے قطع نظر، یہ اعلان کردہ پالیسی ایک کہیں زیادہ بنیادی حقیقت کو سامنے لاتی ہے کہ اس بارود کا ہدف اصل میں کس کو بنایا جا رہا ہے۔ ماشیہ حملے کے پہلے ہفتے کے دوران اسرائیلی فضائیہ نے غزہ کی پٹی میں واقع فلسطینی حکومت کی تمام سکیورٹی تنصیبات کو نشانہ بنانے کے ساتھ ساتھ متعدد ایسی سرکاری عمارتوں کو بھی تباہ کیا جنھیں تخیل کے بے محابا استعمال سے بھی فلسطینی فوجی کارروائی کا حصہ نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ ان میں فلسطینی قانون ساز کاؤنسل، صدر اور وزیراعظم کی رہائش گاہیں اور صدارتی مہمان خانہ (جس میں غیرملکی مہمانوں کو ٹھہرایا جاتا تھا)، مختلف وزارتوں، مثلاً ثقافت، تعلیم، انصاف، محنت اور عوامی تعمیرات کے ہیڈکوارٹرز، میونسپلٹیوں اور گورنروں کے دفاتر، اور بہت سی ایسی عوامی عمارات بھی شامل تھیں جنھیں خالی کرایا جا چکا تھا اور جن کے تباہ ہونے سے نہ تو کوئی ثانوی دھماکے پیش آئے اور — جیلوں کے قابل ذکر استثنیٰ کے ساتھ — نہ ان کے اندر لوگ موجود تھے جو ہلاک ہوئے ہوں۔

یہی بات حماس اور دیگر فلسطینی تنظیموں کے سیاسی رہنماؤں اور فوجی کمانڈروں کے مکانوں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ ان میں سے تقریباً تمام لوگ اسرائیلی حملہ شروع ہونے سے کئی دن پہلے روپوش ہو گئے تھے اور ان کو ہلاک کیے جانے کا امکان اس وجہ سے اور بھی کم ہو گیا تھا کہ اسرائیل کی طرف سے حملے سے پہلے فون اور ٹیکسٹ میسج کے ذریعے بار بار انتباہ کیا جا رہا تھا۔ (اس معاملے میں ایک بنیادی استثنیٰ حماس کے رہنما نزار ریان کا تھا، جس نے لوگوں کے درمیان رہنے اور دکھائی دینے کا انتخاب کیا اور اعلان کیا کہ وہ اپنے مکان ہی میں مقیم رہے گا اور کہا جاتا ہے کہ وہ شہادت پانے کے لیے بے تاب تھا۔)

اسی طرح حماس اور دوسری تنظیموں کے زیر اہتمام چلنے والے اداروں کی تباہی کو — جن میں

غزہ کی اسلامی یونیورسٹی، اسکول، کلینک، مسجدیں اور رفاہی ادارے اور ان کے علاوہ ٹی وی اسٹیشن، ریڈیو اسٹیشن اور اخبارات کے دفتر شامل تھے۔ کسی روایتی عسکری مقصد سے متعلق نہیں سمجھا جا سکتا۔

آپریشن کاسٹ لیڈ کے پہلے ہفتے کے دوران جب اسرائیل غزہ کی پٹی کے بڑے علاقے کو ملبے کا ڈھیر بنا رہا تھا اور ہلاک ہونے والوں کی تعداد 400 تک اور زخمیوں کی تعداد 2500 تک جا پہنچی تھی — اور ان میں عام شہریوں کی بڑھتی ہوئی تعداد شامل تھی — جواب دہی سے اسرائیل کی بظاہر لامحدود آزادی، اس کی سابقہ فوجی مہمات سے بھی کہیں آگے نکل گئی۔ زمینی حملے کی حکمت عملی کو 7 جنوری کو ایک اسرائیلی افسر نے یوں بیان کیا:

''ہمارے نقطۂ نظر سے احتیاط برتنے کا مطلب جارحیت کرنا ہے۔... اس علاقے کو حملے سے پہلے کی حالت میں واپس لانے میں برسوں لگیں گے۔... جب ہمیں شبہ ہوتا ہے کہ کسی مکان میں کوئی فلسطینی جنگجو چھپا ہوا ہے تو ہم اسے میزائل سے نشانہ بناتے ہیں اور پھر ٹینک کے دو گولے مارتے ہیں، اس کے بعد بل ڈوزر اس مکان کی دیوار سے ٹکراتے ہیں۔ اس سے خاصا نقصان ہوتا ہے لیکن ہمارے فوجیوں کی جان محفوظ رہتی ہے۔... ہم نے ایسے گھر دیکھے جہاں کھانا ان کھایا رہ گیا تھا ہم عورتوں اور بچوں کو سفید جھنڈے اٹھائے، لمبی قطاروں میں کھڑا دیکھتے ہیں، اور بے شک ہم انھیں غزہ شہر کی طرف جانے دیتے ہیں۔ دوسری طرف، ہر دو گھنٹے بعد ہمیں انٹیلی جنس کی طرف سے انتباہ موصول ہوتا ہے کہ علاقے میں کوئی خودکش بمبار عورت موجود ہے، چنانچہ بیشتر فوجیوں کی نظر میں شہریوں کی قطاریں ایک حقیقی خطرہ ہیں۔''

اسرائیلی اہلکاروں کو اپنے ان معمول کے رسمی بیانات سے آگے جانے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ شہریوں کی پشت پر دہشت گرد چھپے بیٹھے ہیں اور گھروں اور مسجدوں کو اسلحہ خانے اور کمانڈ سنٹروں کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے؛ وجہ یہ ہے کہ ان کے بیانات کو شاذ و نادر ہی چیلنج کیا جاتا ہے کہ انھیں کوئی زیادہ پُرتخیل جواز گڑھنے کی ضرورت پیش آئے۔

اگرچہ گزشتہ فوجی کارروائیوں میں مختلف ملکوں کے دارالحکومتوں سے جاری ہونے والے اس قسم کے اعلانات کہ اسرائیل کو اپنے دفاع کی خاطر کیے جانے والے اقدامات میں جنگ کے قوانین کی پاسداری کرنی چاہیے، موجودہ بحران میں ترک کیے جا چکے ہیں، جبکہ چوتھا جنیوا کنونشن جس کا تعلق

فتنہ گیر فوج کے طرزِ عمل کے اصولوں سے ہے، کلنٹن کے دورِ صدارت ہی میں باقاعدہ کوڑے میں پھینک دیا گیا تھا۔ جب جنوری کے آغاز میں اسرائیلی ٹینک غزہ میں داخل ہو رہے تھے، تو یورپی یونین کے صدارتی دفتر نے فوراً اعلان کیا کہ یہ "دفاعی کارروائی ہے، جارحانہ نہیں" — ایک ایسا دعویٰ جو اسرائیل تک نے نہیں کیا؛ اسرائیلی وزیرِ دفاع نے اُسی روز شام کو اپنی فوجی کارروائی کو "جارحانہ" قرار دیا۔ ہیومن رائٹس واچ جیسی امریکی تنظیموں نے، اپنے معمول کے مطابق، اپنی سخت ترین مذمت فلسطینیوں کے لیے محفوظ رکھی اور انھیں جنگی جرائم کا مرتکب قرار دیا، جبکہ اسرائیلی کارروائی کے قانونی جواز کے بارے میں مبہم لہجہ اختیار کیا۔

31 دسمبر کو نزار ریان کو جس طریقے سے قتل کیا گیا اس سے بہت کچھ واضح ہو جاتا ہے۔ یہ حملہ، جو ایک ٹن وزنی بم کے ذریعے ایک رہائشی عمارت پر کیا گیا جس میں نزار کے علاوہ درجن بھر عورتیں اور بچے بھی ہلاک ہوئے، کم و بیش اُس حملے سے ملتا جلتا تھا جو اسرائیل نے جولائی 2002 میں کیا تھا اور جس میں حماس کے فوجی کمانڈر صلاح شہادہ کے علاوہ چودہ شہری ہلاک ہوئے تھے۔ اس کے باوجود اگرچہ نزار ریان کے قتل کی کارروائی کی — جسے سابق وزیرِ اعظم ایریل شیرون نے "ہماری سب سے بڑی کامیابیوں میں سے ایک" قرار دے کر سراہا — بین الاقوامی طور پر مذمت کی گئی، صلاح شہادہ والے حملے کا صرف ایک واقعے کے طور پر ذکر کر دیا گیا تھا۔

عام طور پر کہی جانے والی یہ بات درست ہے کہ اسرائیل کی ابتدائی فضائی مہم نہ تو حماس یا اسلامی جہاد کی قیادت کو ختم کرنے میں کامیاب ہوئی، نہ انھیں فوجی اعتبار سے مفلوج کرنے میں اور نہ فلسطینی راکٹ فائر کی شدت کو بڑھنے سے روکنے میں۔ لیکن یہ بات اصل نکتے کو نظرانداز کر دیتی ہے۔ جیسا کہ 2002 میں ہوا تھا، اس بار بھی اسرائیل کا پہلا مقصد مسلح گروہوں پر کاری ضرب لگانے سے زیادہ سرکاری نظم و نسق کو ناکارہ بنانا تھا تاکہ حکومت اور عوام کے درمیان رابطہ منقطع ہو جائے اور سیاسی قیادت تنہا رہ جائے۔ اور جس طرح غرب اردن میں دوسرے انتفاضہ کے دوران ہوا تھا، اسرائیل کا اندازہ ہے کہ مسلح گروہوں کو تباہ کرنے سے صرف محدود فائدہ حاصل ہوتا ہے؛ پائیدار فتح کے لیے ضروری ہے کہ آبادی کو دبا کر مطیع بنایا جائے اور اپنے رہنماؤں اور مسلح جدوجہد کے حامیوں پر

سے ان کا اعتماد اٹھا دیا جائے، اور ان کی توانائیوں کو معمولی قسم کی مصروفیت، مثلاً بڑھتی ہوئی مسابقت اور انتشار کے ماحول میں خود کو محفوظ رکھنے اور بنیادی ضرورت کی چیزیں اور سہولیات حاصل کرنے کی کوشش پر مرکوز کر دیا جائے جنھیں فراہم کرنا مفلوج حکومت کے لیے ممکن نہ رہے۔

حماس کے معاملے میں اس مقصد میں یہ بھی شامل ہے کہ — زمین، فضا اور سمندر سے برسائے جانے والے بموں اور میزائلوں کے ذریعے — اسلام پسند تحریک کے سماجی، مذہبی اور خیراتی اداروں کے نیٹ ورک کو مسمار کر دیا جائے، کیونکہ انھی اداروں نے 1980 کے عشرے کے اواخر میں تحریک کے ایک سیاسی اور فوجی قوت کے طور پر ابھرنے کی راہ ہموار کی تھی اور یہی فلسطینی سماج کے ہر حصے میں اس کی حمایت قائم کرنے اور برقرار رکھنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا تھا۔ اسرائیل نے طے کیا کہ چونکہ یہ تحریک غزہ میں فلسطینی حکومت کو کنٹرول کرتی ہے اور اس کے پاس خود مختار اداروں کا ایک پورا نظام موجود ہے جو حکومت سے الگ رہ کر بھی لوگوں کو خدمات اور سہولیات فراہم کر سکتا ہے، اس لیے سرکاری اور تحریکی دونوں قسم کی عمارات کو تباہ کرنا ضروری ہے۔

اسرائیل نے، بلاشبہ، حماس اور القاسم بریگیڈ، اور ان کے علاوہ چھوٹے مسلح گروپوں مثلاً اسلامی جہاد اور اس کے یروشلم بریگیڈ یا پاپولر رزسٹنس کمیٹی اور اس کے صلاح الدین بریگیڈ، کی فوجی طاقت کو ناکارہ بنانے کے مقصد کو نظر انداز نہیں کیا۔ 2002 میں جنین کے پناہ گزیں کیمپ پر ایک مہینے جاری رہنے والی کارروائی بھی موجودہ کارروائی کے آگے ماند پڑ جاتی ہے، جو 1982 میں بیروت کے محاصرے کے بعد سے اب تک اسرائیل اور فلسطینیوں کے درمیان ہونے والا سب سے سنگین فوجی تصادم ہے۔

اس بار فلسطینیوں کی مقابلتاً اونچی سطح کی فوجی تیاری اور زیادہ مضبوط صلاحیت کی وجہ سمجھنا اتنا دشوار نہیں۔ غرب اردن کے برعکس، جسے اوسلو عمل امن نے چھوٹے چھوٹے فلسطینی علاقوں میں بانٹ کر رکھ دیا — جن میں سے ہر علاقہ چاروں طرف سے اسرائیل سے گھرا ہوا ہے اور ان تمام علاقوں کا مجموعی رقبہ پورے غرب اردن کے پانچویں حصے سے بھی کم ہے — غزہ کی پٹی سے 1994 میں اسرائیلی فوج کی "واپسی" کے بعد سے، یہ ایک واحد اور بڑی حد تک باہم مربوط علاقہ بن گیا جس کے اردگرد اسرائیلی فوج کی چھوٹی کیریزن اور پہلے سے زیادہ سخت گیر بارڈر کنٹرول کی چوکیاں واقع ہیں۔

دوسرے انتفاضہ کے عروج پر بھی اسرائیل غزہ کو تین یا چار مقابلتاً بڑے علاقوں میں کاٹنے میں ناکام رہا، اور 2005 میں اس کے خود کو علیحدہ کر لینے ("disengagement") کے بعد سے یہ اندرونی کنٹرول بالکل ہی ختم ہو گئے۔ چنانچہ پندرہ برس تک غزہ کے رہنے والوں کو ایک سے دوسرے علاقے میں جانے اور پورے علاقے میں آنے جانے کی تقریباً مکمل آزادی حاصل رہی۔ کئی افراد (مثلاً حماس کا فوجی لیڈر احمد ضائف) 1987-1993 کے انتفاضہ کے بعد سے اسرائیل (اور فلسطینی حکومت) کے ہاتھ نہ آ سکے۔ اس کے علاوہ 1991 کی خلیجی جنگ میں قائم کی گئی رکاوٹوں کے باعث، جو ہر گزرتے سال کے ساتھ زیادہ سخت ہوتی گئیں، غزہ میں قائم فلسطینی سماج اور اسرائیل کے درمیان باہمی لین دین متواتر کم سے کم ہوتا گیا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر کہ اسرائیل نے بھی اوسلو کے عمل امن کی ناکامی کے بعد سے اپنا براہ راست کنٹرول دوبارہ نافذ نہیں کیا (بلکہ اس کا الٹ واقع ہوا ہے)، غزہ کے فلسطینی سماج میں اسرائیلی انٹیلی جنس ایجنسیوں کی گھس پیٹھ بھی، غرب اردن کی بہ نسبت، کم ہے۔

دوسرے یہ کہ حماس کو 1990 کے عشرے میں فلسطینی حکومت کے کریک ڈاؤن سے محفوظ رہنے کا موقع ملا، پہلے تو 2000 کے موسم خزاں میں شروع ہونے والے احتجاج کے باعث (جس کے نتیجے میں قیدیوں کی رہائی بھی عمل میں آئی)، اور اس کے بعد اس وجہ سے کہ اسرائیل کے اقدامات کے باعث فلسطینی حکومت مسلسل کمزور ہوتی چلی گئی۔ محمود عباس، جو احتجاج کی دوسری لہر کے آغاز ہی سے فلسطینیوں کے ہتھیار اٹھانے کی مدمت کرتا آیا ہے اور پیرا ملٹری گروپوں کو غیر مسلح کرنے کا ہمیشہ سے حامی رہا ہے، "ایک قانون، ایک بندوق اور ایک حکومت" کے اپنے وعدے پر عمل کرنے میں ناکام رہا، اور حماس کے معاملے میں تو سب سے زیادہ۔ بلکہ اس کے برعکس اس کے دیکھتے دیکھتے غزہ کی پٹی کا ملاقہ الفتح کے سرداروں کے پھیلائے ہوئے انتشار میں اتنا گہرا اترتا چلا گیا کہ اس نے عرفات تک کو سراسیمہ کر دیا تھا۔

مزید یہ کہ 2006 کے بعد سے حماس فلسطینی حکومت کی کارروائی سے محفوظ ہونے کے ساتھ ساتھ علاقے پر اپنا تسلط قائم کرتی چلی گئی۔ فلسطینی حکومت کے پارلیمانی انتخابات میں حماس کی کامیابی نے، توانائی سلب کر لینے والے بین الاقوامی بائیکاٹ، اسرائیل اور مصر کی جانب سے کیے گئے

محاصرے اور عباس اور الفتح کی طرف سے متواتر سبوتاژ کے باوجود، اسے فلسطینی حکومت کے وسائل اور سہولیات تک رسائی فراہم کر دی۔ اور جون 2007 میں اقتدار پر قابض ہونے کے بعد سے حماس کو غزہ کے علاقے میں مکمل کنٹرول حاصل رہا ہے، جس کے دوران اس نے الفتح اور اپنے دیگر حریفوں کو چن چن کر ٹھکانے لگایا، جبکہ القاسم بریگیڈ کو اسلحہ اور تربیت فراہم کی گئی، کیونکہ یہ عمل ایسے لیڈروں کی مداخلت سے آزاد ہے جو بش کے تصور کے زیر اثر ہیں اور الفتح کے جنگی سرداروں کے عمل دخل سے بھی دور ہے جنھیں عام طور پر اسرائیل اور سی آئی اے کے لیے کام کرنے والے لوگ سمجھا جاتا ہے۔

حماس کی یہ صلاحیت کہ وہ اسرائیل اور مصر کی سرحد کے نیچے سے گزرنے والی سرنگوں کے جال کے راستے سے، اور اب سمندر کے راستے سے بھی، زیادہ مقدار میں — اور بہتر — ہتھیار درآمد، ذخیرہ اور نصب کر سکتی ہے، اور اس کی علاوہ اس کی مہارت، زیادہ نقد اور دیگر وسائل جو اسے اپنی جنگی صلاحیت کو بہتر بنانے کے لیے درکار ہیں، یہ تمام چیزیں بھی متناسب طور پر بڑھ گئی ہیں، اور جزوی طور پر یہی وجہ ہے کہ اسرائیل کو جون 2008 میں مصر کے توسط سے حماس کے ساتھ معاہدہ کرنے پر آمادہ ہونا پڑا۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ اسلام پسندوں پر ایک طرف اسرائیل اور دوسری طرف فلسطینی حکومت کی طرف سے پڑنے والے دباؤ نے بھی ان کے لیے فائدہ مند ضمنی نتائج پیدا کیے ہیں۔ دو عشروں کے دوران حماس اور خصوصاً اس کا جنگی بازو خفیہ رہ کر کام کرنے کے عادی ہو گئے ہیں، اور ان کے کارکن گمنام اور بہت سی سہولتوں سے محروم رہ کر کام کرنے میں تجربہ کار ہو گئے ہیں۔ جو لوگ 2006 اور 2007 میں ابھرے انھیں اسرائیل کے حملوں کا مقابلہ کرنے کی مہارت حاصل کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔

یہ بات کہ حماس اور دوسرے گروپ 2007 کے مقابلے میں اب نمایاں طور پر زیادہ منظم اور بہتر ہتھیاروں سے مسلح ہیں، جنوری کے آغاز ہی میں واضح ہو گئی تھی۔ اپنی سب سے بڑی توپوں کو فوراً استعمال کرنے کے بجائے وہ اپنی طاقتوں کو محفوظ رکھ کر غزہ کے طویل دفاع کی تیاری کر رہے ہیں جبکہ انھیں حرکت کرنے کی بہت کم آزادی حاصل ہو گی اور جوں جوں اسرائیل کے حملوں میں شدت آئے گی ان کا جواب بھی رفتہ رفتہ زیادہ شدید ہوتا جائے گا۔ تقریباً تمام رہنمانہ صرف اسرائیلی انٹیلی جنس

کے چنگل سے باہر رہے ہیں بلکہ ان کا تحریک سے اور بیرونی دنیا سے رابطہ بھی مکمل طور پر منقطع نہیں ہوا۔ زمین پر یہ بات واضح ہے کہ اسلحہ، حکمت عملی اور دوسرے اقدامات میں خاصی سرمایہ کاری کی گئی ہے، جس کے باعث اسرائیل کے ٹینکوں اور توپخانے کو بہت سست رفتاری سے — اور خاصی قیمت ادا کرتے ہوئے — آگے بڑھنا پڑ رہا ہے، بجائے اس کے کہ وہ ایک کے بعد ایک قصبے کو زیر کرتے چلے جائیں۔

حماس کی اپنی جنگی حکمت عملی نسبتاً واضح ہے۔ اول، اسلام پسند یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اسرائیل کی فضائی مہم فلسطینی راکٹ فائر کو بند کرنے بلکہ بڑھنے سے روکنے میں بھی ناکام ہے، چنانچہ اسے شہری علاقوں میں زمینی حملے پر مجبور ہونا پڑا ہے، جس کے باعث ہونے والی شہری ہلاکتیں اسرائیلی فوج اور معاشرے میں بددلی پیدا کر رہی ہیں اور شاید ان سے داخلی طور پر اس قسم کی تحقیقات کا بھی آغاز ہو جیسے 2006 کی لبنان کے خلاف جنگ کے بعد وینوگراد کمیشن قائم کیا گیا تھا۔

اگرچہ فلسطینی راکٹ فائر سے اسرائیل کا بہت کم نقصان ہوا ہے (2002 سے اب تک اوسطاً ہر سال تین افراد ہلاک ہوئے ہیں، جن کی مجموعی تعداد 18 ہے)، لیکن ہلاکت اور تباہی پھیلانا ان راکٹوں کا بنیادی مقصد نہیں ہے۔ اس کے بجائے حماس کے نزدیک ان کی اہمیت یہ پیغام دینے میں مضمر ہے کہ ان کا حوصلہ اور مزاحمت کی قوت ٹوٹی نہیں ہے، اور وہ عام اسرائیلی باشندوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی روزمرہ زندگی میں خلل ڈال سکتے ہیں، اور 27 دسمبر کے بعد سے — اسرائیل کے بار بار کے اعلانات کی روشنی میں کہ یہ حملہ جلد ختم ہو جائے گا — اس بات کا امکان کم ہے کہ اسرائیل غزہ کی مختلف آبادیوں کا الگ الگ باہر سے محاصرہ کر سکے گا۔ یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ حماس کی اب پوری کوشش ہے کہ وہ غرب اردن میں اور اسرائیل کے شہروں پر حملے دوبارہ شروع کر سکے۔

فلسطینیوں کو بظاہر یہ امید ہے کہ اسرائیل کو مفروضہ طور پر ایک تیز رفتار اور فیصلہ کن فتح درکار ہے جس میں اس کے اپنے فوجی کم سے کم ہلاک ہوں، اور اسرائیلی لیڈر چاہتے ہیں کہ اگر اوباما کے صدارت سنبھالنے سے پہلے نہیں تو اسرائیلی انتخابات سے پہلے اس معاملے کو نمٹا سکیں، اور ان دونوں باتوں کے زیر اثر اسرائیل غیر محتاط اقدامات کرے گا تاکہ ایک طویل تھکا دینے والی جنگ میں الجھ جانے کے بجائے تصادم کو جلد ختم کیا جا سکے۔ غزہ میں فلسطینی حکومت کی تباہی حماس کے لیے بڑی حد

تک غیر اہم ہے کہ وہ اس کے باوجود موجودہ تنازعے میں اپنے فاتح ہونے کا اعلان کر سکتی ہے۔ اسے صرف ایک تنظیم کے طور پر تباہ ہونے سے بچنے کی ضرورت ہے اور اس تصادم کے خاتمے تک اپنا حوصلہ بلند رکھنے کی، تاکہ حملہ بند کرانے کے بدلے وہ کوئی نئی سیاسی رعایتیں دینے سے انکار کر سکے۔ مزید یہ کہ اگر اس تصادم کا نتیجہ اسرائیل اور مصر کی جانب سے غزہ کا محاصرہ ختم ہونے کی صورت میں نکلتا ہے تو حماس کم از کم یہ دعویٰ کر سکے گی کہ 19 دسمبر کو جنگ بندی میں یکطرفہ توسیع سے انکار کر کے اس نے جو کچھ حاصل کرنا چاہا تھا وہ اسے حاصل ہو گیا ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ حماس اور غزہ کی پٹی میں موجود دوسری فلسطینی تنظیمیں بالآخر مسلح ملیشیاؤں سے بڑھ کر کچھ نہیں ہیں، جن کے پاس کوئی نئی رسد حاصل کرنے کا کوئی امکان نہیں، اور جو زمین کے ایک چھوٹے سے اور نادار ٹکڑے کا دفاع کر رہی ہیں۔ فوجی اعتبار سے ان کا اور اسرائیلی جنگی مشین کا کوئی جوڑ نہیں جس کے پاس اسلحے کے جدید ترین نظام، گولہ بارود کی زبردست طاقت اور زمین اور سمندر پر مکمل حاکمیت موجود ہے۔ چنانچہ سوال یہ نہیں ہے کہ اسرائیل ان مٹھی بھر جنگجوؤں کو شکست دے سکتا ہے یا نہیں، بلکہ سوال یہ ہے کہ یہ تنظیمیں آخر کار اپنے مٹا دیے جانے کو اسرائیل کے لیے سیاسی یا فوجی یا دونوں اعتبار سے اتنا مہنگا کر سکیں گی یا نہیں کہ اس قیمت کو برداشت کرنا اسرائیل کے لیے دشوار ہو جائے، اور اگر ایسا نہ ہو تو آیا وہ فلسطین کے اندر اور فلسطینیوں اور اسرائیل کے درمیان کی سیاسی مساوات میں اپنی اہمیت برقرار رکھ سکیں گی یا نہیں۔ جہاں تک موخر الذکر سوال کا تعلق ہے، اس کا انحصار اس پر ہوگا کہ موجودہ تصادم کس طرح انجام پذیر ہوتا ہے۔ اسرائیلی حملے سے غزہ کی پٹی میں جس وسیع پیمانے پر تباہی اور ہلاکت پھیلی ہے، اس کے پیش نظر حماس کو نہ صرف اپنے حامیوں کو بلکہ زیادہ عمومی طور پر پورے فلسطینی سماج کو اس بات پر قائل کرنا ہوگا کہ یہ انجام — ہر پہلو سے — ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے فیصلے کو درست ثابت کرتا ہے۔ اگر حماس نے کوئی ایسی جنگ بندی قبول کر لی جس میں محاصرہ ختم ہونے کی شق موجود نہ ہو، تو بہت کم لوگ اس دلیل سے قائل ہو سکیں گے کہ اسلام پسندوں کے پاس اس کے سوا کوئی اور راستہ نہ تھا۔

اسرائیل کے لیے کامیابی کے محرکات اور معیارات اسلام پسندوں سے بالکل الگ نوعیت کے ہیں۔ اس کا فوری ہدف، جس میں حماس اور غزہ کی پٹی بڑی حد تک خود اس کے چنے ہوئے دشمن

ہیں، یہ ہے کہ فوج کی خود اعتمادی کو اور اسرائیلی سماج کے فوج پر اعتماد کو بحال کیا جائے اور اس طرح 2006 میں لبنان کی ہزیمت کے نقصان کی تلافی کی جائے۔ اس اعتبار سے وزیر دفاع بارک اور چیف آف اسٹاف اشکنازی کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ مسئلہ ان کے پیش رووں — سطحی علم کے حامل سابق وزیر دفاع امیر پیریٹز (Amir Peretz) اور بڑبولے سابق چیف آف اسٹاف ڈان ہالٹز (Dan Halutz) — کے باعث پیش آیا تھا، نہ کہ اسرائیل کے فوجی اسٹیبلشمنٹ یا اس کے ناقابل تسخیر گھمنڈ کے قلب میں موجود کسی سڑتی ہوئی شے کی وجہ سے۔ وہ دونوں یہ بھی ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ انھوں نے ونوگراد کمیشن سے سبق سیکھا ہے اور اسے عمل میں اختیار کیا ہے، اور آج اسرائیل کا سپاہی ایک بار پھر باصلاحیت اور لڑنے، پیش قدمی کرنے اور جان دینے کے لیے تیار ہے — خواہ اسے خودکشی پر آمادہ مذہبی جنونیوں سے دست بدست لڑائی ہی کیوں نہ کرنی پڑے — اور اسرائیلی فوج دشمنوں کو کچل دینے اور جنگیں جیتنے کی ایک بار پھر اہل ہو چکی ہے۔ اگر اسرائیل اپنا موجودہ ہدف حاصل نہ کر سکا تو اس کے نتائج 10 فروری کے انتخابات پر پڑنے والے اثرات سے کہیں زیادہ وسیع اور دوررس ہوں گے۔

دوسرے یہ کہ 2002 کی طرح، اسرائیل کو یہ احساس ہے کہ وہ ایک ہی بار میں فلسطینیوں کی مسلح مزاحمت کا خاتمہ نہیں کر سکتا، چنانچہ اس کا مقصد شدت پسند تنظیموں پر کاری ضرب لگا کر ان کی کمر توڑنا اور ان کے کارکنوں اور حامیوں میں بددلی پیدا کرنا ہے، اور یہ مقصد اسے اپنے فوجیوں کے قابل قبول نقصان کی قیمت پر حاصل کرنا ہے۔ موجودہ معاملے میں استعمال کیے جانے والے طریقوں میں اسرائیلی فوج کی پوری طاقت اور غضب ناکی کو بے مہار چھوڑ دینا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ جنگجوؤں اور رہنماؤں کو ہلاک کیا جا سکے اور ان کے آلات اور عمارت کو تباہ کیا جا سکے؛ اس کے علاوہ رسد پہنچنے کے راستوں مثلاً رفاہ کی سرنگوں کے جال اور غزہ کی ماہی گیری کی گودی کو زمینی طور پر تباہ کرنا؛ اور عرب اور بین الاقوامی حمایت حاصل کرنا تاکہ حماس اور دوسروں کو تازہ دم ہونے اور اپنی فوجی بازوؤں کو نئے سرے سے مسلح کرنے سے روکا جا سکے۔ جب تک بین الاقوامی برادری اسرائیل کو غیر مبہم فتح عطا نہیں کر دیتی اس وقت تک فوج زمین پر فیصلہ کن کارروائی جاری رکھے گی۔

جیسا کہ گزشتہ اسرائیلی جنگوں میں بھی ہو چکا ہے، سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اور دانستہ طور

پر شہری آبادی پر بھاری مصائب عائد کرنا اور تعمیرات کو بڑے پیمانے پر تباہ کرنا موجودہ کارروائی کا ایک ناگزیر حصہ ہے۔ اگر آپریشن کاسٹ لیڈ غزہ کے موجودہ حکمرانوں کے خلاف عوامی بغاوت ابھارنے میں کامیاب نہیں ہوتا تو، یہ خیال پایا جاتا ہے کہ تباہی کی سطح — پورے پورے خاندانوں کا ہلاک کیا جانا، جبلیہ میں واقع اقوام متحدہ کے اسکول پر شیلنگ اور اس طرح کی دوسری ہولناکیوں — کے نتیجے میں جنگ کے خاتمے کے بعد ایسی فکر پیدا ہوگی جس میں حماس کی حمایت گھٹ جائے گی اور اس کے حریف زیادہ دلیر اور مقبول ہو جائیں گے۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ کہ اسرائیل کو چنوتی دینے کے دہشت ناک نتائج کا سامنا کر لینے کے بعد، سمجھا جاتا ہے کہ غزہ میں موجودہ حملے میں بچ جانے والوں میں سے کوئی دوبارہ آواز اٹھانے کی جرأت نہیں کرے گا؛ اگر کوئی احمق ایسا کرے گا بھی تو اس کی آواز فوراً دوستوں، پڑوسیوں یہاں تک کہ ساتھیوں کی جان بچانے کی بے تاب چیخوں میں ڈوب کر رہ جائے گی۔

جنگ بندی کی ممکنہ صورتیں

بڑھتے ہوئے بین الاقوامی سفارتی سرکس میں، اسرائیل کے لیے اصل مسئلہ ایک موثر بین الاقوامی طریق کار وضع کرنے کا ہے جس کے ذریعے حماس کو آپریشن کاسٹ لیڈ کے سرکاری طور پر فتح کے طور پر ختم ہونے کے اعلان کے بعد دوبارہ مسلح ہونے سے روکا جا سکے۔ اس سلسلے میں رفاہ سرحد کی مصری طرف غیر ملکی جنگی انجینئر بھیجنے اور غزہ کے ساحل کے گرد بحری دستے تعینات کرنے پر غور کیا جا رہا ہے۔ چونکہ یہ دونوں محافظ دستے فلسطینی زمین پر تعینات نہیں ہوں گے، اس لیے اپنی طاقت کو زائل کرنے کے معاملے میں حماس کے تعاون کی ضرورت نہ ہوگی۔ اسی طرح اسرائیل کی خواہش ایک ایسا علاقائی اور بین الاقوامی اتفاق رائے قائم کرنے کی ہوگی — مثلاً اس قسم کا اتفاق رائے جو سلامتی کاؤنسل کی کسی قرارداد کی شکل میں ظاہر ہو سکے — جس میں حماس کی جانب سے مستقل جنگ بندی کا مطالبہ کیا جائے۔ تب سنہ 2002 کی طرح وہ اسلام پسندوں سے کسی قسم کے معاہدے کے بغیر غزہ کی پٹی سے باہر نکل سکے گا، اور اپنے حریف کو کمزور کرنے کی غرض سے اپنی مرضی سے حملے اور مداخلتیں جاری رکھ سکے گا۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ ایسے منظر ناموں کی بنیاد اسرائیل کی اس صلاحیت پر ہے کہ

وہ لڑائی ختم ہونے سے پہلے پہلے قاسم بریگیڈ اور دوسرے مسلح گروپوں پر تباہ کن وار کر سکے۔

دوسروں کے نزدیک عباس کے صدارتی محافظوں کو رفاہ سرحد پر بحال کرنا اور ممکنہ طور پر غزہ میں بین الاقوامی مبصرین کو تعینات کرنا بنیادی مقاصد ہو سکتے ہیں، جن کی تہہ میں یہ امید کارفرما ہے کہ — خصوصاً اس صورت میں جبکہ غزہ سے حکومت کا مکمل خاتمہ ہو چکا ہے — وہ غزہ پر عباس کی حکمرانی کو بحال کرنے کا نقطۂ آغاز ثابت ہو سکیں گے۔ کسی اور سبب سے زیادہ اس وجہ سے حماس اب تک تیسرے فریق کے دستوں کی تعیناتی کو مسترد کرتی آئی ہے۔ مزید یہ کہ حماس میں بعض عناصر کے لیے حکومت میں شامل ہونا کسی موقع سے زیادہ ایک پابندی کی حیثیت رکھتا تھا، اور ایک ایسی شدت پسند مزاحمتی تحریک کے طور پر، جس کی جڑیں فلسطینی معاشرے میں گہرائی تک پیوست ہوں، ایک بار پھر زندگی کا آغاز کرنا کسی بھی طرح بدترین نتیجے کی حیثیت نہیں رکھتا۔ آنے والے ہفتوں اور مہینوں میں عباس کی زوال آمادہ تقدیر کیا رنگ دکھاتی ہے، یہ بات بلاشبہ اس معاملے میں بہت اہمیت کی حامل ہو گی۔ بظاہر اس نے خود کو فلسطینیوں سے، جن میں الفتح سے تعلق رکھنے والوں کی بڑھتی ہوئی تعداد بھی شامل ہے، بے تحاشا بیگانہ کر لیا ہے، اور غزہ کی لڑائی اس کے لیے ایک ایسا نقطہ ثابت ہو سکتی ہے جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

اس کے باوجود دو سوال ایسے ہیں جو دیگر تمام معاملوں کے درمیان سر اٹھائے ہوئے نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں فلسطینی عوام سے نمٹنے کے سلسلے میں، اسرائیل کی کارروائی کے من مانے پن کا رخ پھیرنے کا عمل جلد سے جلد شروع کیے جانے کی ضرورت، اور اسرائیلی قبضے کے بنیادی مسئلے پر توجہ دینے کی اتنی ہی شدید ضرورت، جس کے بغیر جنگ بندیاں، محاصرے اور آپریشن کاسٹ لیڈ جیسے ناموں کی حامل قیامتیں بالکل غیر ضروری ٹھہریں گی۔

❁❁

معین ربانی عمان، اردن، میں مقیم ایک آزاد صحافی اور تجزیہ نگار ہیں۔ ان کا یہ مضمون Middle East Report نامی جریدے کی ویب سائٹ پر 7 جنوری 2009 کو اس وقت شائع ہوا جب غزہ پر اسرائیلی فوج کا حملہ بھی تازہ تھا۔

ژاں ماری گستاو لکلیزیو

انگریزی سے ترجمہ: تمثال مسعود، اجمل کمال

پیراڈاکسوں کے جنگل میں

ہم کیوں لکھتے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ ہم سب اس آسان سوال کا اپنا اپنا جواب رکھتے ہیں۔ ہر ایک کے اپنے اپنے رجحانات، ماحول، حالات ہیں۔ اور اپنی اپنی خامیاں بھی۔ اگر ہم لکھ رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم عملی اقدام نہیں کر رہے ہیں۔ اور یہ کہ ہم حقیقت سے روبرو خود کو بڑی مشکل میں پاتے ہیں، چنانچہ ہم نے اپنے ردِعمل کو ظاہر کرنے کے لیے ایک دوسرا راستہ منتخب کر لیا ہے، ابلاغ کا دوسرا وسیلہ، ایک مخصوص فاصلہ اختیار کر لیا ہے، غور کرنے کا موقع ڈھونڈ لیا ہے۔

جن حالات نے مجھے لکھنے کی تحریک دی، اگر میں اُن پر غور کروں اور یہ غور محض خود کی دلجوئی کی خاطر نہیں، بلکہ چیزوں کو درست بیان کرنے کی خواہش کے تحت — تو میں صاف دیکھتا ہوں کہ یہ سب جنگ سے شروع ہوا۔ جنگ اُس خاص وقت کے معنی میں نہیں جب تاریخی واقعات کو بسر کیا جاتا ہے، جیسے والمی کے میدان جنگ میں فرانسیسی مہم کا بیان جرمنوں کی طرف سے گوئٹے (Goethe) نے اور انقلابی فوج کی جانب سے میرے جد فرانسوا (François) نے کیا تھا۔ وہ

فرانسیسی زبان کے ادیب ژاں ماری گستاو لکلیزیو (Jean-Marie Gustave Le Clézio) اپریل 1940 میں جنوبی فرانس کے شہر نیس میں پیدا ہوئے۔ ان کی تصانیف، جن میں ناول، افسانوں اور مضامین کے مجموعے، اور سفرنامے شامل ہیں، چالیس سے زیادہ ہیں۔ انھیں 2008 کا ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔ زیرِ نظر متن ان کے اس خطبے پر مشتمل ہے جو نوبل انعام پیش کرنے کی تقریب میں دیا گیا۔

لمحہ ضرور عروج اور دل گدازی کا رہا ہوگا۔ لیکن نہیں، میرے لیے تو جنگ وہ تجربہ ہے جسے عام لوگ، اور سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر بہت چھوٹے بچے، جھیلتے ہیں۔ میرے نزدیک جنگ کبھی تاریخی واقعہ نہیں رہی۔ ہم بھوکے تھے، خوفزدہ تھے، سردی میں اکڑ رہے تھے، اور بس۔ مجھے فیلڈ مارشل رومیل کے فوجیوں کا اپنی کھڑکی کے نیچے سے گزرتے ہوئے دیکھنا یاد ہے، جب وہ اٹلی اور آسٹریا کے شمال میں داخل ہونے کے لیے کوہ آلپس (Alps) کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ واقعہ مجھے بہت اچھی طرح یاد نہیں ہے، لیکن یہ مجھے صاف یاد ہے کہ جنگ کے بعد کے برسوں میں ہم ہر چیز سے محروم تھے، خاص طور سے کتابوں اور لکھنے کے سامان سے۔ مجھے اپنی پہلی ڈرائنگ اور پہلی تحریر کے واسطے کاغذ اور قلم کے طور پر راشن کارڈ کی پشت اور بڑھئی کی نیلی اور لال رنگ کی پنسل استعمال کرنا پڑی تھی۔ اس تجربے کے بعد میں ردّی کاغذ اور معمولی پنسل کو ایک طرح سے ترجیح دینے لگا۔ بچوں کی کتابیں نہیں تھیں، چنانچہ میں اپنی دادی کی لغات پڑھتا تھا۔ وہ لغات میرے لیے ایک حیرت خیز راستہ بنیں جہاں سے میں دنیا کو دریافت کرنے کی مہم پر نکل پڑا۔ میں ان میں چھپی تصویروں اور نقشوں کو اور غیر مانوس لفظوں کی فہرست کو دیکھتا تو خیالوں میں بھٹکتا پھرتا وردن پہنے دیکھا کرتا۔ میں نے پہلی کتاب چھ یا سات برس کی عمر میں لکھی تھی، جس کا نام تھا، Le Globe à mariner۔ اس کے فوراً بعد ہی میں نے ڈینیل سوم (Daniel III) ٹام کے ایک خیالی بادشاہ کی سوانح لکھی — جو شاید سویڈش رہا ہوگا۔ ایک اور کہانی بھی لکھی جو بحری بیڑے کی زبانی سنائی جاتی تھی۔ وہ گوشہ نشینی کا دور تھا۔ بچوں کو باہر کھیلنے کی بہت کم اجازت ملتی تھی، کیونکہ میری دادی کے گھر کے قریب جو باغ اور میدان تھے وہاں بارودی سرنگیں بچھی ہوئی تھیں۔ مجھے یاد ہے، ایک بار جب میں سمندر کے کنارے ٹہل رہا تھا تو میں نے کانٹوں والے تار سے زمین پر احاطہ بندی دیکھی تھی: اس پر فرانسیسی اور جرمن زبان میں اس احاطے میں داخل ہونے والوں کے لیے بڑی درشت زبان میں تنبیہ درج تھی، اور اس کے مطلب کو بالکل واضح کرنے کی خاطر ایک کھوپڑی بھی بنی ہوئی تھی۔

اس تناظر میں، فرار کی قوی خواہش کو سمجھنا آسان ہے — لہٰذا خواب دیکھنے، اور ان خوابوں کو تحریر میں بیان کرنے کی خواہش کو بھی۔ اس کے علاوہ، میری نانی کمال کی قصہ گو تھیں، وہ ان لمبی سہ پہروں کو کہانیاں سنانے میں صرف کرتی تھیں۔ وہ کہانیاں ہمیشہ بڑی خیال انگیز ہوتی تھیں اور ان کی

جائے وقوع جنگل ہوتا تھا۔ شاید یہ افریقہ کا جنگل تھا، یا ماریشس کا یا Macchabée کا۔ ان کہانیوں کا مرکزی کردار ایک بندر ہوتا تھا جو بڑا فطین تھا اور خطرناک سے خطرناک صورت حال میں بھی اپنا راستہ نکال لیتا تھا۔ بعد میں میں نے افریقہ کا سفر کیا اور وہاں وقت گزارا، اور اصلی جنگل کو دریافت کیا، وہ جنگل جہاں جانور قریب قریب بالکل نہیں تھے۔ لیکن کیمرون کی سرحد کے قریب اوبودو (Obudu) نام کے ایک گاؤں میں ضلعی افسر نے مجھے بتایا کہ قریب کی پہاڑی پر رہنے والے گوریلوں کے اپنے سینے پر گھونسے مارنے کی دھمک کو کیسے سنا جا سکتا ہے۔ اور اس سفر سے، اور وہاں جو وقت میں نے گزارا (نائیجیریا میں، جہاں میرے والد بش ڈاکٹر تھے) اس سے، واپسی پر جو چیز میں اپنے ساتھ لایا وہ مستقبل میں لکھے جانے والے اپنے ناولوں کا نفسِ مضمون نہیں تھا، بلکہ میں ایک طرح کی دوسری شخصیت کے ساتھ لوٹا، دن میں خواب دیکھنے والا جو ساتھ ساتھ حقیقت کا بھی گرویدہ تھا، اور یہ شخصیت پوری عمر میرے ساتھ رہی ہے — اپنے وجود میں ایک متضاد رخ، ایک اجنبیت کی مانند جو کبھی کبھی اذیت کا سبب رہی۔ زندگی کی سست روی کے پیشِ نظر، اس تضاد کی اہمیت کو سمجھنے میں مجھے اپنے وجود کا خاصا بڑا حصہ صرف کرنا پڑا۔

کتابیں میری زندگی میں بعد میں داخل ہوئیں۔ ماریشس کے مقام موکا (Moka) میں اپنے خاندانی گھر سے والد کے نکال دیے جانے پر جب انھیں میراث کے بٹوارے میں حصہ ملا تو انھوں نے اپنے حصے میں آنے والی کتابوں سے کئی لائبریریاں بنالیں۔ تب وہ بات میری سمجھ میں آئی جو بچوں کو فوری طور پر سمجھ میں نہیں آتی ہے، کہ کتابیں ایسا خزانہ ہیں جو کسی زمین جائیداد یا بینک اکاؤنٹ سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتی ہیں۔ اُن جلدوں میں — جن میں بیشتر بڑی پرانی، مجلد ضخیم کتابیں ہیں — میں نے عالمی ادب کی عظیم تحریروں کو دریافت کیا ٹونی جوہانوٹ (Tony Johannot) کی مصور کی ہوئی Don Quixote، La vida de Lazarillo de Tormes، Ingoldsby Legends، گلیورز ٹریولز؛ وکٹر ہیوگو کی Quatre-vingt-treize، Les Travailleurs de la Mer اور L'Homme qui rit۔ بالزاک کی Les Contes drôlatiques بھی۔ لیکن جن کتابوں نے مجھ پر سب سے زیادہ اثر چھوڑا وہ سیاحوں کے منتخب سفرناموں کے مجموعے تھے، زیادہ تر

Scanned with CamScanner

ہندوستان، افریقہ اور ماسکرین (Mascarene) کے جزیروں کے سفر کے قصے، یا پھر دیوموں ڈورول (Dumont d'Urville) یا ایبے روشوں (Abbé Rochon) کی عظیم مہمات کی تاریخیں، اسی طرح بوگینول (Bougainville)، کک (Cook) اور بے شک مارکوپولو کے سفرنامے۔ افریقہ میں آزادی کے برس گزارنے کے بعد، دھوپ میں اونگھتے ہوئے چھوٹے سے گاؤں کی معمولی زندگی میں ان کتابوں نے مجھے مہم جوئی کا مزہ دیا، اصل دنیا کی وسعت کا احساس کرایا، علم سے زیادہ جبلت اور حواس کے ذریعے حقیقت کی دریافت کا مطلب سمجھایا۔ ایک لحاظ سے بہت جلد ہی ان کتابوں نے مجھے بچوں کے وجود میں پنہاں تضاد سے بھی واقف کرادیا جیسے کوئی بچہ تشدد اور مقابلہ آرائی کو بھلانے کے لیے پناہ گاہ میں دبکا رہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ کھڑکی میں سے باہر کی رواں دواں زندگی کو دیکھنے میں بھی مزہ لے۔

سویڈش اکیڈمی کی جانب سے یہ اعزاز دیے جانے کی خبر — جو میرے لیے حیرت خیز تھی — ملنے سے کچھ وقت پہلے میں اسٹگ ڈیگرمان (Stig Dagerman) کی مختصر سی کتاب پڑھ رہا تھا جو مجھے بے حد پسند ہے۔ یہ کتاب سیاسی مضامین کا مجموعہ ہے جس کا عنوان Essäer och texter ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں تھا کہ میں اس تلخ اور کھردرے کتاب کو ایک بار پھر پڑھ رہا تھا۔ اصل میں ایک انعام لینے کے لیے، جو اسٹگ ڈیگرمان کے دوستوں کی انجمن نے مجھے پچھلی گرمیوں میں دیا تھا، میں سویڈن کے سفر کی تیاری کر رہا تھا۔ مجھے ان مقامات پر بھی جانا تھا جہاں وہ مصنف اپنے بچپن میں رہ چکا تھا۔ ڈیگرمان کی تحریروں کا اسلوب، اور جس طرح وہ بچوں کی سی نرمی کو بھولپن اور طنز کے ساتھ ملاتا ہے، وہ ہمیشہ سے مجھے بہت مرغوب رہا ہے۔ اور اس کی آدرش پسندی بھی۔ اور اس کی واضح نظر بھی جس کے ساتھ وہ اپنے پریشان کن، بعد از جنگ برسوں کا — جب وہ پختہ عمر کا تھا، اور میرا بچپن تھا — تجزیہ کرتا ہے۔ اس کے ایک جملے نے خاص طور پر میری توجہ اپنی جانب مبذول کرلی، اور اس لمحے مجھے ایسا لگا کہ یہ مجھ سے ہی مخاطب ہو کر کہا جا رہا ہے، کیونکہ انھیں دنوں میرا ایک ناول Ritournelle de la faim شائع ہوا تھا۔ وہ جملہ، یا وہ اقتباس، یوں تھا: "یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک طرف، مثال کے طور پر، آپ ایسا برتاؤ کریں جیسے زمین پر ادب سے زیادہ اہم اور کوئی شے نہیں، اور دوسری طرف یہ دیکھنے سے قاصر رہیں کہ جس طرف دیکھیے لوگ بھوک کے خلاف جدوجہد

کررہے ہیں اور سب سے اہم بات جس پر ان کی توجہ مرکوز رہتی ہے وہ یہ ہے کہ مہینے کے آخر میں ان کے ہاتھ میں کیا آئے گا؟ کیونکہ یہ وہ مقام ہے جہاں وہ (ادیب) ایک نئے پیراڈاکس سے روبرو ہوتا ہے۔ وہ تو دراصل ان لوگوں کے لیے لکھنا چاہتا تھا جو بھوکے ہیں، مگر اب اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے وجود سے آگاہ ہونے کی فرصت صرف ان لوگوں کو میسر ہے جن کے پاس کھانے کو بہت ہے۔"

("ادیب اور شعور")

اسٹگ ڈیگرمان جس شے کو "پیراڈاکسوں کا جنگل" (forest of paradoxes) کہتا ہے، ٹھیک وہی جگہ ہے جہاں لکھنے کا عمل واقع ہوتا ہے، یعنی وہ مقام جہاں سے فن کار کو فرار کی کوشش نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے برعکس، اسے باہر نکل کر اس کی ایک ایک تفصیل کی جانچ کرنا چاہیے، ہر راہ کو دریافت کرنا، ہر چیز کو نام دینا چاہیے۔ اس مقام پر رہنا ہمیشہ خوشگوار نہیں ہوتا ہے۔ اسے تو لگتا تھا کہ اسے ایک پناہ گاہ مل گئی ہے، وہ اپنے دل کی بات یوں کاغذ کے سپرد کرتا تھا جیسے کسی قریبی، شفیق دوست کو رازدار بنا رہا ہو، لیکن اب لکھنے والوں کا سامنا حقیقت سے ہوتا ہے، وہ نہ صرف اس کا مشاہدہ کرتے ہیں، بلکہ عملی طور پر اس میں شریک ہوتے ہیں۔ انھیں طے کرنا پڑتا ہے کہ وہ اس کشمکش میں کس فریق کے ساتھ ہیں، انھیں حقیقت سے اپنا فاصلہ متعین کرنا پڑتا ہے۔ سیسرو (Cicero)، رابلے (Rabelais)، کوندورسے (Condorcet)، روسو (Rousseau)، مادام دستیل (Madame de Staël)، یا بالکل زمانۂ حال کے سولژے نتسن (Solzhenitsyn) یا ہوانگ سوک یونگ (Hwang Sok-yong)، عبداللطیف لعابی (Abdelatif Laâbi) یا میلان کنڈیرا (Milan Kundera): ان میں ہر ایک کو جلاوطنی کا راستہ طے کرنا پڑا۔ مجھ جیسے کسی شخص کے لیے جو ہمیشہ — جنگ کے زمانے کے مختصر دور کو چھوڑ کر — گھومنے پھرنے کی آزادی سے لطف اندوز ہوا ہے، یہ تصور کہ کسی کو اس جگہ رہنے سے روک دیا جائے جس کا اس نے انتخاب کیا ہو اسی طرح ناقابل قبول ہے جس طرح یہ خیال کہ کسی کو اس کی آزادی سے محروم کر دیا جائے۔

لیکن گھومنے پھرنے کی آزادی کا نتیجہ اس پیراڈاکس ہی کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ جنگل کے بیچوں بیچ جہاں ادیب رہتا ہے، وہاں کے اس نوکیلے کانٹوں والے پیڑ کو لمحے بھر کے لیے دیکھیے: یہ

Scanned with CamScanner

لکھنے والا، یا لکھنے والی، لکھنے میں، اپنے خوابوں کو ایجاد کرنے میں معروف ہے — کیا یہ ان معدودے چند لوگوں میں شامل نہیں جنھیں خوش قسمتی اور مسرت حاصل ہے؟ آیئے ذرا رک کر ایک شدید، دہشت ناک صورت حال کا تصور کریں — ایسی صورت حال کا جس میں اس زمین پر رہنے والوں کی وسیع اکثریت رہ رہی ہے۔ وہی صورت حال جس میں، بہت عرصہ پہلے، ارسطو (Aristotle) یا تالستائی (Tolstoy) کے دور میں، وہ لوگ رہ رہے تھے جن کو کوئی سماجی حیثیت حاصل نہیں تھی — ازمنۂ وسطیٰ کے یوروپ میں غلام (serfs)، نوکر، بیگار کرنے والے (villeins) یا وہ لوگ جنھیں افریقہ کے ساحلوں سے گروہ در گروہ اغوا کر کے گورے (Gorée)، یا المینا (El Mina)، یا زنجبار میں بیچا گیا۔ اور آج بھی، جب میں آپ سے بات کر رہا ہوں، ایسے کتنے لوگ ہیں جنھیں بولنے کی آزادی میسر نہیں ہے، جو گویا زبان کے دوسری طرف ہیں۔ میں گرامشی (Gramsci) کے مسلح جدوجہد کے نظریے یا سارتر (Sartre) کے ناامیدی کے داؤ (disillusioned wager) کے خیال سے زیادہ ڈیگرمان کے قنوطی خیالات سے مغلوب ہو جاتا ہوں۔ یہ خیال کہ ادب فرمانروا طبقے کے عیش کی چیز ہے، کہ یہ ان خیالات اور تصورات پر نشوونما پاتا ہے جو وسیع اکثریت کے لیے اجنبی رہتے ہیں: یہی اس اضطراب کا اصل سبب ہے جسے ہم سب محسوس کرتے ہیں — جب میں ان لوگوں سے خطاب کرتا ہوں جو لکھتے اور پڑھتے ہیں۔ بے شک ہم اُن لوگوں تک بات پہنچانا چاہتے ہیں جنھیں خارج کر دیا گیا ہے، ہم انھیں کریم النفسی سے تہذیب کی ضیافت میں مدعو کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا کرنا اتنا مشکل کیوں ہے؟ آخر تحریر سے عاری لوگ بھی — جیسا کہ ماہرین بشریات انھیں کہتے ہیں — نغموں اور اساطیر کے ذریعے مکمل ابلاغ کی صورت پیدا کرتے آئے ہیں۔ تو آج ہمارے صنعتی معاشرے میں ایسا کرنا ناممکن کیوں ہو گیا ہے؟ کیا ہمیں تہذیب کو پھر سے ایجاد کرنے کی ضرورت ہے؟ کیا ہمیں ابلاغ کی فوری، براہ راست صورت کی طرف لوٹنے کی ضرورت ہے؟ اس پر یقین کرنا بڑا ترغیب انگیز ہے کہ ہمارے وقت میں سنیما یہی کردار ادا کر رہا ہے، یا مقبول موسیقی اپنی دھن اور نغموں، اپنے رقص کی بازگشت کے ساتھ، یا جاز (Jazz) اور دوسرے علاقوں کی موسیقی، جیسے (افریقی کریبائی) کالپسو (Calypso) موسیقی، یا (جزیرۂ ری یونین کی) مالویا (Maloya) اور سیگا (Sega) موسیقی۔

یہ پیراڈاکس کوئی نیا نہیں ہے۔ بہت پہلے فرانسیسی زبان کے عظیم ترین مصنف فرانسوا رابلے (François Rabelais) نے عوام کی زبان سے چنے ہوئے لفظوں سے سوربون (Sorbonne) کے عالموں پر ان کے روبرو طنز کر کے ان کے ادعائے فضیلت سے معرکہ آرائی کی تھی۔ کیا وہ ان لوگوں کی طرف سے بول رہا تھا جو بھوکے ہیں؟ فراوانی، مدہوشی، ضیافت — اس نے مزدوروں اور کسانوں کی فاقہ کشی پر پل کر فربہ ہونے والوں کی غیر معمولی بھوک کو لفظوں میں بیان کر دیا، صرف اتنی دیر کے لیے کہ سوانگ میں دنیا سر کے بل کھڑی دکھائی دے سکے۔ انقلاب کا پیراڈاکس، قدیم مغموم چہروں والے سورماؤں کے گھڑسوار جلوس کی طرح، ویب کے شعور میں جیتا ہے۔ ایک خوبی ادیب کے قلم کے ساتھ ہمیشہ منسلک رہنا چاہیے، وہ یہ کہ قلم کو طاقتور کی مدح میں ہرگز استعمال نہ کیا جائے، ایک خفیف ترین لکیر کھینچنے کے لیے بھی نہیں۔ لیکن، محض فنکار کے اس خوبی پر عملاً کاربند رہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ تمام شک و شبہے سے خود کو پاک محسوس کرنے لگے۔ اس کی بغاوت، تکذیب اور بددعا یقینی طور پر حد بندی کے ایک جانب موجود ہیں — طاقت کی زبان کی طرف۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ الفاظ، کچھ فقرے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔ لیکن باقی سب؟ کسی قدیم تختی کے مٹے ہوئے حروف پر لکھی جانے والی نئی عبارت، لیت و لعل کا ایک خوش وضع اور بہت پہلے گزرا ہوا وقفہ، اور بعض اوقات مزاح، جو ناامیدی کی شائستگی کو نہیں بلکہ ان لوگوں کی ناامیدی کو ظاہر کرتا ہے جو اچھی طرح اپنی کمیوں کو سمجھتے ہیں، مزاح ایک ساحل ہے جہاں بے انسانی کی شدید لہروں نے ان کو لا پھینکا ہے۔

تو پھر، کیوں لکھا جائے؟ اب کچھ عرصے سے ادیب اتنے بے باک نہیں رہے کہ یقین کر سکیں کہ وہ دنیا کو بدل سکتے ہیں، کہ اپنی کہانیوں اور ناولوں کے ذریعے اس کی ایک بہتر مثال پیدا کر دیں گے کہ زندگی کیسی ہونا چاہیے۔ سیدھی بات یہ ہے کہ وہ گواہی دینا چاہتے تھے۔ پیراڈاکسوں کے جنگل میں اس دوسرے پیڑ کو دیکھیے۔ ادیب گواہی دینا چاہتا ہے، جبکہ اصل میں بیشتر وقت وہ تاک جھانک سے مزے لینے والے سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا۔

اس کے باوجود ایسے ادیب ہیں جو واقعی گواہ بن جاتے ہیں دانتے طربیۂ خداوندی (La Divina Commedia) میں، شیکسپیئر The Tempest میں، اور ایسے سیزیر

(Aimé Cesaire) اس کھیل کی شاندار adaptation میں جس کا نام Une Tempête ہے، جس میں کالیبان (Caliban)، بارود سے بھرے پیپے پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا ہوا خود کو اور اپنے ساتھ اپنے ذلیل مالکوں کو دھماکے سے اڑا دینے کی دھمکی دیتا ہے۔ اور بھی کئی ایسے گواہ ہیں جن پر کسی قسم کا اعتراض وارد نہیں ہو سکتا، جیسے یوکلیدیس دا کنہا (Euclides da Cunha) اپنی کتاب Os Sertões میں یا پریمو لیوی (Primo Levi) – ہم Der Prozess میں (یا چارلی چیپلن کی فلموں میں بھی) دنیا کے بے تکے پن کو دیکھتے ہیں: کولیٹ (Colette) کی La Naissance du Jour میں دنیا کا ناقص پن دکھائی دیتا ہے، اور جوئس (Joyce) نے اپنے ناول Finnegans Wake میں جو آئرش بیلیڈ (ballad) تخلیق کیا ہے اس میں ہم دنیا کے کارخانۂ توہم کو دیکھتے ہیں۔ پیٹر میتھیسن (Peter Matthiessen) کے ناول The Snow Leopard میں یا آلڈو لیوپولڈ (Aldo Leopold) کے ناول A Sand County Almanac میں دنیا کا حسن ناقابل مزاحمت انداز میں دمکتا ہے۔ دنیا کی شیطنت ولیم فاکنر (William Faulkner) کے ناول Sanctuary میں یا لاؤ شے (Lao She) کی First Snow میں دکھائی دیتی ہے۔ ڈیگرمان کے ناول سانپ (The Snake) میں دنیا کا بچوں کا سا نازک پن دکھائی دیتا ہے۔

بطور گواہ بہترین ادیب وہ ہے جو اپنے نہ چاہنے کے باوجود گواہی دیتا ہے۔ پیراڈاکس یہ ہے کہ وہ جس کی گواہی دیتا ہے وہ وہ نہیں جو اس نے دیکھا ہے، بلکہ وہ بھی نہیں جو اس نے ایجاد کیا ہے۔ اس سے تلخی، بلکہ مایوسی بھی پیدا ہو سکتی ہے کیونکہ وہ فرد جرم عائد کیے جانے کے موقعے پر موجود نہیں رہ سکتا۔ نپولین کی فوج کے حملے نے روس کو جس اذیت میں مبتلا کیا تالستائی (Tolstoy) اسے دکھا سکتا ہے، لیکن اس کے لکھنے کے نتیجے میں تاریخ کے دھارے کا رخ نہیں بدلتا۔ کلیر دو دیوراس (Claire de Duras) نے Ourika لکھی، اور ہیریٹ بیچر اسٹو (Harriet Beecher Stowe) نے Uncle Tom's Cabin، لیکن یہ غلام بنائے گئے لوگوں کی اپنی جدوجہد تھی جس نے ان کی قسمت کو بدلا، جنھوں نے فرنچ گیانا میں، برازیل میں اور ویسٹ انڈیز میں میروون مزاحمت کو تشکیل دے کر اور ہائتی (Haiti) میں پہلی سیاہ فام جمہوریہ قائم کر کے ناانصافی

Scanned with CamScanner

کے خلاف بغاوت اور جنگ کی۔

عملی اقدام — سب سے بڑھ کر یہی وہ کام ہے جو کوئی ادیب کرنا چاہتا ہے۔ گواہی دینا نہیں بلکہ عملی اقدام کرنا۔ اس طرح لکھنا، تصور کرنا اور خواب دیکھنا کہ اس کے الفاظ اور اختراعات اور خواب حقیقت پر اثر انداز ہو جائیں، لوگوں کے دلوں اور دماغوں کو بدل ڈالیں، بہتر دنیا کے قیام کے لیے راستہ ہموار کریں۔ اس کے باوجود، ٹھیک اس لمحے میں، ایک آواز سرگوشی میں اس سے کہہ رہی ہے کہ یہ ممکن نہیں ہوگا، کہ لفظ فقط لفظ ہیں جنھیں معاشرے کی ہوائیں اڑا لے جائیں گی، اور خواب محض بھرم ہیں۔ اسے یہ خواہش کرنے کا کیا حق ہے کہ کاش وہ اس سے بہتر کوئی شے ہوتا؟ کیا واقعی حل تلاش کرنے کی کوشش کرنا ادیب کا کام ہے؟ کیا اس کی حالت Knock ou Le Triomphe de la médecine نامی ڈرامے کے گیم کیپر کی سی نہیں ہے، جو ایک زلزلے کو روکنا چاہتا ہے؟ ادیب عملی اقدام کیونکر کر سکتا ہے جبکہ اسے اگر کچھ آتا ہے تو صرف یاد کرنا؟

تنہائی اس کی زندگی کی تقدیر ہوتی ہے۔ ہمیشہ سے ایسا ہی رہا ہے۔ بچپن میں، وہ نازک، مضطرب، بے حد ذکی الحس لڑکا ہوتا ہے، یا کولیت کی بیان کردہ لڑکی، جو اپنے ماں باپ کو ایک دوسرے کو پھاڑ کھانے سے روک تو نہیں سکتی لیکن ان کو دیکھ کر اس کی بڑی بڑی کالی آنکھیں تکلیف دہ توجہ کے ساتھ پھیل جاتی ہیں۔ تنہائی ادیبوں پر بہت مہربان ہوتی ہے اور یہ تنہائی کا ہی ساتھ ہوتا ہے جس میں وہ اصل مسرت کا احساس پاتے ہیں۔ یہ ایک متضاد مسرت ہے، تکلیف اور راحت کی آمیزش، ایک موہوم فتح، ایک خاموش، ہر جگہ موجود کرب، جو ذہن سے چمٹ جانے والی کسی چھوٹی سی گت سے زیادہ مختلف نہیں ہوتی۔ ادیب دوسروں سے کہیں بہتر طور پر جانتا ہے کہ اس مہلک، زہریلے پودے کو کیسے اگایا جائے جو خود اپنی بے طاقتی کی مٹی میں پنپتا ہے۔ ادیب ہر ایک کے بارے میں، اور ہر دور کے بارے میں، بات کرنا چاہتا تھا، اور یہ دیکھیے ہر ادیب کو — مرد ہو یا عورت — اپنے کمرے میں، پراسرار روشنی والے لیمپ شیڈ کے نیچے، تنہائی میں، کورے صفحے کے انتہائی سفید آئینے کے مقابل بیٹھے ہوئے۔ یا بے حد روشن کمپیوٹر اسکرین کے سامنے بیٹھے، کی بورڈ پر چلتی ہوئی انگلیوں کی کھٹ کھٹ کی آواز سنتے ہوئے۔ چنانچہ، یہی ادیب کا جنگل ہے۔ اور ہر ادیب اس جنگل کے تمام راستوں سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے۔ کبھی کبھار اگر کوئی چیز وہاں سے فرار ہو جائے، جیسے صبح تڑکے

کوئی چڑیا کتے سے ڈر کر پھڑ پھڑا کر اڑ جائے، تب خود ادیب متحیر ہو جاتا ہے — ایسا محض اتفاق سے ہو گیا، اس کے جانے بغیر۔

تاہم، میں منفی پن میں مبتلا نہیں ہونا چاہتا۔ ادب — اور یہی وہ نکتہ ہے جس کو میں واضح کرنا چاہتا ہوں ادب کوئی فرسودہ تبرک نہیں ہے جس کی جگہ، منطقی طور پر، سمعی و بصری فنون، خاص طور سے سینما، کو لے جانے والی ہے۔ ادب ایک پیچیدہ، کٹھن راستہ ہے، لیکن میں اسے آج کے دور میں بائرن یا وکٹر ہیوگو کے زمانے سے زیادہ اہم سمجھتا ہوں۔

ادب کیوں ضروری ہے، اس کے دو سبب ہیں:

اول یہ کہ ادب زبان سے تشکیل پاتا ہے۔ لفظ کا ابتدائی مفہوم حروف، جو لکھے جاتے ہیں۔ فرانسیسی زبان کا لفظ roman ان متون کی جانب اشارہ کرتا ہے جنھوں نے دورِ وسطیٰ کے بعد لوگوں کی بولی ہوئی زبان کو، رومانس زبان کو استعمال کیا۔ اور مختصر افسانے کے لیے nouvelle لفظ بھی اسی ندرت کے تصور سے نکلا ہے۔ تقریباً اسی زمانے میں فرانس میں شاعری اور شاعروں کے لیے استعمال کیا جانے والا لفظ rimeur (جو rime یا rhyme سے نکلا تھا) چلن سے باہر ہو گیا — اور اس کی جگہ جو الفاظ مروج ہوئے وہ یونانی فعل poiein سے مشتق تھے۔ ادیب، شاعر، ناول نگار، یہ سب تخلیق کار ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ زبان کو ایجاد کرتے ہیں، بلکہ یہ کہ وہ حسن، خیالات اور پیکروں کو تخلیق کرنے کے لیے زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ اسی لیے ہم ان کے بغیر گزارا نہیں کر سکتے۔ نوعِ انسان کی تاریخ میں زبان سب سے غیر معمولی ایجاد ہے، جو سب سے پہلے ہوئی، اور جو ہر چیز کو آپس میں بانٹنے کو ممکن بناتی ہے۔ زبان کے بغیر نہ سائنس ہوتی، نہ ٹکنالوجی، نہ قانون، نہ فن، نہ محبت۔ اگر کسی دوسرے شخص سے بات نہ کی جائے تو ایجاد خیالی بات ہو کر رہ جائے گی۔ یہ گھلنے لگے گی، سکڑنے، مفقود ہونے لگے گی۔ ادیب، کسی حد تک، زبان کے محافظ ہیں۔ اپنے ناول، شاعری، ڈرامے لکھ کر وہ زبان کو زندہ رکھتے ہیں۔ وہ فقط لفظوں کو استعمال نہیں کرتے — اس کے برخلاف، وہ زبان کی خدمت کرتے ہیں۔ وہ اس کا جشن مناتے ہیں، اسے رواں کرتے ہیں، اس کی کایا کلپ کرتے ہیں، کیونکہ زبان ان کے ذریعے سے اور ان کی وجہ سے زندہ رہتی ہے، اور یہ ان کے زمانے کے تمام سماجی اور اقتصادی تغیرات کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔

Scanned with CamScanner

پچھلی صدی میں جب نسل پرستانہ نظریات کا اظہار کیا گیا تو یہ کہا گیا کہ مختلف تہذیبوں کے درمیان فرق بنیادی نوعیت کا ہوتا ہے۔ ایک مہمل قسم کی درجہ بندی کے ذریعے نوآبادیاتی طاقتوں کی اقتصادی کامیابی کا تعلق ان کی تہذیبی برتری سے جوڑا جانے لگا۔ اس طرح کے نظریات آج بھی، کسی ہذیانی خواہش کی طرح، یہاں وہاں، جدید نوآبادیت یا شہنشاہیت کا جواز پیش کرنے کی خاطر، ابھرتے رہتے ہیں۔ ہم کو بتایا جاتا ہے کہ کچھ قومیں پیچھے رہ گئی ہیں، اور جہاں تک زبان کا تعلق ہے، اپنے حقوق اور مراعات حاصل نہیں کر سکیں، اس لیے کہ وہ اقتصادی طور پر پچھڑی ہوئی ہیں یا ٹکنالوجی کے لحاظ سے ازکار رفتہ ہیں۔ لیکن کیا اپنی تہذیبی برتری کے قائل ان افراد کو یہ احساس ہے کہ دنیا میں تمام لوگ، ان کی ترقی کا درجہ چاہے جو بھی ہو، زبان کو استعمال کرتے ہیں؟ اور یہ کہ ان میں سے ہر زبان، یکساں طور پر، اپنی منطق، پیچیدہ، تحلیلی ہیئت اور ساخت رکھتی ہے جو اسے دنیا کا اظہار کرنے کے قابل بناتی ہے، جو اسے سائنس یا اساطیر کی ایجاد کے بارے میں بتانے کے قابل بناتی ہے؟

اب جبکہ میں اس مبہم اور کسی قدر رفتہ و گزشتہ مخلوق کے وجود کی مدافعت کر چکا ہوں جسے ہم لوگ ادب کہتے ہیں، میں ادب کی ضرورت کے دوسرے سبب کی طرف آنا چاہتا ہوں، کیونکہ اس کا تعلق اشاعت کے عمدہ پیشے سے ہے۔

آج کل گلوبلائزیشن کے بارے میں بڑی باتیں ہوتی ہیں۔ لوگ بھول جاتے ہیں کہ درحقیقت اس کی ابتدا یورپ میں نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے زمانے میں، نوآبادیاتی دور کی ابتدا کے ساتھ ساتھ، ہوئی تھی۔ گلوبلائزیشن بذات خود کوئی بری چیز نہیں ہے۔ طب اور سائنس میں ہونے والی ترقی کو مواصلات نے بڑھاوا دیا ہے۔ شاید اطلاعات کا پھیلاؤ تنازعات کو روکنے میں مدد کر سکے گا۔ کیا معلوم، اگر انٹرنیٹ اس وقت وجود میں آ گیا ہوتا، تو شاید ہٹلر کا مجرمانہ منصوبہ کامیاب نہ ہو پاتا۔ شاید تمسخر کا ہدف بن کر وہ کبھی دن کی روشنی نہ دیکھ پاتا۔

ہم لوگ انٹرنیٹ اور ورچوئل (virtual) اطلاع رسانی کے دور میں جی رہے ہیں۔ یہ اچھی بات ہے، لیکن اگر لکھی ہوئی زبان اور کتابوں کا وجود نہ ہوتا تو ان حیرت انگیز ایجادات کی کیا وقعت ہوتی؟ دنیا میں ہر ایک کو ایل سی ڈی فراہم کرنا ایک خیالی بات ہے۔ چنانچہ کیا ہم ایک نئی اشرافیہ کو تخلیق

Scanned with CamScanner

کرنے کے عمل میں نہیں ہیں، دنیا کے لوگوں کو دو زمروں میں تقسیم نہیں کرتے جا رہے ہیں، ایک وہ جن کی رسائی اطلاعات اور علم تک ہے اور دوسرے وہ جو اس دائرے سے باہر رہ گئے ہیں؟ عظیم قومیں، عظیم تہذیبیں معدوم ہو چکی ہیں کیونکہ وہ یہ سمجھنے میں ناکام رہیں کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایسی عظیم تہذیبیں موجود ہیں، جنھیں اقلیت میں سمجھا جاتا ہے، جو آج تک علم اور اساطیر کی زبانی ترسیل کے ذریعے، اس عمل کی مزاحمت کرتی آ رہی ہیں۔ ان تہذیبوں کے تعاون کا اعتراف کرنا ناگزیر اور سود مند ہے۔ لیکن چاہے ہم یہ پسند کریں یا نہ کریں، اور خواہ ہم اب تک سچ حقیقت کو نہ پہنچے ہوں، ہم اب اساطیری کہانیوں کے دور میں نہیں جی رہے ہیں۔ جب تک ہر بچہ تحریر کے فوائد حاصل نہیں کر لیتا اس وقت تک برابری اور ہر فرد کے احترام کی بنیاد مہیا کرنا ممکن نہیں ہے۔

اور اب نوآبادیات کے خاتمے (decolonization) کے بعد کے اس دور میں، ادب مردوں اور عورتوں کے لیے اپنی شناخت کو ظاہر کرنے، اپنی بات کہنے کی آزادی کو برتنے اور اپنی مختلف آواز کو سنانے کا ایک وسیلہ بن چکا ہے۔ بغیر ان کی آوازوں، ان کی پکار کے ہمیں خاموشی کی دنیا میں رہنا ہوگا۔

عالمی پیمانے پر تہذیب کا تعلق ہم سب سے ہے۔ لیکن سب سے بڑھ کر یہ قاری کی — دوسرے لفظوں میں تاثر کی — ذمے داری ہے بے شک یہ ناانصافی ہے کہ کناڈا کے دور افتادہ شمالی علاقے میں رہنے والے ایک انڈین کو، اگر وہ چاہتا ہے کہ اس کی آواز سنی جائے، فاتحین کی زبان فرانسیسی یا انگریزی میں لکھنا ہوگا۔ بے شک یہ توقع محض فریب نظر ہے کہ ماریشس یا ویسٹ انڈیز کی کریول (Creole) زبان دنیا بھر میں اتنی ہی آسانی سے سنی جا سکے گی جتنی آسانی سے ان پانچ زبانوں کو سنا جاتا ہے جو آج میڈیا پر مطلق العنان بادشاہوں کی طرح قابض ہیں۔ لیکن اگر، ترجمے کے ذریعے، ان آوازوں کو سنا جا سکے تو یہ ایک نئی بات ہوگی، اور اس سے رجائیت کا جواز پیدا ہوگا۔ تہذیب، جیسا کہ میں نے کہا، ہم سب کی ہے، پوری نوع انسانی کی ہے۔ لیکن یہ بات تبھی سچ ہوگی جب ہر ایک کو تہذیب تک مساوی دسترس حاصل ہو۔ کتاب، خواہ وہ کتنی ہی پرانے فیشن کی چیز ہو، ایک آئیڈیل وزار کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کارآمد ہے، استعمال میں آسان ہے، کفایتی ہے۔ اسے استعمال کرنے کے لیے کسی خاص تکنیکی مہارت کی ضرورت نہیں ہے، اور یہ ہر طرح کے موسم میں ٹھیک

رہتی ہے۔ اس کا واحد عیب — اور یہاں میں خاص طور سے ناشروں کو مخاطب کرنا چاہوں گا — یہ ہے کہ بہت سے ایسے ممالک ہیں جہاں اب بھی کتاب تک رسائی بڑی مشکل ہے۔ موریشس میں ایک ناول یا شعری مجموعے کی قیمت ایک کنبے کے بجٹ کے خاصے بڑے حصے کے برابر ہے۔ افریقہ میں، جنوب مشرقی ایشیا میں، میکسیکو میں یا جنوبی جزیروں میں کتابیں ابھی تک نا قابل حصول نعمت ہیں۔ تاہم اس صورت حال سے نپٹنے کے حل موجود ہیں۔ جیسے ترقی پذیر ممالک کے ساتھ مشترکہ اشاعتی ادارے، بک موبائیل اور کتب خانوں کے لیے مالی امداد کی فراہمی، اور سب سے بڑھ کر اقلیتی کہی جانے والی زبانوں کی — جو اکثر قطعی اکثریت میں ہوتی ہیں — طرف سے آنے والی درخواستوں اور ان میں لکھی جانے والی تصانیف پر پوری توجہ — ان اقدامات کے نتیجے میں ایک حیران کن اوزار کے طور پر ادب کا کردار جاری رہ سکتا ہے جس کے ذریعے ہم دوسرے انسانوں کو دریافت کر سکتے ہیں اور نوعِ انسانی کے نغموں کو، ان کے موضوعات اور تغیرات کے تمام تنوع کے ساتھ، محسوس کر سکتے ہیں۔

مجھے لگتا ہے کہ میں اس جنگل کے بارے میں اور بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اس کی وجہ بلاشبہ یہ ہے کہ اسٹگ ڈیگرمان کا وہ مختصر جملہ اب تک میرے ذہن میں گونج رہا ہے اور یہ کہ میں اسے پڑھنا اور بار بار پڑھنا چاہتا ہوں، خود کو اس سے بھر لینا چاہتا ہوں۔ اس کے لفظوں میں مایوسی کا سا اشارہ ہے، اور ساتھ ہی ساتھ فتح مندی کی سی کچھ بات بھی ہے، کیونکہ اسی تنگی میں ہم سچائی کی تھوڑی سی مقدار بھی محسوس کر سکتے ہیں جس کی ہم سب کو تلاش رہتی ہے۔ اپنے بچپن میں اس جنگل کو میں خواب میں دیکھا کرتا تھا۔ یہ مجھے بیک وقت ڈراتا اور مسحور کرتا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ ٹام تھمب (Tom Thumb) اور ہینزل (Hansel) کو بھی اس جنگل میں، اس کے تمام خطروں اور اس کی تمام خوبصورتی سے گھر جانے پر، ایسا ہی محسوس ہوا ہوگا۔ یہ جنگل ایسی دنیا ہے جہاں راہ کی نشانیاں (لینڈ مارک) نہیں ہیں۔ آپ گھنے ہوئے پیڑوں اور گاڑھے اندھیرے میں راستہ بھٹک سکتے ہیں۔ یہی بات ریگستان یا کھلے سمندر کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے، جہاں ریت کے ہر تودے، ہر پہاڑی کے پیچھے سے ویسا ہی ایک اور تودہ، ایک اور پہاڑی نکلتی ہے، ہر لہر کے بعد بالکل ویسی ہی دوسری لہر سامنے آتی ہے۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے جب میں نے پہلی بار تجربہ کیا تھا کہ ادب کیا کچھ ہو سکتا ہے — جیک لنڈن کی The Call of the Wild میں جہاں ایک کردار برف میں بھٹک جاتا ہے، وہ محسوس کرتا ہے

کہ ٹھنڈ اس کے اندر تک گھسی جا رہی ہے اور بھیڑیے اس کے گرد اپنا گھیرا تنگ کرتے جا رہے ہیں۔ وہ اپنے ہاتھ کو دیکھتا ہے جو بالکل سُن ہو چکا ہے اور ایک کے بعد ایک وہ اپنی ہر انگلی کو حرکت دینے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک بچے کے طور پر مجھے یہ دریافت کچھ جادوئی سی لگی تھی۔ اسے خود آگہی کہتے تھے۔

بڑے ہونے پر اپنی زندگی کے ایک عظیم ادبی جذبے کو سمجھنے کے لیے میں جنگل کا احسان مند ہوں۔ یہ قریب تیس برس پہلے کی بات ہے، وسطی امریکہ کے ایک مقام پر جسے وقفۂ داریان (Darién Gap) کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ اس جگہ ہے (اور مجھے یقین ہے کہ اب تک ایسا ہی ہوگا) جہاں اُن دنوں پین امریکن ہائی وے میں، جو دو امریکاؤں کو الاسکا سے لے کر Tierra del Fuego کے سرے تک، جوڑنے کی غرض سے بنایا گیا تھا، ایک خالی ٹکڑا پڑتا تھا۔ پاناما کے اس خاکنائے میں برساتی جنگل بے حد گھنا ہے، اور وہاں سفر کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے: چپٹے پیندے والی چھوٹی ناؤ (pirogue) میں دریا کے بہاؤ کی مخالف سمت میں حرکت کرنا۔ اس جنگل میں ایک مقامی آبادی رہتی ہے جو دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہے، ایمبیرا (Emberá) اور وُوتان (Wounaans) ان دونوں کا تعلق زبانوں کے Ge-Pano-Carib قبیلے سے ہے۔ میں وہاں اتفاق سے پہنچ گیا تھا اور ان لوگوں سے اتنا مسحور ہوا تھا کہ میں نے وہاں تقریباً تین برس کے عرصے میں کئی بار خاصی دیر دیر تک قیام کیا۔ اس پوری مدت کے دوران میں بغیر کسی مقصد کے ایک گھر سے دوسرے گھر جانے کے سوا— اُن دنوں یہ آبادی گاؤں میں رہنے سے انکاری تھی— کچھ نہ کرتا اور ایک ایسے ماحول کے زیر و بم کے ساتھ جینا سیکھتا جو اس سب سے بالکل مختلف تھا جو اُس وقت تک میں نے سیکھا تھا۔ تمام اصلی جنگلوں کی طرح یہ جنگل بھی خاص طور پر نامہربان تھا۔ مجھے تمام امکانی خطروں اور زندہ بچ نکلنے کے بھی ذرائع کی ایک پوری فہرست بنانا پڑی تھی۔ میں یہ کہوں گا کہ ایمبیرا باشندے میرے ساتھ مجموعی طور پر بڑے صبر سے پیش آتے تھے۔ وہ میرے بے تکے پن سے محظوظ ہوتے، اور مجھے لگتا ہے کہ انھوں نے اپنی دانائی میں مجھے جس طرح شریک کیا تھا اس کا میں نے ان کو تفریح فراہم کر کے ایک حد تک بدلہ چکا دیا۔ میں نے وہاں کچھ خاص نہیں لکھا۔ برساتی جنگل لکھنے کے لیے مناسب ترین جگہ نہیں ہے۔ وہاں ہوا کی نمی سے کاغذ پسیج جاتے ہیں اور گرمی سے بال پوائنٹ سوکھ جاتے ہیں۔ بجلی کے بغیر چلنے والی چیزیں بھی زیادہ دن تک نہیں چلتیں۔ میں تو وہاں اس یقین کے

ساتھ پہنچا تھا کہ لکھنے کی نعمت مجھے میسر رہے گی، اور میں وہاں اپنے تمام وجودی مسائل کو حل کرنے کے لیے لکھنے کے عمل سے ہمیشہ مدد لے سکوں گا۔ یہ ایک طرح کی آڑ ہو گی، ایک قسم کی خیالی کھڑکی جسے طوفان سے بچنے کے لیے میں بند کر سکوں گا۔

جب میں ابتدائی اشتمالیت کے اس نظام سے مانوس ہو گیا جو امریکی انڈینوں کے یہاں رائج ہے، اور اسی طرح ان کی اقتدار سے نفرت اور فطری انتشار کی جانب ان کے میلان سے بھی، تو مجھے محسوس ہونے لگا کہ جنگل میں آرٹ کا، انفرادی اظہار کی ہیئت کے طور پر، کوئی کردار نہیں ہے۔ علاوہ ازیں، ان لوگوں کے پاس ایسا کچھ بھی نہیں ہے جو اُس شے سے مماثل ہو جو ہمارے صارفانہ معاشرے میں آرٹ کہلاتا ہے۔ تصویروں کو دیواروں پر ٹانگنے کے بجائے وہ مرد اور عورتیں اپنے بدن رنگ لیتے تھے، اور عمومی طور پر کسی پائیدار چیز کی تخلیق سے بیزار تھے۔ اور تب مجھے ان کے اساطیر تک رسائی حاصل ہوئی۔ لکھی ہوئی کتابوں والی اپنی دنیا میں جب ہم اساطیر کی بات کرتے ہیں تو وہ ہمیں کوئی ایسی شے معلوم ہوتی ہیں جو تاریخ میں یا جغرافیے میں کہیں بہت دور واقع ہو۔ میں بھی اس فاصلے کے وجود کا قائل تھا۔ لیکن اب اچانک میں، قریب قریب ہر رات، باقاعدگی سے انھیں سننے لگا۔ لوگ اپنے مکان کے فرش پر تین پتھروں سے گھیر کر جو آگ جلا لیتے تھے اس کے پاس بیٹھ کر، ناچتے ہوئے مچھروں اور بھنگوں کے درمیان، قصہ گو مرد یا عورت کی آواز قصوں، روایتوں، کہانیوں کو یوں متحرک کر دیتی جیسے وہ روزمرہ پیش آنے والی حقیقت بیان کر رہے ہوں۔ قصہ گو بین آواز میں گاتا تھا، اپنے سینے کو کوٹتا تھا، اس کا چہرہ کرداروں کے ہر تاثر اور جذبے اور خوف کی ترجمانی کرتا تھا۔ یہ اساطیری کہانی کے بجائے کسی ناول کا ٹکڑا بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن پھر ایک رات ایک جوان قصہ گو عورت آئی۔ اس کا نام الویرا تھا۔ وہ اپنی قصہ گوئی کی بے پناہ صلاحیت کے لیے ایمیرا کے پورے جنگل میں مشہور تھی۔ وہ ایک مہم جو تھی اور کسی مرد یا بچوں کے بغیر رہتی تھی — لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ کچھ کچھ شرابی، کچھ کچھ حرافہ قسم کی عورت ہے، لیکن میں اس پر ایک لمحے کے لیے بھی یقین نہیں کرتا ہوں — اور کھانے یا شراب کی بوتل یا چند سکوں کے عوض وہ گھر گھر جا کر گا کر سناتی تھی۔ ہر چند کہ میں اس کی کہانیوں کو بغیر ترجمے کے سمجھ نہیں پاتا تھا — ایمیرا زبان کی ادبی شکل روزمرہ کی زبان سے بہت زیادہ پیچیدہ ہے — میں جلد ہی جان گیا کہ وہ ایک بڑی فنکار ہے، اس اصطلاح کے بہترین معنوں میں۔ اس کی آواز کی کیفیت، سینے

Scanned with CamScanner

پر، گردن میں جھولتے سکّوں کے بھاری ہار پر ہاتھ مارنے کی تھپتھپاہٹ کا آہنگ، اور سب سے بڑھ کر ایک انتہائی محویت کا تاثر جو اس کے چہرے کو روشن اور نگاہ کو منور کیے رہتا تھا، ایک طرح کی بجھی تلی، خوش آہنگ وجد کی کیفیت جو وہاں موجود لوگوں کو اپنی قوت کے اثر میں لے لیتی تھی۔ اس کی اساطیری کہانیوں کی ساخت بڑی سیدھی سادی سی ہوتی تھی — تمباکو کی ایجاد، جڑواں بچوں کا پہلا قدیمی جوڑا، وقت کی ابتدا کے خداؤں اور انسانوں کی کہانیاں — ان میں وہ اپنی خود کی کہانی جوڑ دیتی تھی، اپنی آوارہ گردی کی زندگی، اپنی محبتیں، بے وفائیاں اور تکلیفیں، جسمانی عشق کی شدید مسرت، حسد کا ڈنک، بوڑھے ہونے کا، مرنے کا خوف وہ بیک وقت متحرک شاعری، قدیم ڈراما، اور آج کے دور کی نئی سے نئی ناول بھی تھی۔ آگ اور تشدد سے منسلک وہ تمام چیزیں جنھیں وہ جنگل کے گاڑھے اندھیرے میں، چاروں طرف بھنبھناتے ہوئے کیڑوں اور مینڈکوں اور چمگادڑوں کے بیچ میں بیٹھی، ایجاد کیا کرتی تھی، سب اس کے وجود میں شامل تھیں، ایک ایسی سنسناہٹ جسے سوائے حسن کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ اپنے نغموں میں فطرت کی اصل قوت کو اٹھائے پھرتی تھی، اور یہی یقینی طور پر سب سے بڑا پیراڈاکس تھا کہ یہ الگ تھلگ مقام، یہ جنگل، ادب کی نفاست سے اتنی دور جتنا تصور کیا جا سکتا ہے، یہی وہ جگہ تھی جہاں فن کو اپنا سب سے قوی، سب سے مستند اظہار ملا تھا۔

پھر میں اس خطّے سے چلا آیا، اور الویرا کو، یا داریان کے جنگل میں رہنے والے کسی بھی قصہ گو کو، میں نے دوبارہ کبھی نہیں دیکھا۔ مگر میں وہاں سے اپنے ساتھ جو کچھ لایا وہ نوسٹلجیا سے کہیں زیادہ تھا — یہ یقین کہ ادب موجود رہ سکتا ہے، خواہ وہ رسمیات اور مفاہمتوں کے ہاتھوں کتنا ہی گھس چکا ہو، خواہ ادیب دنیا کو بدلنے میں ناکام رہ جائیں۔ کوئی عظیم اور طاقتور چیز، جو ان سے ماورا ہے، جو بعض اوقات ان میں جان ڈالنے اور ان کی قلب ماہیت کرنے، اور فطرت کے ساتھ مطابقت کے احساس کو بحال کرنے کا امکان رکھتی ہے، کوئی ایسی چیز جو نئی ہونے کے ساتھ ساتھ بہت قدیم بھی ہے، ہوا کی طرح ناقابلِ حس، بادلوں کی طرح نہایت لطیف، سمندر کی طرح لامحدود۔ مثال کے طور پر یہ کچھ ایسی چیز ہے جو جلال الدین رومی کی شاعری میں، یا ایمانوئیل سویڈن بورگ (Emanuel Swedenborg) کے پُرتخیل آرکیٹکچر میں دھڑکتی ہے۔ نوعِ انسانی کے خوبصورت ترین متن

پڑھتے وقت جولرزہ محسوس ہوتا ہے، جیسے ریڈ انڈین سردار (Chief Stealth) کی تقریر، جو اس نے انیسویں صدی کے وسط میں اپنی زمین حوالے کرنے کے موقعے پر امریکی صدر سے مخاطب ہو کر کی تھی: "پھر بھی ہم بھائی ہو سکتے ہیں. . . "

ایسی سادگی اور سچائی جو صرف زبان میں موجود ہو سکتی ہے۔ ایک منتر، کبھی کبھی ایک الجھاوا، ہیجانی رقص، یا خاموشی کے طویل وقفے۔ تمسخر کی زبان، فحائیہ کلمات کی، بددعاؤں کی، اور اس کے فوراً بعد، بہشت کی زبان۔

میں اسی کو، الویرا کو یہ نذرانہ پیش کرتا ہوں — اور سویڈش اکیڈمی مجھے جو اعزاز دے رہی ہے وہ میں اسی کو معنون کرتا ہوں۔ اس کو اور ان سب ادیبوں کو جن کے ساتھ — یا کبھی کبھی جن کے خلاف — میں جیا ہوں، افریقیوں میں: وولے سوینکا (Wole Soyinka)، چینوا اچیبے (Chinua Achebe)، احمدو کوروما (Ahmadou Kourouma)، مونگو بیتی (Mongo Beti) کو، ایلن پیٹن (Alan Paton) کو اس کی کتاب *Cry the Beloved Country* کے لیے، ٹامس موفولو (Thomas Mofolo) کو *Chaka* کے لیے۔ موریشس کے عظیم ادیب مالکم دی شازال (Malcolm de Chazal) کو جس نے دوسری چیزوں کے علاوہ *Judas* لکھی۔ موریشس کے ہی ہندی ناول نگار ابھیمنیو اننت (Abhimanyu Unnuth) کو اس کے ناول لال پسینہ کے لیے، اردو ناول نگار قرۃ العین حیدر کو اس کے رزمیہ ناول آگ کا دریا کے لیے۔ جزیرۂ ری یونین کے سرکش مصنف دانیال وارو (Danyèl Waro) کو اس کے مالویا (maloya) نغموں کے لیے۔ کنک (Kanak) برادری کی شاعرہ دیوے گورودے (Déwé Gorodey) کو جس نے قید میں ڈالے جانے کے باوجود نوآبادیاتی طاقتوں کو چیلنج کیا، باغی عبدالرحمٰن وابیری (Abdourahman Waberi) کو۔ خوان رلفو (Juan Rulfo) اور اس کے ناول *Pedro Paramo* اور اس کے افسانوں کے مجموعے *El llano en llamas* کو، اور وہیں میکسیکو کی اس نے جو سادہ اور المناک تصویریں کھینچیں ان کو۔ جان ریڈ (John Reed) کو *Insurgent Mexico* کے لیے: ژاں میئر (Jean Meyer) کو جو اورلیو آسیویدو (Aurelio Acevedo) اور وسطی میکسیکو کے کرسٹیرو باغیوں کا

Scanned with CamScanner

ترجمان تھا۔ *Pueblo en vilo* کے مصنف لوئس گونزالیز (Luis González) کو۔ جان نکلز (John Nichols) کو جس نے *The Milagro Beanfield War* کے السناک خطے کے بارے میں لکھا؛ ہنری روتھ (Henry Roth) کو، جو البوکرک، نیو میکسیکو، میں واقع نیو یارک اسٹریٹ پر میرا پڑوسی ہے، اس کی کتاب *Call it Sleep* کے لیے۔ ژاں پال سارتر کو اس کے ڈرامے *Morts sans sépulture* میں پنہاں آنسوؤں کے لیے۔ شاعر ولفریڈ اوون (Wilfred Owen) کو، جس کی وفات 1914 میں مارن (Marne) کے ساحل پر ہوئی۔ جے ڈی سیلنجر (J.D. Salinger) کو، کیونکہ وہ ہمیں ہولڈن کالفیلڈ نام کے چودہ سالہ لڑکے کی زندگی کو محسوس کرانے میں کامیاب ہوا۔ امریکہ کی اوّلین قوموں کے ادیبوں شرمن الیکسی (Sherman Alexi the Sioux)، اسکاٹ موماڈے (Scott Momaday the Navajo) کو *The Names* کے لیے۔ مسکن، کیوبیک، کی انو (Innu) شاعرہ ریٹا میسٹوکوشو (Rita Mestokosho) کو، جو درختوں اور جانوروں کو اپنی آواز مستعار دیتی ہے۔ حوسے ماریا ارگویداس (José Maria Arguedas)، اوکتاویو پاز (Octavio Paz) اور میگوئل انخل آستوریاس (Mibuel Angel Asturias) کو۔ اوالاتا (Oualata) اور چنگوتی (Chinguetti) کے نخلستانوں کے شاعروں کو۔ الفونس آلیس (Alphonse Allais) اور ریموں کینو (Raymond Queneau) کو ان کی عظیم تخیل سازی کے لیے۔ ژورژ پیریک (Georges Perec) کو *Quel petit vélo à guidon chromé au fond de la cour?* کے لیے۔ ویسٹ انڈیز کے ادیبوں ایدورد گلیساں (Edouard Glissant) اور پیٹرک شاموازو (Patrick Chamoiseau) کو، ہائیتی کے رینے دیپیستر (René Depestre) کو، آندرے شوارتز بارت (André Schwartz-Bart) کو اس کی کتاب *Le Dernier des justes* کے لیے۔ میکسیکو کے شاعر ہومیرو آرِجس (Homero Aridjis) کو جس نے ہمیں چمڑے کی پیٹھ والے کچھوے کی زندگی کے متعلق تصور کرنے کی ترغیب دی اور جس نے ان دریاؤں کا نقشہ کھینچا جن کا رنگ اس کے گاؤں Contepec کی گلیوں کے پاس سے گزرتے ہوئے مونارک تتلیوں کے باعث نارنجی ہو جاتا ہے۔ وینس خوری غادہ

Scanned with CamScanner

(Vénus Koury Ghata) کو جس نے لبنان کو یوں پیش کیا جیسے کوئی کسی السناک، ناقابل شکست عاشق کو پیش کرتا ہے۔ خلیل جبران کو۔ راں بو کو۔ ایمیل نیلیگن (Emile Nelligan) کو۔ ریژاں ڈشارم (Réjean Ducharme) کو، زندگی کے لیے۔

اور اُس اجنبی بچے کو، جس سے ایک دن داریان کے جنگل میں دریائے تویرا (Tuira) کے کنارے میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ رات کے وقت ایک دکان میں مٹی کے تیل سے چلنے والے لیمپ کی روشنی میں، آگے کی طرف جھکا ہوا، اپنے چاروں طرف کی تمام چیزوں سے بے خبر، بے چینی اور شور اور وہاں کی پر تشدد، درشت زندگی کی ابتری سے غافل، فرش پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا ہے اور کچھ لکھ رہا ہے۔ دکان کے فرش پر پالتھی مارے، جنگل کے بیچوں بیچ، لیمپ کی روشنی میں اکیلا بیٹھ کر پڑھنے والا وہ بچہ وہاں محض اتفاق سے موجود نہیں ہے۔ وہ اُس دوسرے بچے کا بھائی سا لگتا ہے جس کا ذکر میں نے ان صفحوں کے شروع میں کیا تھا؛ وہ بچہ جو جنگ ختم ہونے کے فوری بعد کے تاریک سالوں میں، بڑھئی کی پنسل سے راشن کارڈ کی پشت پر لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ بچہ ہمیں انسانی تاریخ کے دو بہت ہی اہم کاموں کی یاد دلاتا ہے: افسوس ان کاموں کو مکمل کرنے سے ہم ابھی بہت دور ہیں۔ یہ دو کام ہیں بھوک کا خاتمہ، اور جہالت کو دور کرنا۔

اس ادیب کے، جو اس بنا پر غیر مطمئن ہے کہ بھوکوں سے — غذا کے اور علم کے بھوکوں سے — رابطہ کرنے سے قاصر ہے، بنیادی پیراڈاکس کے بارے میں اسٹگ ڈیگرمان کا مقولہ، اپنی تمام قنوطیت کے باوجود، سب سے بڑی سچائی کو چھوتا ہے۔ خواندگی کا، بھوک کے خلاف جدوجہد سے رشتہ ہے، یہ دونوں ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک دوسرے کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہ دونوں ہمیں عمل کرنے کے لیے اکساتی بلکہ مطالبہ کرتی ہیں۔ تاکہ اس تیسری ہزاری (millenium) میں، جو بس ابھی شروع ہی ہوئی ہے، ہماری ساجھی دنیا کا کوئی بھی بچہ، کسی مخصوص جنس یا زبان یا مذہب سے تعلق رکھنے کی بنا پر، بھوک یا بے توجہی کے حوالے نہ کیا جائے، ضیافت سے باہر نہ نکالا جائے۔ ہماری نوعِ انسانی کا مستقبل بچے کے ہاتھ میں ہے۔ جیسا کہ بہت پہلے یونانی فلسفی ہیراقلیطس (Heraclitus) نے کہا تھا، بادشاہت بچے کے لیے ہے۔

❀❀

آج کے شمارہ 63 میں خالد طور کا ناول کاسنی مکاح اور ان کی کہانی ''سائیں موسم'' شائع کی گئی تھی۔ ان دونوں تحریروں کے تعارف میں کہا گیا تھا کہ مصنف کے ذاتی حالات معلوم نہیں ہو سکے اور نہ ان کی کسی اور تحریر کا سراغ لگ سکا۔ اس شمارے کی اشاعت کے بعد خوش قسمتی سے خالد طور سے رابطہ قائم ہوا اور یہ اطلاع بھی ملی کہ انھوں نے ان دو تحریروں کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک کہانی آئندہ صفحات میں پیش کی جا رہی ہے۔ ان کا ایک ناول موجی آنے والے شماروں میں سے ایک میں شائع کیا جائے گا۔

Scanned with CamScanner

خالد طور

ڈھانچہ

آدھی رات کو میں بستی سے بھاگی۔ بیابان میں چلتے چلتے صبح ہو گئی۔ اداسی، نیند تھکن کا احساس، سب کچھ تھا لیکن قدم اٹھ رہے تھے۔ چاشت کی دھوپ ہر سمت پھیلی تو تمازت کا احساس بھی پھیلا۔ اب مجھے چھاؤں کی تلاش تھی۔ کوئی ننھی منی چھاؤں جو میرے بدن کو جھلستی دھوپ سے پناہ دے سکے۔ دور ایک ببول کا پیڑ نظر آیا میں اسی کی سمت چل دی۔

ببول کی چھاؤں دیکھ کر میں ٹھٹکی۔ پتوں سے چھن چھن کر آنے والی کرنوں کے دائروں میں ایک انسانی ڈھانچہ نظر آیا۔ بوسیدہ ہڈیوں پر کہیں سفید اور کہیں خیالی تہیں نمایاں تھیں۔ میں اس خیال سے پریشان تھی کہ مجھے دوپہر اس ڈھانچے کے ساتھ گزارنا ہوگی۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور ڈھانچے کی ہڈیوں سے اس طرح گزرا کہ وہ سنسنا گئیں۔ سنسناہٹ سے ایک آواز ابھری:

''اے خوبصورت لڑکی!''

ڈھانچے سے نکلتی ہوئی مردانہ آواز سن کر میں کانپ گئی۔

''تو کہ تیرے حسن کو آرائش کی حاجت نہیں، تو کہ تیری آنکھیں خود ایک خنک سایہ ہیں، تو کہ تیری زلفیں سرمئی بدلیاں ہیں، تو اس ویرانے میں کیوں آ نکلی؟''

ڈھانچے کی اس تعریف پر مجھے دکھ ہوا۔

''آدمیوں کی بستی...'' میں نے کہا، ''آدمیوں کی بستی میں بہت سے نوجوان ہیں جو دن رات اس سے کہیں زیادہ میری تعریفیں کیا کرتے تھے۔ لیکن ان کی آنکھوں میں نہ ختم ہونے والی،

ہولناک وحشت سے اکتا کر، پریشان ہو کر میں ویرانے میں بھاگ آئی ہوں۔ اور یہاں تو ایک ڈھانچہ بھی وہی باتیں دہرا رہا ہے... کیا ان ہڈیوں میں ابھی اس خمیر کا اثر باقی ہے جس نے زندہ جسموں کو، نہ ختم ہونے والی خواہش حاصل کا ایسا بنا کر، بھیانک اور تاریک موت سے ہمکنار کر دیا ہے؟"

ڈھانچے میں کڑکڑاہٹ سی ہوئی۔

"اے خوبصورت لڑکی، تو نے کس قدر سچی بات کی ہے۔ ہاں، ان ہڈیوں میں، میرے اس ڈھانچے میں اس خمیر کا اثر باقی ہے۔ لیکن مخمبر، میں نے اسی چنگی بھر ہوس کے غم کو ختم کرنے کی جدوجہد میں، اسے مٹانے کی آرزو ہی میں اس جگہ دم توڑا تھا۔ کیا تو میری کہانی سنے گی؟"

ہوا کے جھونکے سے ڈھانچے میں پھر سنسناہٹ ہوئی۔

"کیا تو میری کہانی سنے گی؟ دھوپ بہت تیز ہے۔ یہ میرے ننھے ننھے دوست ببول کے یہ چھوٹے چھوٹے پتے، سہ پہر تک مجھے دھوپ سے بچائیں گے۔ تو اس بڑھتی ہوئی دھوپ میں کہاں جائے گی، دھوپ ڈھل جائے تو میں تجھے نہیں روکوں گا، چلی جانا، لیکن دھوپ ڈھل جانے دے۔ فکر نہ کر، اب مجھے تیری موجودگی میں کوئی ایسا احساس نہیں ہوگا جس سے تیرے تقدس پر زد پڑے۔ کیا تو میری کہانی سنے گی؟"

ڈھانچے کی اس بات پر مجھے دکھ ہوا۔ میں نے غور سے ہڈیوں کو دیکھا۔ کھوپڑی میں آنکھوں کی جگہ سوراخ، چمکتی ہوئی دوپہر کی روشنی میں بھی تاریک تاریک سے تھے۔

"مجھے اس لفظ تقدس سے چڑ ہے،" میں نے کہا۔ "اس کا خیال آتے ہی اس کا الٹ پہلو، تاریک پہلو سامنے آ جاتا ہے، اپنا تلخ احساس دلاتا ہے۔ تاریکی اگر روشنی کا احساس ابھارتی ہے تو روشنی بھی تاریکی کا احساس دلاتی ہے، نیکی کا خیال آتے ہی بدی کا خیال بھی ابھرتا ہے، ظلم کا خیال رحم کے خیال کو ضرور لاتا ہے، محبت کے ساتھ نفرت کا احساس ضرور ابھرتا ہے؛ کیونکہ نیکی نہ ہو تو بدی کو کوئی نہ پہچانے، نفرت نہ ہو تو محبت کو کوئی نہ جانے۔ مجھے تقدس سے چڑ ہے کیونکہ اس کا خیال مجھے گناہ کا چہرہ دکھاتا ہے اور مجھے لفظ گناہ سے کراہت محسوس ہوتی ہے۔"

ڈھانچے میں پھر سنسناہٹ ہوئی۔

"اے خوبصورت لڑکی، اے حسین دوشیزہ، تیری باتوں میں بہت گہرائی اور وسعت ہے۔ میرے ڈھانچے کو دیکھ، کبھی ان ہڈیوں پر بہت سا گوشت تھا، بہت سے عضلات تھے، چربی تھی، شریانیں تھیں، رگیں تھیں، خون تھا، زندگی متحرک تھی، لیکن اب میری چربی اور خون گہرائیوں میں رس کر کہیں پاتال میں پہنچ چکا ہے۔ میری شریانوں اور رگوں کو حشرات الارض چاٹ گئے، عضلات اور گوشت جنگلی درندے اور گدھ کھا گئے، شاید انھیں وسعت مل گئی ہوگی۔ میں سخت ہڈیاں لیے کتنی ہی مدت سے یہاں پڑا ہوں۔"

ڈھانچے کی ہڈیوں میں پھر سنسناہٹ ہوئی۔

"میں بہت دور آدمیوں کی ایک بستی میں رہتا تھا۔ وہ بستی میرے آباواجداد نے تعمیر کی تھی۔ مخالف بستیوں والے حملہ آوروں کا وہ ڈٹ کر مقابلہ کرتے تھے اور اپنی بستی کو بچائے رکھتے تھے۔ میں جب کچھ بڑا ہوا تو میں نے بھی گردوپیش کا گہری نظر سے مشاہدہ کیا۔ میں نے بھی کئی بار سوچا تھا کہ ہوس کی بنیاد کیا ہے۔ اکثر سوچتا تھا کہ مخالف بستیوں والے ہماری بستی پر کیوں حملہ کرتے ہیں۔ ایک بار ایک مرے ہوئے جانور پر گدھوں کو لڑتے دیکھ کر میں نے سوچا کہ حملہ آور یقیناً بھوکے لوگ ہوں گے۔ اگر انھیں خوراک دے دی جائے تو کبھی لڑنے مرنے پر تیار نہیں ہوں گے، لیکن ایک بار ایک کتیا کی خاطر چند کتوں کو لہولہان ہوتے دیکھ کر مجھے اس اجنبی بھوک کا احساس ہوا جو کبھی کبھی مجھے بھی مخالف جنس کو دیکھ کر ہیجان میں مبتلا کر دیتی تھی۔ میں نے سوچا کہ شاید یہ اجنبی بھوک حملہ آور کو حملہ کرنے پر اکساتی ہوگی۔ لیکن کیا... کیا میں اپنی ماؤں بہنوں کو حملہ آوروں کے حوالے کر دوں کہ اپنی بھوک مٹالیں؟ کیا یہ ممکن ہے؟

"غیرت ایک زہریلا پودا ہے جسے غصہ اور انتقام ریشگی دیتے ہیں، لیکن اس کی آڑ میں، چھپ کر، توہین کرنے والوں کو اس سے ٹکرا کر مرتے دیکھ کر عجیب خوشی اور تسکین محسوس ہوتی ہے۔ یہ زہریلا پودا نجات دہندہ بن جاتا ہے جو ناقابل برداشت روحانی کرب اور جلن سے بچالیتا ہے۔ کیا میں غیرت کے اس زہر سے نفرت کروں، کیا یہ ممکن ہے؟ اس زہریلے پودے کی جڑیں پاتال میں ہوتی ہیں اور بہت سے پودوں کی جڑیں ایک دوسرے کو کاٹتی رہتی ہیں۔ ایک غیرت دوسری کا خون کرتی ہے اور پھلتی پھولتی ہے۔ یہ بے مروتی، کینہ پروری، گہرائی میں خوب ریشگی پاتی ہے۔ غیرت

پاتال کی طرح بے مروت ہوتی ہے، کیا میں اس بے مروت سے نفرت کروں، کیا یہ ممکن ہے؟ میں کوئی فیصلہ نہ کر پاتا۔

جوانی تک کئی بار ایسا ہوا کہ دوسری بستیوں والوں نے ہماری بستی پر حملے کیے۔ ہر بار ہماری بستی والوں نے انھیں پسپا کر دیا۔ ہر بار جنگ کے بعد مقامِ تصادم پر لاشیں بکھری ہوتی تھیں۔ خون سے لت پت لاشیں دیکھ کر مجھے وحشت ہوتی تھی۔ میں کسی جنگ میں شریک نہ ہوا۔ بڑے بوڑھے مجھ سے ناراض رہتے تھے۔ نوجوان بزدلی کا طعنہ دیتے تھے؛ کہتے تھے کہ کلائیوں میں چوڑیاں پہن لو۔ بستی کی لڑکیاں مجھے بھیڑ کا میمنہ کہتی تھیں۔ میں نے اپنے لیے جو کام منتخب کیا وہ گلہ بانی تھا۔ میں گڈریا تھا۔ صبح سے شام تک میں سرسبز چراگاہوں میں اپنا ریوڑ لیے گھومتا رہتا تھا۔ مجھے اکثر اپنے تنہا ہونے کا احساس ہوتا تھا اور جب میں ریوڑ میں بھیڑوں کو ایک دوسرے سے جسم ملائے، گھاس پر منھ مارتے دیکھتا تھا تو مجھے ان کی یکسانیت کا بھرپور احساس ہوتا تھا۔ یہ اجتماعی شعور مجھے ایک اجتماعی انسانی برادری کے خواب دکھایا کرتا تھا۔

"ایک بار ایک جنگ میں آقا اور غلام دونوں مارے گئے۔ بستی والوں کی عادت تھی کہ جنگ میں کام آنے والوں کا بہت احترام کیا جاتا تھا۔ ان کی لاشوں پر پھول چڑھائے جاتے تھے اور بڑی دھوم دھام سے انھیں کندھوں پر اٹھا کر بستی میں لایا جاتا تھا۔ کئی گھروں سے عورتوں کا واویلا اور بین بھی سنائی دیتے تھے لیکن جب فتح کا جشن منایا جاتا تھا تو یہ واویلا اور بین اس مکڑی کی آواز کی طرح دب جایا کرتا تھا جو طوفانی رات میں نوحے بھر رہی ہو۔ مجھے غم اور خوشی کا یہ دوراہا بے حد سفاک نظر آتا تھا۔ مرنے والوں میں ایک آقا اور اس کا غلام دونوں شامل تھے۔ زندگی بھر غلام نے اپنے آقا کے پاؤں دابے تھے، اس کا ہر ظلم سہا تھا۔ مرنے کے بعد اسے آقا کے پہلو میں لٹایا گیا اور دونوں لاشوں پر پھول چڑھائے گئے — یکساں احترام کیا گیا۔

"مجھے موت بے حد پُرشوکت اور زندگی بے حد حقیر نظر آئی۔ میں بستی سے باہر بھاگا، جیسے میرے کندھوں پر شدید دکھ کا کوئی ایسا بوجھ تھا جسے میں اتارنے کی کوشش بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کبھی کبھی بستی والے کسی معاملے پر آپس میں بھی الجھ پڑتے تھے اور فیصلہ کسی لاش کے زمین پر تڑپنے سے ہوا کرتا تھا۔ مجھے بستی کی زندگی سے کراہت محسوس ہوتی تھی۔ میرے ہم عمر نوجوان مجھے زندگی سے عاری

کہا کرتے تھے۔ مجھے تنہائی کی عادت تھی لیکن میں اپنی تنہائی میں ایک اجتماعی شعور سے آشنا ہوتا جا رہا تھا جو غالباً عظیم تھا، پر شوکت تھا۔ مجھے فطرت سے بہت لگاؤ تھا، حسن فطرت کی کشش لافانی تھی۔ مجھے درختوں سے، لمبی لمبی گھاس کے قطعوں، پھولوں، بیلوں، تتلیوں، اور پرندوں سے بہت محبت تھی۔ مجھے ایک حسن، ایک لازوال حسن اپنی جانب یوں کھینچتا تھا، جیسے اس کی کشش ایک ڈور سے بندھ کر میرے دل کے کسی اندرونی گوشے میں، میری روح سے پیوستہ تھی۔"

ڈھانچے میں پھر سنسناہٹ نمودار ہوئی۔

"تو بہت حسین دوشیزہ ہے، معصوم، بھولی بھالی، حسن فطرت کا سچا روپ۔ تیری یہ سوچ میں ڈوبی ہوئی آنکھیں، یہ مسکراتی ہوئی آنکھیں اور یہ تیری لمبی زلفیں حسن فطرت کا پرتو ہیں۔ مجھے بھی کسی ایسے مجسم حسن کی تلاش تھی۔ میں ستائش کرنا چاہتا تھا۔ میرا عشق عبودیت کی حد تک جا پہنچا تو مجھے عبودیت سے اکتاہٹ محسوس ہونے لگی کیونکہ مجھے اس مقام پر حد کا احساس ہونے لگا تھا اور میں محدود نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میں عبودیت کا منکر ہو گیا۔ بستی میں ایک معبد بھی تھا، جس کے ساتھ طلائی شمع دانوں میں سات چراغ جلتے رہتے تھے۔ سامنے قربان گاہ تھی جہاں سو ننھی قربانیاں دی جاتی تھیں۔ معبد میں کسی متضاد صفات والی قوت کی پرستش کی جاتی تھی جو رحیم بھی تھی جابر بھی، کریم بھی تھی قاہر بھی، جس کا پرتو بستی کے ہر آدمی پر تھا؛ بستی کا ہر آدمی رحیم بھی تھا جابر بھی، کریم بھی تھا قاہر بھی — میں یہ سوچتا رہتا تھا کہ خالق اور مخلوق میں فرق تبھی نمایاں ہو سکتا ہے کہ خالق کی صفات مخلوق سے بلند ہوں اور ان میں اعلیٰ و ارفع ہونے کا احساس بھی فروزاں رہے؛ خالق اور مخلوق میں یکسانیت نہ ہو۔ بڑے بوڑھوں کا عقیدہ تھا کہ ان کی معبود قوت نے انھیں اپنی مثال پر بنایا ہے۔ میں اس مفروضے سے منکر تھا۔ معبد میں عجیب پراسرار اور گھناؤنی رسوم بھی ادا کی جاتی تھیں۔ مجھے ان سے وحشت ہوتی تھی۔ میں ایک روح فطرت سے وابستہ ہو گیا جو بے نیاز ہے، جسے عبادت کی ضرورت نہیں ہے، جس میں آدمیوں والی کوئی صفت نہیں ہے۔ میں معبد کا رخ نہیں کرتا تھا۔ بڑے بوڑھوں کا عتاب اکثر مجھ پر ٹوٹا کرتا تھا۔

"اچانک حالات بدلے۔ ایک دن مرغزار میں ریوڑ چراتے ہوئے، میرے ہونٹوں پر مرغزار کی تعریف میں کچھ اشعار آئے جنھیں میں خود بخود گنگنانے لگا۔ پہلی بار اپنے شاعر ہونے کا

احساس ہوا۔ یہ احساس غیر معمولی تھا۔ بستی میں جب میں نے اپنے اشعار گا کر سنائے تو کایا پلٹ گئی۔ بڑے بوڑھوں کی آنکھیں چمکیں، نوجوانوں نے مجھے حیرت سے دیکھا، بستی میں دھوم مچ گئی۔ بڑے بوڑھوں نے سر جوڑے، مشورے کیے کہ اب ہماری بستی کی فوقیت دوسری بستیوں پر پہلے سے زیادہ ہو گی؛ لیکن دھیان رہے کہ کہیں یہ بھی دھیمے لہجے اور صلح پسندانہ جذبات اور بزدل خیالات کا رستہ نہ اپنا لے۔ ہماری بستی میں دو ایسے شاعر ہو گزرے تھے جو بہت نامور تھے۔ لیکن پہلے شاعر کو بڑے بوڑھے پسند نہیں کرتے تھے، اس کی اتنی قدر نہیں تھی جتنی بعد میں آنے والے شاعر کی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ پہلا شاعر قومیت کے تصور سے ہٹ گیا تھا، اس نے ایک جداراستہ اپنایا تھا، اس کے اشعار میں محبت اور صلح کل کا پیغام تھا، اس میں دوسرے شاعر کی طرح جوش اور ولولہ نہیں تھا جو بستی کے مذہبی عقائد کی ترجمانی کرتا تھا اور اپنی قوم کو دوسروں سے برتر دکھاتا تھا۔ مجھے طرح طرح کی لالچ دی گئی کہ میں بستی کے عقائد اور مذہبی جذبات کی برتری اشعار میں ثابت کروں۔ بستی کی نوجوان لڑکیوں نے میرے ہاتھ تک چومے۔ مجھے اس سے اور وحشت ہوئی، اور یہی ہوا کہ میں دھیمے دھیمے لہجے میں صلح پسندانہ جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے، پہلے شاعر کا ہم نوا بن گیا جس میں آفاقیت تھی، یک انسانی برادری کے خواب تھے۔ اس پر میں پھر بستی میں نفرت کا شکار ہو گیا، جو پہلے سے کہیں زیادہ تھی۔ میں اپنے جمالیاتی احساس کے ساتھ روح فطرت کی پرستش کرتے ہوئے اُس قوت سے باغی ہو گیا جس کو معبد میں پوجا جاتا تھا۔

"بستی کے لوگ مجھے کابل کہا کرتے تھے کیونکہ میں صبح صبح ان کے ساتھ معبد میں نہیں جاتا تھا۔ مجھے ان پر ہنسی آتی تھی کیونکہ جس روحانی کاہلی اور شعوری سستی کا وہ شکار تھے اس کا انھیں احساس تک نہ ہوتا تھا۔ ان کے نظریات سطحی تھے۔ میرے نزدیک زندہ انسان کا تصور یہ ہے کہ وہ مشکلات سے نبرد آزما رہے۔ کسی ہاتھ میں آئی ہوئی شے کو قبضے میں کرنا سہل ہے، محروم ہونا بہت مشکل۔ مغلوب دشمن کو ہلاک کرنا سہل ہے، معاف کرنا مشکل۔ زخم کھا کر انتقام لینا سہل ہے، زخم لگانے والے کو گلے سے لگانا بہت مشکل۔ حرص، لالچ اور ہوس کو اپنانا آسان ہے اور ان سے گریز پائی دشوار ہوا کرتی ہے۔ فرسودہ عقائد کی غلامی سہل ہے، بغاوت مشکل۔ جھوٹ کا اسیر ہونا آسان ہوتا ہے لیکن سچ کی خاطر آزادیِ فکر کو برقرار رکھنا بہت مشکل ہوا کرتا ہے۔ اور زندہ انسان وہی ہے جو مشکلوں سے

گزرے۔

"ایک بار بستی کے چوراہے پر ایک نوجوان مجھ سے متصادم ہو گیا۔ اس نے مجھے گالیاں دیں۔ سمجھانے پر وہ اور بھڑکا۔ وہ مجھ سے زیادہ طاقتور نہیں تھا۔ اس نے مجھے تھپڑ مارا۔ میں نے دوسرا رخسار اس کے سامنے کر دیا۔ اس درندہ صفت نے گھونسے دے مارے، میرا سر چکرایا اور میں گر گیا۔ میرے منہ سے خون بہنے لگا۔ راہ چلتے بڑے بوڑھوں نے مجھے طنزیہ مسکراہٹ سے دیکھا، نوجوانوں نے مجھ پر تھوکا اور ٹولیاں بنا کر پیچھے ہو لیے۔ "دیوانہ! دیوانہ!" ہر کوئی چلا رہا تھا۔

"میں بستی سے باہر بھاگا، بہت دیر مرغزار میں خاموش بیٹھا رہا۔ میرے دل میں طغیانی سی تھی۔ تمام ذہنی کشمکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگر انفرادی انا کو ختم کر دیا جائے تو انسانی برادری میں اجتماعی شعور پیدا ہو سکتا ہے۔ تمام پستیوں کے پیچھے ایک پستی ہے — انا، انفرادی انا — مجھے انفرادیت ایک لعنت محسوس ہوئی۔ میں نے عمل پر کمر باندھی اور گلیوں میں، بازاروں میں، دوراہوں پر، چوراہوں پر، جمگھٹوں میں انفرادیت کے خلاف اور اجتماعی شعور کے حق میں تقریریں کرنا شروع کر دیں۔ اکثر میری باتوں کو ہنسی میں اڑایا جاتا تھا، لیکن مایوسی کے ساتھ ساتھ امید کا درخشاں چہرہ بھی نظر آیا۔ چند نوجوانوں، جن کے چہروں پر تفکر کی جھلک تھی، میرے ہم خیال بن گئے۔

"بڑے بوڑھوں نے مجھے ایک ایسے عفریت کا نام دیا جو ان کی بستی میں نفاق پھیلانے آیا ہے۔ مجھ پر احتساب دونا کر دیا گیا۔ اب مجھے اتنی اجازت بھی نہ تھی کہ کھل کر اظہار کر سکوں۔ اجتماعی شعور کو بڑے بوڑھے صرف ایک صورت میں قبول کرنے پر تیار تھے کہ وہ ان کے عقائد اور مذہبی جذبات کی ترجمانی کرے۔ میں نے شدید احتجاج کیا۔ عقائد اور مذہبی جذبات کے اندھے چھلاوے اگر ایک بڑا چھلاوہ بن گئے تو انسانی اقدار کا خاتمہ یقینی تھا۔ میں نے بڑے بوڑھوں کی بات نہ مانی۔ میری مخالفت بڑھ گئی، مجھے ختم کرنے کی سازشیں تیار کی جانے لگیں، لیکن میرے ہم خیال نوجوانوں میں بھی اضافہ ہونے لگا۔

"انھی دنوں ہماری بستی پر مخالف بستی والوں نے حملہ کر دیا۔ میں اور میرے ساتھی خون خرابے کے مخالف تھے، ہم نے صلح کی ایسی شرائط طے کیں جو مخالف بستی والوں کے لیے قابل قبول تھیں۔ ہم نے بستی میں اعلان کیا کہ ہم لڑے بھڑے بغیر حملہ آوروں کو واپس بھجوا دیں گے۔ بڑے بوڑھوں نے

Scanned with CamScanner

ہمیں جنونی قرار دیا۔ ہم نے آزمائش کی اجازت طلب کی اور میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ، نیزوں پر سفید چادریں لٹکا کر حملہ آوروں کی طرف بڑھا۔ ہم ابھی ان تک پہنچ بھی نہ پائے تھے کہ ہماری بستی کے نوجوانوں نے بستی کے ایک کونے سے نکل کر حملہ آوروں پر ہلہ بول دیا۔

''صلح کا پہلا قدم اٹھتے ہی امن کا پاؤں کاٹ دیا گیا۔ اس بار بھی ہماری بستی والوں کی جیت ہوئی۔ جب بستی میں فتح کا جشن منایا جا رہا تھا، مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر غداری کا الزام لگایا گیا۔ مختصر سی عدالت میں بڑے بوڑھوں نے ہمیں سزائے موت دی۔ میرے ساتھیوں کے سر میرے سامنے کلہاڑوں سے کاٹے گئے۔ ان کے گھر ضبط کر لیے گئے۔ ان کی عورتیں — لڑکیاں، بہنیں، بھابھیاں — فتح یاب نوجوانوں میں تحفے کے طور پر بانٹی گئیں۔ ان کے خاندانوں کو مٹا دیا گیا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو قتل کر دیا گیا۔ وہ سب نابود ہو گئے۔ یہی کچھ میرے ساتھ بھی ہوا۔

''میرے لیے انوکھی سزائے موت تجویز کی گئی — ایک لاٹھی کے سرے پر سانپ کا پھن بنایا گیا۔ اس میں دانتوں کی جگہ دو سوئیاں لگائی گئیں۔ ان سوئیوں پر دو ایسے زہر لگائے گئے جو ایک دوسرے کی ضد تھے۔ ننھنوں کے ذریعے مجھے زہر کی دھونی دی گئی۔ جب میرا سر چکرا رہا تھا تو میرے سر کے پچھلے حصے پر سانپ کا پھن مارا گیا۔ دونوں سوئیاں میرے سر کے پچھلے حصے میں اتر کر میری کھوپڑی میں دھنس گئیں۔ ایک بوڑھے نے سفاک لہجے میں کہا: 'ان دو سوئیوں پر دو زہر ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک زہر تجھے ہلاک کرنے کی کوشش کرے گا تو دوسرا بچائے گا: دوسرا ہلاک کرنے لگے گا تو پہلا تریاق بن کر تجھے مرنے نہیں دے گا۔ نہ تو جی سکے گا نہ تجھے موت آئے گی، اور جب دونوں زہروں میں اثر ختم ہونے لگے گا تو دونوں تجھے ہلاک کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے، ایک ہو جائیں گے، اور وہ وقت تیری موت کا ہو گا — جا بیابان میں جا، ریت کے نیچے جونی ہے اسے ہونٹوں سے چوس، صحرا کی خاردار جھاڑیوں کے پتے کھا۔ جا! اس سے زیادہ بھیانک موت دی ہی نہیں جا سکتی۔''

''مجھے بیابان کی سمت دھکیل دیا گیا۔ میں بے حد اذیت میں گرفتار تھا، شاید بہت ہی سخت جان تھا، دونوں زہر ایک ہو کر بھی مجھے نہ مار سکے۔ میں چلتا رہا، چلتا رہا... بھوکا پیاسا، زخم خوردہ، چلتا رہا۔ اس مقام پر مجھ میں آگے بڑھنے کی سکت نہ رہی، میں گر گیا۔ موت میرے قریب آئی، اس نے مجھے

چھوا۔ میں نے ہمیشہ انفرادیت کی مخالفت کی تھی، اجتماعی شعور کی حمایت کی تھی، لیکن جب موت نے میرے سینے سے میری سانس کی ڈوری کو کھینچنا شروع کر دیا تو مجھے شدت سے انفرادیت کا احساس ہوا۔ میں تپتی ریت پر تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ میرے بائیں پہلو میں ایک خراش سی نمودار ہوئی اور خون کا ایک قطرہ خاک پر گرا، بہت نیچے اتر گیا اور پھر خاک سے ایک پودے نے جنم لیا اور بڑھتے بڑھتے ببول بن گیا۔ اس کی ٹہنیوں سے جب پتوں کے ساتھ نوکیلے کانٹے بھی نکل آئے تو مجھے اپنا وجود ببول کے مانند محسوس ہوا۔ مجھے اپنی انفرادیت سے نکلتے ہوئے اجتماعی شعور نے اس قدر دھچکا لگایا کہ میری خشک ہڈیاں کانپ گئیں۔"

ڈھانچے میں یوں کھڑکھڑاہٹ ہوئی جیسے ہڈیاں تڑخ رہی ہوں۔

"خود پرست متکبر حسینوں کی خاک سے پھول جنم لیتے ہوں گے لیکن ایک باضمیر انسان کی خاک سے ببول ہی جنم لے سکتا ہے۔ ہاں کبھی کبھی، خزاں کی خنک ہوا سے جب ببول کی ٹہنیوں سے خشک پتے ٹوٹ کر دور تک اڑتے چلے جاتے ہیں، مجھے اپنے چند ساتھی ضرور یاد آتے ہیں جو میری خاطر قربان ہو گئے، جن کے سر کلہاڑوں سے کاٹے گئے۔

"مرنے کے بعد میرا گوشت، چربی، خون — سب کچھ تقسیم ہو گیا۔ میں نے بڑی محبت سے یہ تقسیم ہونے دی۔ مجھے ایک لازوال محبت کا احساس ہوتا رہا۔ پھر چند حقائق ابھرے۔ یہ عجیب زندگی تھی جو مرنے کے بعد مجھے حاصل ہوئی۔

"میں محبت پر یقین رکھتا ہوں، معصومیت کو محبتِ کُل اور روحِ فطرت کا نام دیتا ہوں۔ لیکن میں ان لوگوں میں کیسے رہتا جو برداشت کو عاجزی اور دلداری کو بزدلی کہتے ہیں؟ میں ان چلتے پھرتے پتھروں سے کیسے محبت کروں جو آپس میں ٹکراتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کے درمیان زندگی کا ایک انکہار پس رہا ہے؟ میں ان عقائد کو کیسے اپنا لوں جو خوف اور خود غرضی، دہشت اور حرص کی بنیادوں پر قائم ہیں؟ میں ان عقیدتوں کو کیسے چاہوں جو اندھی ہیں؟ میں ان بڑے بوڑھوں کا احترام کیسے کروں جو اپنے بعد آنے والی نسل کے اندر نفرت کے بیج گراتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح ان کے عقائد اور مذہبی جذبات کی نگہبانی ہو گی؟ میں ان خونی بھیڑیوں سے کیسے محبت کروں جنھوں نے میرے ریوڑ کی بھیڑوں کو چیر پھاڑ کر سیمنوں کا خون چوس لیا؟ میں جھوٹ سے کیسے محبت کروں جس نے سچائی

کے چہرے کو مسخ کر رکھا ہے؟ محبت ایک سچائی ہے لیکن اس میں جھوٹ کی آمیزش سے اس کا چہرہ مسخ ہو جاتا ہے، میں جھوٹ سے محبت کیسے کروں — کیسے کروں؟"

ڈھانچے میں ارتعاش نمودار ہوا۔

"تو حسین ہے، معصوم ہے۔ تیری فطرت کسی معصوم بچے کی مسکراہٹ جیسی ہے۔ لیکن مجھے اس حقیقت کا ادراک ہو رہا ہے کہ جب تجھے جھوٹ اور باطل سے آلودہ کرنے والے ظلم و جبر پر اتر آئے ہوں گے، تو اس بیابان میں بھاگ آئی ہے۔ کیوں درست ہے نا؟"

میں نے غور سے ڈھانچے کو دیکھا۔

"انھوں نے ہر صبح میری آنکھوں کو چڑھتے سورج کی کرنیں، ہر شام گھنے سائے کہا۔ انھوں نے میرے بالوں کو، لانبی زلفوں کو گھٹاؤں سے تشبیہ دی اور جب رات ہونے لگی تو انھوں نے کہا، آ تیری زلفوں میں ستارے بھر دیں۔ وہ چاہتے تھے کہ میرے بال نوچ نوچ کر آپس میں بانٹ لیں، تاکہ میری آنکھوں میں اپنی ہوسناکیوں کو روپوش کر دیں۔"

ڈھانچے میں ارتعاش تیز ہو گیا۔

"اے حسین دوشیزہ، تیری سیدھی سادی باتوں میں کائنات کے عمیق ترین اور بسیط رموز پوشیدہ ہیں۔ تو نے کائنات کا اس قدر گہرا اور وسیع ادراک کہاں سے حاصل کیا؟"

ببول کی شاخوں میں پھڑپھڑاہٹ ہوئی۔ ایک فاختہ اچک کر آگے بڑھی۔ ایک دھیمی سی آواز آئی "کائنات جس کی خاطر ہو، جو کائنات کی ہو، اس پر کائنات کا کون سا مخفی پہلو ہے جو ظاہر نہ ہو!"

میں نے فاختہ کی سمت دیکھا۔

"شریر!" مجھے وہ فاختہ بہت پیاری لگی۔ ڈھانچے کا ارتعاش اور تیز ہو گیا۔ وہ سنسنا رہا تھا، اسی طرح جیسے ببول کی شاخیں بادشمال سے سنسناتی ہیں۔ ڈھانچے میں سے ایک عجیب سی آواز ابھری جیسے کوئی غم زدہ مدت کے بعد ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے ٹھٹک جائے۔

"اب کہاں جاؤ گی؟" ڈھانچے سے سنسناتی آواز نکلی۔

"مجھے خبر نہیں،" میں نے جواب دیا۔

"سفر کی بے سمتی ایک حسین شے ہے..." ڈھانچے کا ارتعاش مزید تیز ہوا۔ ببول کی شاخیں

بھی سنسنانے لگیں۔ ہوا میں تیزی نمودار ہوئی۔

"سہ پہر ڈھل رہی ہے — ایک بات سنو۔"

"کہو" میں نے آہستہ سے کہا۔

"کبھی پھر اس راہ سے گزر ہو تو میں تمہیں سنانے کے لیے بدلتی رتوں کے حوادث کا شمار کرتا رہوں گا۔ میرے پاس ضرور آنا گھبرانا نہیں۔ میں شیطان نہیں ہوں اور نہ ہی یہاں کوئی آبِ حیات ہے۔"

ڈھانچے کی آواز لرزنے لگی۔ ارتعاش شدید تر ہو گیا اور وہ پول کی ٹہنیوں سے چھن چھن کر آنے والی کرنوں میں، دائرے بنا کر رقص کرتی کرنوں میں آہستہ آہستہ تحلیل ہو گیا۔

سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ اداسی سے افق کی جانب دیکھتے ہوئے میں نے سوچا کہ وہ کہاں جائے جس کی کوئی منزل ہی نہ ہو۔ افق کو دیکھتے ہوئے، چلتے ہوئے میں پول سے دور ہوتی گئی — خود بخود مسکراتے ہوئے میں کسی اور پول کی سمت رواں ہو گئی جہاں میں پھر اس عظیم انسان کے ڈھانچے کو دیکھ سکوں جو ہمیشہ زندہ رہے گا، جو لافانی ہے، جسے جاودانی حاصل ہے۔ اگرچہ وہ ایک ڈھانچہ ہے، صرف ایک ڈھانچہ — خشک ڈھانچہ۔

❀ ❀

انتخاب

منتخب تحریریں	گابریل گارسیا مارکیز	ترتیب: اجمل کمال	(زیر طبع)
منتخب تحریریں	نرمل ورما	ترتیب: اجمل کمال	Rs.280
منتخب کہانیاں	ویکوم محمد بشیر	ترتیب: مسعود الحق	Rs.180
پریم وانی	میرا بائی	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کبیر بانی	کبیر	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395

ناول

بیس سو گیارہ	محمد خالد اختر	Rs. 70
گنگا جمنی میدان	اختر حامد خاں	Rs.120
دائرہ	محمد عاصم بٹ	Rs.100
نمبردار کا نیلا	سید محمد اشرف	Rs.60

ناولوں کے ترجمے

تمس	بھیشم ساہنی	ترجمہ: شہلا نقوی	Rs.180
قلبِ ظلمات	جوزف کونریڈ	ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن	Rs.80
بوفِ کور	صادق ہدایت	ترجمہ: اجمل کمال	(زیر طبع)
خیمہ	میرال طحاوی	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.75
نوکری کی قمیص	ونود کمار شکل	ترجمہ: عامر انصاری، اجمل کمال	Rs.100
پیلی بارش	خولیو لیامازاریس	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.95
سرزمینِ مصر میں جنگ	یوسف القعید	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.125
درخت نشین	اطالو کالوینو	ترجمہ: راشد مفتی	Rs.175
شہزادہ احتجاب	ہوشنگ گلشیری	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.70

Scanned with CamScanner

علی اکبر ناطق

قائم دین

"ہاں تو بول اس ڈبے کھری کا کیا لے گا؟ ویسے ایک بات کہوں؟ چوری کا مال ہے سوچ کے مول لگانا۔ کل کلاں پلس آ گئی تو اس کے ساتھ بھی کک مکا کرنا پڑے گا۔" نور دین نے بھینس کی کمر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"دیکھ میاں نورے، پانچ ہزار سے ایک ٹکا نیچے نہیں لوں گا۔ اٹھارہ لیٹر دودھ سویرے شام باٹوں سے تول لینا۔ قطرہ کم ہوا تو تجھ سے پر موچھ منڈواؤں گا۔ رہی پلس کی بات! اگر تجھے کوئی پوچھے، سیدھا میرے چھپر کی راہ دکھانا۔ میں جانوں اور پلس۔" قمے نے صاف رو کھے پن سے مول بتاتے ہوئے کہا۔

"پانچ ہزار، قہر خدا کا! آخر بھینس ہی تو ہے، کوئی ہاتھی تھوڑی ہے۔ پھر تم کون سا مول لے کے آئے ہو۔ مفت کی مار ہے۔ تین ہزار لو اور کمبل سے جان چھڑاؤ۔" نورا پھر بولا۔ "مائی نذیراں کو تو پچھلے مہینے نِل برابر گائے ایک ہزار ہی میں دے دی اور مجھ سے پانچ ہزار مانگتے ہو!"

"اے چل، مفت کی مار ہے! بارڈر پار سے مال چوری کر کے لانا تو ایک طرف، ذرا آدھی رات کو دریا پار کر کے ہی دکھا دے۔ ایسی تین بھینسیں مفت میں نہ دوں تو نظام دین کا نطفہ نہیں۔" قما تلخی سے بولا۔ "پوہ کی ٹھنڈی راتوں کو چڑھتا ستلج پار کر کے ڈیلے کے جنگلوں میں کالے سانپوں کی سریاں پاؤں سے کچلنا اماں جی کا کھیل نہیں۔ اور پھر بارڈر پار یہ مال سکھوں نے کوئی ہتھیلی پر رکھ کر نہیں کھڑے ہوتے۔ موت کے منہ سے نکال کے لاتا ہوں۔ اور تجھے مفت میں دے دوں؟ اگر پانچ میں

لیتی ہے تو لے، ورنہ اپنا رستہ ناپ۔ مائی نذیراں کا تجھے ٹھیکہ ہے کیا؟ بیچاری کا آگا نہ پیچھا، اکیلا دم۔ میں اُسے مفت میں دوں یا پیسے لوں، تجھے کیا درد؟"

قمے کی بات سن کر نور دین کھسیانا سا منہ لے کر باڑے سے باہر نکل آیا۔ اِدھر قمے نے جلدی سے بھینسوں کو ٹرک پر لادنے کی تیاری کی جو اس کا بھائی جلال دین رات ہی منڈی احمد آباد سے کرائے پر لایا تھا۔ وہ بس میں چھ بھینسیں اور دو گائیں لاد کر لاکھو رکی منڈی میں لے گیا۔

اُدھر جلال دین مال لے کر چلا، اِدھر قصہ خوانیاں شروع ہو گئیں۔

"بھائی شادے خاں،" قمے نے مونچھ پہ ہاتھ پھیر کر حقے کا ایک لمبا گھونٹ بھرا۔ "جب میں دریا کے کنارے پہنچا تو رات کے نو بجے تھے۔ رات گھپ اندھیری، ایسی کہ عزرائیل بچارے کے بھی ساہ نکل جائیں۔ اُدھر ستلج کا ٹھاٹھیں مارتا ٹھنڈا پانی۔ میں نے دل میں کہا، لے بھئی قمیا، تیرا رب راکھا اور سائیں جانن شاہ تیرا مددگار۔ مار دے چھلانگ دریا میں۔ بس پھر ایک دو منٹ ٹھنڈ لگی، اس کے بعد تو میں دریا کو چیرتا ہوا گزرا۔ پندرہ منٹ میں رب سائیں کے کرم سے اگلے کنارے پر تھا۔"

"اور ڈیلے کا جنگل کیسے پار کیا؟ وہاں تو گلہریوں کی طرح سانپ ناچتے ہیں،" شمس علی نے حیرانی سے پوچھا۔

"قمے خاں! ڈیلے کا نہیں، سانپوں کا جنگل کہو، سانپوں کا!" قمی بیٹھی دھوپ میں انگڑائی لیتے ہوئے بولا، "اتنے موٹے ہیں کہ بندے کو ثابتا کھا جائیں۔ ڈکار لینا تو الگ بات، زبان تک نہیں چاٹتے۔ بس دو کروٹیں لیں، بندہ ہضم۔ قسم جانن شاہ کی، ان آنکھوں نے بیسیوں بندے ڈیلے کے اس جنگل میں غائب ہوتے دیکھے۔ دو چار تو میرے سامنے نگلے گئے۔ اب میں کوئی بچہ تھا جو اس کا توڑ نہ جانتا۔ پیر نظام بخش سے منتر اسی اوکھت کے لیے تو سیکھا۔ بس بھائی اِدھر میں نے منتر پڑھا، اُدھر باشک ناگ، کل ساڑ، ارگن ناگ، پھپھرا، پدم ناگ، کھجوڑیا، سنگچوڑ، کلمریا ایک ایک کرکے سلامی کو حاضر ہوئے۔ نیل باتیا منکر ہوا تو ایک پھونک مار کے دھواں کر دیا۔"

"لیکن سؤر پر تو منتر چلتے نہیں اور میں جانتا ہوں دس بیس نہیں، سینکڑوں سؤر اس جنگل میں ہیں، گویا ہندوستانی فوج کناریں منہ میں دبائے پھرتی ہو۔ اُن سے کیسے بچی؟" حامدی نے لقمہ دیا۔

"واہ حامدی واہ، یہ تو نے خوب کہی! یہ دیوار سے لگی چھ پھلی برچھی کو دیکھو، کاٹتے وقت دشمن اور

Scanned with CamScanner

سؤر میں فرق نہیں کرتی۔ پندرہ سؤر کاٹ کے دیکھ کتنے آرام سے لیٹی ہے۔ جنم جنم کی ساتھی۔ بھاگ بھری نے رات کمال کر دیا۔

"قصہ مختصر" فتے نے داستان آگے بڑھاتے ہوئے کہا، "سؤروں کو پھاڑتا اور سانپوں کو کچلتا ہوا رات ایک بجے بھجاسیوں کی بھینی پر پہنچا اور ایک ایک کر کے ساری بھینسیں کھول کر آگے کر لیں۔ مونجی کے کھیت سے ہوتے ہوئے ایک گھنٹے میں بارڈر سے ادھر لے آیا۔"

"تو کیا بکھو وافیم کھا کے سویا تھا جو جاگا نہیں؟" ارشاد علی نے پوچھا۔

"سالا آدمی کہاں؟ بھینس ہے۔ روزانہ چار جگ لسی پی کے سوتا ہے۔ جو اتنی لسی پی لے، پھر وہ تو کیا، اس کے نصیب بھی سو جاتے ہیں۔"

فتا سردیوں کی اس روشن دھوپ میں تھڑے پر بیٹھا گاؤں کے لوگوں کو اپنی اس واردات کے قصے سنا رہا تھا کہ دور سے مولوی سراج دین تسبیح پھیرتا ہوا قریب آیا اور فتے کو مخاطب کر کے کہنے لگا،

"فتے، مال غنیمت مبارک ہو۔ سنا ہے رات اللہ نے تیری بڑی مدد کی۔ پورے آٹھ مویشی لایا ہے۔ بس کافروں کے ساتھ جہاد کا آج کل یہی طریقہ ٹھیک ہے۔ اللہ نے چاہا تو تیری بخشش یقینی ہے۔"

تمام لوگوں نے مولوی کی اس بات کو غور سے سنا اور فتے کی طرف رشک سے دیکھا۔ سن کر فتا بھی فخر سے مونچھوں پر ہاتھ پھیرنے لگا اور مصنوعی عاجزی سے مولوی کی طرف جھکا۔ پھر مولوی صاحب نے پندرہ بیس منٹ اسلام اور کفر پر وعظ کہا۔ اس کے بعد فتے کے گھر سے تمام لوگوں کے لیے چائے بن کر آ گئی جسے سب مزے سے پینے لگے۔ چائے پینے کے بعد مولوی سراج دین اٹھ کر جانے لگا تو سب کھڑے ہو گئے۔ دو قدم چل کر مولوی صاحب پھر مڑے اور فتے کو مخاطب کر کے بولے،

"پتر فتے، مسجد کا حصہ جلدی بھیج دینا۔ کہیں خدا ناراض نہ ہو جائے۔"

"بس مولوی صاحب، جلال دین منڈی سے واپس آ جائے تو سب سے پہلے مسجد کا حصہ آئے گا۔" فتے نے تڑ سے جواب دیا۔

"لے بھئی فتے، آج سے تیسرے روز بھادوں کی سولہ ہے۔" خانو سیال نے بیٹھتے ہوئے کہا، "میں نے تجھ پر دو ہزار کی جھنڈی رکھ دی۔ حیدا گجر اس دفعہ کشتی میں جیت کے نہ جائے۔ شام دین

Scanned with CamScanner

اور فیضے نے اُس پر شرط لگائی ہے۔"

"چاچا خانو، تو فکر نہ کر۔ حرامی کو ایسا دھوبی پٹڑا دوں گا کہ آئندہ دس پشتوں تک کوئی کشتی نہ کھیلے گا۔ گینڈے کی اولاد نے پچھلے سال مائی جمن کے پتر کی ٹانگ توڑ دی۔ اور پسلیوں پر بھی بلاوجہ زور دیتا رہا۔" متّا تڑپ کر بولا۔ "وہ تو کہو سردار نبی بخش نے کشتی چھڑا دی، ورنہ تو یہ اس کو مارنے ہی لگا تھا۔ مگر یہ تو بتا کہ تیرے پیسے کہاں سے آ گئے جو پورے دو ہزار لگا رہا ہے؟ اور پھر کتوں کی لڑائی اور کبڈی پر بھی تو شرطیں بندھتا ہیں۔"

"پتر، تو اس کی پروا نہ کر۔" خانو سیال بولا۔ "اس دفعہ گنے اور مونجی کی فصل نے سارے دلدر دور کر دیے۔ پورے ایک لاکھ کی فصل ہوئی۔ قرضہ ورضہ دے کر بیس ہزار اس کڑے وقت کے لیے بچا رکھا ہے۔ لیکن اس سال تو نے بھی تو تین چوریاں کیں۔ وہ کیا ہوئیں؟ جہاں تک مجھے پتا ہے، کم سے کم ایک لاکھ کا مال ہوگا۔ جانو، شریفا، متّا اور کالو تائی تو اسی کام میں لاٹوں کے مالک بن گئے اور تو وہی بچا تنگ کا بچا تنگ!"

"چاچا، کیا بتاؤں،" متّا تاسف سے بولا۔ "جس دن چوری کر کے لاتا ہوں، دوسرے دن ہی آدھا گاؤں ادھار لینے آ جاتا ہے۔ اور آج تک کسی نے ایک پائی واپس نہیں کی۔ پولیس تیسرا حصہ الگ مار لیتی ہے۔ اس کے علاوہ چندرو لوگ گھر کے اور اللہ بخشے بھائی رحمت کا کنبہ الگ۔ بس سمجھو ادھر آیا اور اُدھر نکل گیا۔ خیر چاچا، تو اس قصے کو چھوڑ۔ اس دو ہزار میں سے ایک ہزار میرا اور باقی کا تیرا۔ اللہ نے چاہا تو سوا بھا دوں کو چانن شاہ کا میلہ رنگ دوں گا۔"

میلے میں ابھی تین دن تھے۔ چک قاسم شاہ اور ارد گرد کے دس پندرہ گاؤں جو دریا کی ٹھاڑ[1] میں پڑتے تھے، سب میلے کے سوا ہر چیز بھول گئے۔ پہلوانوں کو مالشیں ہو رہی ہیں۔ کتوں اور مرغوں کی خدمتیں دگنی ہو گئیں۔ چانن شاہ کے مزار کے بائیں پہلو دریا کے کنارے اکھاڑے کی جگہ ہل چلا کر خوب نرم کر دی گئی۔ مزار پر جھنڈیاں اور رنگ برنگے دوپٹے لہرانے لگے۔ دور دور سے گاؤں کی عورتیں مزار پر گھی کے چراغ جلانے آئیں اور منتوں کا دودھ بٹنے لگا۔ ملنگوں نے بوٹی کے رگڑے اور حق علی کے نعرے اور تیز کر دیے۔

---

1 ٹھاڑ: دریا اور بند کے درمیان کا نشیبی علاقہ جہاں کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں آباد ہوتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

توت اور نیم کے گھنے سایوں میں دھمالیں پڑیں تو ٹھاڑ میں گویا زندگی جاگ اٹھی۔ بچوں سے بوڑھوں تک ہر کوئی مزار کی طرف رواں ہوا۔ مزار کے اردگرد کے بیسیوں ایکڑ کی زمین مٹھائی، جلیبی اور پکوڑوں والوں کی دکانوں سے بھر گئی۔

پندرہ کی رات دربار پر ہر طرف سے گھی، گیس اور تیل کے چراغ جل اٹھے۔ نقالوں اور بھانڈوں کی ٹولیوں نے اپنے اکھاڑوں کے لیے الگ الگ جگہوں پر قبضے جمائے اور آدھی رات تک تیاریوں میں مصروف رہے۔ چاند کی چودھویں کا دودھ برس رہا تھا اور خوشی کا میلہ تھا کہ شفیع کمبوہ نے خبر دی: دریا کا پانی معمول کی سطح سے بلند ہو رہا ہے، اپنا اپنا بندوبست کر لو۔ یہ سن کر اچانک لوگوں میں اضطراب پھیل گیا۔

رفیق جوئیہ گھر سے ریڈیو اٹھا لایا۔ آٹھ دس دن سے وہ یہ خبر سن تو رہے تھے کہ دریا کا پانی چڑھنے والا ہے، مگر وہ اسے افواہ ہی سمجھے، کیونکہ ہر سال ایسی افواہیں اڑتی رہتی تھیں لیکن پانی کبھی بھی خطرے کی حد تک نہ چڑھا۔ ہاں، بیس سال پہلے ایک سیلاب آیا تھا جس نے ان کا کافی نقصان کیا۔ پھر اس کے بعد ایسی کوئی مصیبت نہ آئی۔

رات ایک بجے سب لوگ ریڈیو کے گرد بیٹھ گئے اور خبروں میں سیلاب کے بارے میں سننے کے لیے تیار ہوئے۔ مگر تمام خبروں میں سیلاب کا ذکر تک نہ تھا۔ پھر بھی بے چینی نہ گئی۔ لوگ میلے کو بھول کر دریا کی طرف دیکھنے لگے، یہاں تک کہ دور سے پانی کی آواز سنائی دینے لگی۔ تقریباً تین بجے رات تک دریا نے اپنے پہلے کنارے ڈبو دیے اور فصلیں چاٹنے لگا۔ اب تو خوف و ہراس ایسا پھیلا کہ خلقت میں بھگدڑ مچ گئی۔ کچھ ہی دیر میں پانی جب مزار کے قریب آ گیا تو دکانوں والوں نے جلدی جلدی دکانیں بڑھائیں۔ نقال اور بھانڈ اکھاڑے سمیٹنے لگے۔ لوگ اپنے اپنے گاؤں کی طرف بھاگے مگر ان کے پہنچنے سے پہلے دریا گاؤں کی کچی دیواریں کھا چکا تھا۔

رات کے سے لوگ جو کچھ سمیٹ سکے اسے سمیٹا، باقی وہیں چھوڑ کر بڑے بند کی طرف جانے لگے۔ ٹرالیاں، چھکڑے اور گدھی ریڑیاں جت گئیں۔ مگر دریا کی رفتار ان سے کہیں زیادہ تیز تھی۔ تیز و تند شور اٹھاتا دریا فیل مست کی طرح چڑھا آتا تھا۔ قمے نے دیکھا تو اس نے اپنی بھینسوں اور کنبے

کے سوا ہر شے وہیں چھوڑ دی اور انھیں ہانکتا ہوا بڑے بند کی طرف چل دیا۔

صبح پانچ بجے تھا اور دریا برابر بند پر پہنچے۔ بند پر ٹُلّے کی طرح اور بھی سینکڑوں لوگ دور تک کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے جنھوں نے جلدی نماز چھوڑ دی تھی۔ ٹُلّے نے کنارے پر کھڑے ہو کر جب دریا کو دیکھا تو اُسے ایسے لگا جیسے زمین کے اندر سے پانی کا بڑا اژدھا نکل آیا ہو۔

ہزاروں چھپر بہے چلے جاتے تھے۔ سینکڑوں بکریاں اور گائے بھینسیں تیرتی اور ڈوبتی ڈباتی بند کی طرف آنے کی کوشش کر رہی تھیں کہ اچانک اس کی نظر ارشاد علی پر پڑی جو اپنے دو بچوں اور بیوی کو بمشکل سنبھالے، ہانپتا ہوا بند کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ٹُلّے نے جیسے ہی دیکھا، چھلانگ لگا کر چیتے کی سی پھرتی سے ارشاد علی کے پاس پہنچ گیا اور دونوں بچے اُچک کر بند کی طرف بڑھا۔ ارشاد علی کی جان میں جان آئی۔ لیکن اب ٹُلّے کو چین کہاں۔ اِدھر اُدھر سے ڈوبتوں نے پکارنا شروع کر دیا۔ اس نے دریا سے بند پر اور بند سے دریا میں کئی چکر لگا دیے۔ بیسیوں کو کھینچ کھینچ کے باہر لایا۔ مولوی سراج دین، چوہدری نور دین، فیض چوہدری، خان سیال اور سینکڑوں گاؤں والے بند پر بیٹھے، لاچاری کے عالم میں مکئی، گیہوں اور باجرے کے ڈھیروں کو پانی میں تیرتے دیکھ رہے تھے۔ اب دریا کا پانی اتنا بلند تھا کہ بند کی آخری حدوں کو چھونے لگا۔ بڑے بڑے درختوں کی چوٹیاں ڈوبنے سے بچ گئیں جو پرندوں سے ڈھکی پڑی تھیں۔ دریا نے کئی درخت بھی جڑ سے اکھیڑ دیے۔ ہزاروں مویشی ڈوب گئے جنھیں پانی بہائے لیے جاتا تھا۔ اکا دکا انسانوں کی لاشیں بھی تیرتی نظر آئیں، اور دریا کا پاٹ میلوں تک پھیل گیا۔ ایسی حالت میں ٹُلّے نے دوپہر ڈھلنے تک اپنی ڈوبی ہوئی بستی سے بند پر خدا جانے کتنے چکر لگائے اور تھک کر نڈھال ہو گیا۔ اس کے باوجود ہر ایک کی نظر امداد کے لیے اسی پر پڑتی اور وہ ہر چکر میں بند پر پہنچ کر ایک تفاخرانہ انداز سے لوگوں پر نظر ڈالتا جیسے کہہ رہا ہو: دیکھا! میں جو تم کو اپنے کارنامے گنواتا تھا، اب تو ان پر یقین آیا کہ نہیں؟ میرے علاوہ آج کون دریا کا سامنا کرنے والا ہے؟ ایسی نظر مار کر دوبارہ کسی مہم کے لیے بپھرے ہوئے پانی میں چھلانگ لگا دیتا۔ لیکن انسان آخر انسان ہے، دوپہر تک تھک کر نڈھال ہو گیا۔ بیوی نے یہ حالت دیکھی تو روکنے لگی کہ اب نہ کودنا۔ آہستہ آہستہ اس کا اپنا جوش بھی کافی ٹھنڈا پڑ گیا۔ مگر وہ یہ سوچ کر کہ لوگ اسے نامردی کا طعنہ دیں گے، دوبارہ پانی میں کود جاتا۔ یہاں تک کہ سہ پہر ہو گئی۔ پھر اچانک یہ دیکھ کر اس کی جان میں جان آ گئی کہ

Scanned with CamScanner

لوگوں کی مدد کے لیے پاک فوج دریا میں اُتر آئی ہے۔ اب اس نے جلدی سے اپنے قمیلے کو لیا اور چک جندکا میں فوج کے لگائے ہوئے خیموں میں سے ایک خیمے میں جا بیٹھا۔ پھر ایسا سویا کہ دوسرے دن دوپہر ہونے پر آنکھ کھلی۔ وہ جلدی سے اُٹھا اور بند کی طرف بھاگا۔

دیکھا تو ہر طرف سکون تھا۔ رات تک ہر چیز یا تو ڈوب گئی تھی یا بہہ چکی تھی۔ جدھر نظر جاتی سوائے پانی کے کچھ نظر نہ آتا۔ ہاں، مگر پانی پر اُڑتے ہوئے چھوٹے چھوٹے پرندے ضرور قلابازیاں لگا رہے تھے، جیسے ٹھاڑ کی بربادی پر خوشیاں مناتے ہوں۔ انھیں دیکھ کر زندگی میں پہلی دفعہ اس کے آنسو نکلے۔ وہ شام تک بند پر کھڑا رہا۔ آج وہ اس قدر بوجھل تھا کہ کچھ بھی ہو جاتا وہ پانی میں داخل نہ ہوتا۔ سورج ڈوبنے لگا تو قمے کو محسوس ہوا کہ اسے شدت سے بھوک لگی ہے۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس نے تو پرسوں شام سے کچھ نہیں کھایا۔ وہ اپنے خیمے کی طرف لوٹ گیا۔ اس کے بعد تو گویا یہ اس کا معمول بن گیا۔ روزانہ صبح بند پر آ کر بیٹھ جاتا اور میلوں پر پھیلے ہوئے دریا کے پاٹ کو دیکھتا رہتا، پھر شام کے بعد خیمے کی طرف لوٹ جاتا۔ ساتویں روز اس نے دیکھا، پانی اپنی سطح سے نیچے اُتر رہا ہے۔ پہلے دو دن تو آہستہ آہستہ، پھر اُس کے بعد تیزی سے سمٹنے لگا، اور ہر روز تقریباً دو فٹ نیچے چلا جاتا۔ غالباً بیس دن کے اندر اندر دریا کا پانی اپنے پہلے کناروں میں سمٹ گیا۔ لیکن زمین میں نمی اور کیچڑ اس قدر تھا کہ لوگوں کا آباد ہونا ابھی ناممکن تھا۔ جگہ جگہ تالاب بن گئے تھے۔ اِدھر اُدھر مردہ جانوروں کی ہڈیاں بکھری پڑی تھیں جنھیں سارا سارا دن گدھ اور کوے نوچتے رہتے۔ سینکڑوں درخت زمین پر لیٹے تھے جن میں کوڑا کرکٹ پھنسا ہوا تھا۔ اسی حالت میں سیلاب کے بعد چار ماہ گزر گئے۔ اب لوگ بھی خیموں کی زندگی سے تنگ آ چکے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جلدی سے اپنے ٹھاڑ میں جا بسیں، مگر جدھر دیکھتے، گڑھوں میں کھڑے پانی سے تعفن اُٹھ رہا تھا۔ ہر طرف طرح طرح کی جھاڑیاں اُگ آئیں جن کی اوٹوں میں ہزار ہا حشرات نے جنم لے لیا۔ کیڑے مکوڑوں اور سانپوں کی بہتات ہو گئی۔ اس عالم میں خیمے سے نکلنے والا پہلا شخص قمّا تھا جو اپنی بستی کیلئے بے چین تھا۔ اس کے بعد لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔

قمے نے جیسے ہی دریائد گھر میں قدم رکھا، اس کے جسم میں ایک بجلی سی کوند گئی۔ تمام گھر والوں کو ساتھ لیا، کیچڑ اور مٹی گارے سے دیوار بنانی شروع کی۔ اسے دیکھتے ہوئے سارا گاؤں حوصلے میں

آ گیا، حتیٰ کہ دو مہینے میں بستی دوبارہ بس گئی۔ زمین آہستہ آہستہ تعفن اور غلاظت نگلنے لگی۔ لوگوں نے مردہ ہڈیاں اور انجر پنجر دفن کر دیے۔ اپنی اپنی زمینوں کی دوبارہ حد بندیاں کی گئیں اور چھ ماہ کے اندر ہی ہل پھر چلنے لگے۔ بستی کے بہت سے درخت اُکھڑ چکے تھے۔ لوگوں نے سائے کے لیے اپنے اپنے گھروں میں دوبارہ پودے لگا دیے۔ فتے کے گھر میں بھی تین کیکر اور ایک بیری کا درخت تھا جن پر سارا دن کوے اور چڑیاں شور مچاتے۔ ان کی آواز کانوں میں ایک قسم کا رس گھولتی تھی۔ سیلاب اُن درختوں کو بھی بہا کر لے گیا، لہٰذا فتے نے بھی بند کے اُتار[2] سے ایک بیری کا پودا لا کر گھر میں لگا دیا جو دریا کی زرخیز زمین میں خوب پنپنے لگا۔ دن گزرتے گئے۔ حتیٰ کہ تین سال بعد تو ایسے ہو گیا، جیسے سیلاب کبھی آیا ہی نہ ہو۔ فتے نے بھی دوبارہ اپنا کاروبار شروع کر دیا۔

اب دریا کے پار کا آٹھ کلومیٹر میں پھیلا ہوا ڈیلے کا جنگل پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک اور گھناؤنا ہو چکا تھا۔ جنگل میں پانی جو کبھی ٹخنوں کے برابر تھا، وہ گھٹنوں گھٹنوں ہو گیا۔ بچھو، سانپ، نیولے اور نہ جانے کون کون سے حشرات الارض رینگتے پھرتے۔ کئی اژدہے لوٹیں مارتے، گیدڑوں، سؤروں کی گڑگڑاہٹیں، الوؤں اور چڑیلوں کا شور کانوں کی سماعت چھین لیتا۔ ایسی خوفناک صورت حال میں آدمی رات تو کیا دن کو بھی وہاں سے نہیں گزرتا تھا۔ مگر فتے کے لیے یہ کوئی عجیب بات نہ تھی۔ اس نے جنگل میں کئی ایک جگہیں اپنے ٹھکانے کے لیے بنا رکھی تھیں۔ بچپن ہی سے وہ جنگل کی اونچ نیچ سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کون سی جگہ زیادہ خطرناک ہے اور کون سی کم، اگر کسی بلا سے واسطہ پڑے تو کیسے بچاؤ کرنا ہے۔ وہ اپنے پاس آگ کا بندوبست ضرور رکھتا۔ اُسے آگ نے کئی دفعہ خطرناک صورتِ حال سے نکالا تھا۔

دن ڈھلنے سے پہلے ہی فتا دریا پار کر کے ڈیلے کے جنگل میں آ جاتا اور بیچوں بیچ آٹھ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے ہندوستان کی سرحد پر پہنچ جاتا۔ رات کے پچھلے پہر بارڈر کراس کر کے گائے، بھینس، بیل یا بھیڑ بکریاں جو کچھ ہاتھ لگتا ہانک کر ڈیلے کے اسی جنگل سے ہوتا ہوا دریا پر آتا اور صبح دس بجے سے پہلے اپنے گاؤں پہنچ جاتا۔ فتا ہر چوری میں کم از کم دو ماہ کا وقفہ ضرور رکھتا۔ ہندوستانی رینجر سے کئی دفعہ پاکستانی رینجر کو شکایات بھی وصول ہوئیں۔ لیکن ڈیلے کا جنگل دونوں کے لیے مشکل پیدا کیے

[2] اُتار: بند سے دوسری طرف کا علاقہ جسے دریا سے کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔

ہوے تھا، جبکہ فتے کے لیے وہی جنگل نعمت تھا۔ سیلاب کے بعد دس سال گزر گئے۔ اس عرصے میں فتے نے خدا جانے کتنے لیے ہاتھ مارے۔ اس نے اپنے گاؤں کو مویشیوں سے بھر دیا۔ سیلاب میں غارت ہونے والے کئی لوگوں کے چولھے مفت میں جلائے۔ بہت سوں کو سستے داموں بیچتا رہا۔

پہلے پہل تو پاکستانی رینجر اسے نظر انداز کرتی رہی لیکن اب صورت حال زیادہ بگڑ گئی تھی کیونکہ ہندوستانی رینجر کا دباؤ مسلسل بڑھ رہا تھا۔ لہٰذا پاک رینجرز نے سنجیدگی سے چوروں کو پکڑنے کے بارے میں سوچا۔ دریا سمیت ڈیلے کے جنگل کی خفیہ ناکہ بندی کر دی گئی۔ جگہ جگہ چھاپے مارے گئے، جس میں پہلے مہینے ہی فتا اور کالو پکڑے گئے لیکن فتا ہاتھ نہ آیا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہ ہمیشہ چوری کرنے سے پہلے پورے علاقے کی جاسوسی کرتا، تاکہ حالات کا جائزہ لے سکے۔ اس نے اپنے والد کے ساتھ کام کرتے ہوئے بہت سے تجربات حاصل کیے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اسے کس طرح مشکل حالات کا مقابلہ کرنا ہے۔ اس کے باپ نے اسے بہت سے گر بتائے تھے۔ لہٰذا اس سال اس نے صرف دو کامیاب چوریاں کیں۔

دوسری چوری اس نے دسمبر کی انتہائی سرد رات میں کی، جس میں وہ پوری گیارہ بھینسیں ہندوستانی علاقے سے تین کلومیٹر اندر جا کر لے آیا تھا۔ یہ چوری ایسی نہ تھی کہ جسے نظر انداز کر دیا جاتا۔ دو طرفہ رینجر میں ایک بھونچال آ گیا۔ اور افسرانِ بالا نے انتہائی سرزنش کی۔ ان حالات میں رینجر نے اپنی سرگرمیاں انتہائی سخت اور تیز کر دیں۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ مال جنگل سے ہو کے نکلتا۔ پھر بھی رینجر نے تہیہ کر لیا، چاہے کچھ بھی ہو اب چور ضرور پکڑا جائے۔ سخت تیار کیے گئے اور مکمل بندوبست انتہائی خفیہ طریقے سے کیا۔

پندرہ فروری کی سہ پہر فتا دریا پر پہنچا تو اسے ارشاد علی سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ فتے کے ہاتھ میں چھوی دیکھ کر ارشاد مسکرایا اور دور ہی سے ہاتھ ہلا کر گاؤں کی طرف مڑ گیا۔ فتے نے سوچا، ارشاد کتنا حرامی ہے، میری دو بھینسوں کے پیسے کھا گیا، چھ ماہ ہو گئے ایک ٹکا نہیں دیا، اب نزدیک آ کر سلام لینے سے بھی گیا۔ اُس نے سوچا، اب میں سارا مال منڈی میں ہی بھیجا کروں گا۔ گاؤں والوں کو کسی جانور کی دُم بھی نہیں دوں گا۔ اتنے مشکل حالات میں موت کے منہ سے جانور نکال کر لاتا ہوں اور یہ

گاؤں والے بیٹھے بٹھائے مفت میں لے جاتے ہیں۔ خبیث بعد میں پیسے بھی نہیں دیتے۔

خیر، رات دو بجے تھا جیسے ہی ڈیلے کے جنگل سے نکلا اور ہندوستان میں داخل ہونے لگا تو پاک رینجر نے اچانک دبوچ لیا۔ فتے کو اتنا موقع بھی نہ مل سکا کہ وہ جنگل میں دوبارہ داخل ہو جائے۔ وہ حیران ہوا کہ انھیں کیسے پتا چلا۔ وہ اسی تذبذب میں تھا کہ اس کی مشکیں کس دی گئیں اور رینجر ہیڈ کوارٹر میں لے جا کر مار پیٹ شروع کر دی گئی۔ فتے نے اپنی زبان ایسی بند کی کہ رینجر کا ہر طریقہ فیل ہو گیا۔ دو مہینے تک فتے کو اتنی مار پڑی کہ زمین ہل جاتی تھی۔ روزانہ مار کھانے کے بعد تھا مسلسل سوچتا، آخر اس کی مخبری کرنے والا کون ہے؟ چھ ماہ تک رینجر نے فتے سے اگلوانے کا ہر حربہ استعمال کیا۔ شلوار میں چوہے چھوڑے گئے، اُلٹا لٹکایا گیا، پانی میں غوطے دیے گئے۔ اور مار تو اتنی دی کہ خود رینجر والوں کو اس پر ترس آنے لگا۔ جب وہ کسی طرح بھی نہ مانا تو شراب کا کیس بنا کر اسے منڈی احمد آباد تھانے بھیج دیا گیا۔ لیکن ان چھ ماہ کے دوران تھا جسمانی اور دماغی طور پر بالکل نڈھال ہو چکا تھا۔ کیونکہ رینجر کے خوف سے ایک تو گاؤں میں سے کسی نے آ کر اُس کی خبر نہ لی اور دوسرا یہ کہ اُس کا بھائی جلال دین رینجر کی مار برداشت نہ کرتے ہوئے چار ماہ پہلے مر گیا۔ فتے کو ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا۔ اسے منڈی احمد آباد تھانے میں چھ ماہ تک رکھا گیا، اور ہلکی پھلکی دوائیاں بھی دیتے رہے مگر بخار نہ اُترا۔ آخر ایک دن تھانے دار نے اسے بلایا اور تھوڑی بہت سرزنش کر کے چھوڑ دیا۔

حوالات سے نکلتے ہی اس نے ہلکی سی انگڑائی لی اور تھوڑی دیر کے لیے تھانے کی بیرونی دیوار کے ساتھ کیکر کے سائے میں بیٹھ گیا۔ یہ سردیوں کی ایک ٹھنڈی دوپہر تھی۔ اس کے اوپر کوئی کپڑا بھی نہ تھا۔ ہوا کی ایک سرد لہر اس کے سینے کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ منڈی احمد آباد کے تھانے سے اس کا گاؤں بائیس کلومیٹر دور تھا۔ اس نے باجرے کے کھیت کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ بخار سردی کی وجہ سے زیادہ تیز ہوتا گیا اور سر میں شدید درد بھی ہونے لگا، لیکن وہ چلتا گیا۔ رات ایک بجے کے قریب اُسے ایک چکر سا آیا اور وہ گر پڑا۔

صبح سات بجے شریف حسین نے فتے کے بیٹے طفیل کو بتایا کہ تیرا باپ خربوزوں کے کھیت میں بے ہوش پڑا تھا، میں بڑی مشکل سے اسے ہوش میں لایا تو وہ اُس وقت سے کچھ اُلٹی سیدھی مار رہا ہے۔ اس نے ہمیں پہچانا بھی نہیں۔ خدا خیر کرے، مجھے تو لگتا ہے کہ اُس کا دماغ چل گیا ہے۔ اسے

بہت تیز بخار بھی ہے۔ لگتا ہے بخار اس کے سر کو چڑھ گیا۔

یہ 1998 کی بات ہے۔ قمے کو پاگل ہوئے اٹھارہ سال ہو گئے۔ شروع شروع میں تو بہت علاج کرایا۔ گاؤں کے حکیم کے دیسی نسخوں سے لے کر پیر چراغ شاہ کے تعویذ آزمائے۔ مگر پاگل پن بڑھتا ہی گیا۔ اس عرصے میں وہ کبھی کبھی تندرست بھی ہو جاتا مگر یہ حالت چند دنوں سے زیادہ نہ رہتی۔ پچھلے دس سال سے تو وہ ایک لمحے کے لیے بھی ٹھیک نہ ہوا۔ اب اس نے گاؤں والوں کو گالیاں بھی دینا شروع کر دیں۔ جو سامنے سے گزرتا اسے بیہودہ گالیاں دیتا۔ رفتہ رفتہ حالت یہاں تک پہنچی کہ وہ لوگوں کو ڈھیلے اٹھا کر مارنے لگا۔ یہ حالت دیکھ کر لوگ اس سے کترا کر گزرنے لگے۔ ادھر یاں کی اس حرکت سے مزید اشتعال میں آ کر گالیاں دیتا ہوا پیچھے بھاگنے لگا، جسے لوگوں نے کچھ عرصہ تو برداشت کیا، مگر اب وہ تنگ آ گئے اور قمے کے بیٹے کو شکایتیں آنے لگیں۔ جب شکایات شدت اختیار کر گئیں تو ایک دن طفیل نے قائم دین کو ایک چھوٹی سی زنجیر سے اُسی کی چارپائی کے ساتھ باندھ دیا تا کہ گھر سے نہ نکلے۔ قائم دین دو تین دن تو اسی حالت میں رہا، مگر ایک رات چارپائی سمیت باہر نکل کر گاؤں کے چوک میں بیٹھ گیا اور پھر وہی گالیاں دینے لگا۔ یہ دیکھ کر طفیل نے اس کی چارپائی گھر میں کھڑے بیری کے درخت سے باندھ دی۔ اب قائم دین گھر کے افراد کو سارا سارا دن کوستا اور زنجیر پٹختا رہتا۔ یوں دو تین ماہ اسی طرح گزر گئے۔ ایک دن خدا جانے کیسے زنجیر ٹوٹی اور قائم دین آزاد ہو گیا۔ طفیل گھر پر نہیں تھا۔ عورتوں سے پکڑا نہ گیا۔ وحشت عروج پر تھی۔ شام تک کئی ایک کو زخمی کر دیا اور بہت سوں کو بیہودہ گالیاں دیں۔ گاؤں میں بہت ہنگامہ ہوا۔ کم بخت نے رشاد علی کی بیٹی کو تو ایسی اینٹ ماری، بیچاری سیدھی ہسپتال جا پہنچی۔ دوئم، مسجد میں گھس کر تمام نمازیوں کے سروں پر خاک ڈال دی اور جوتے اٹھا کر کنویں میں پھینک دیے۔ اُس کی اس حرکت پہ سے طفیل عتاب میں آ گیا۔ مولوی صاحب نے برا بھلا کہا۔ چوہدری عاشق علی نے طفیل کو بلا کر کہہ دیا، "اگر تمھارے باپ نے آئندہ کوئی ایسی حرکت کی تو گاؤں سے اپنا بستر گول کر جانا۔ بڈھے نے بیس سال سے سب کو پاگل بنا رکھا ہے۔ یا تو اسے باندھ کے رکھو ورنہ زہر دے کر قصہ پاک کرو، تا کہ روز کی چخ چخ سے جان چھوٹے۔"

لہٰذا طفیل نے قائم دین کو اب جو زنجیر مارا، وہ ایک مست ہاتھی کے لیے بھی کافی تھا۔ اس نے

آتے ہی لوہار سے پندرہ کلو کا ایک لوہے کا زنجیر اور دو کلو کا دیسی تالا بنوا کر قائم دین کو بیری کے موٹے تنے سے باندھ دیا۔ پاس ایک چارپائی رکھ دی کہ چاہے تو چارپائی پر لیٹ جایا کرے، ورنہ زمین تو ہے ہی۔ قائم دین کی بہو صبح شام کھانا اُس کے سامنے رکھ دیتی کہ وہ سگی بھتیجی بھی تھی۔ کوئی اور نزدیک جاتا تو وہ کھانا بالکل نہ کھاتا تھا۔ قائم دین کو اس زنجیر سے بندھے آج چھ ماہ ہو چکے تھے۔ بائیں ٹخنے پر گہرے زخم واضح دکھائی دینے لگے۔ دو سال سے بہو برابر صبح شام اس کا گند بھی صاف کرتی۔ یہ اس کے معمول میں شامل تھا۔

پچھلے اکیس برسوں میں بیری کا درخت اس قدر پھیل گیا کہ پورے احاطے کو اپنے گھیرے میں لے آیا۔ ہری بھری لچکیلی شاخوں پر گلہریاں اور طوطے چڑیاں چہکتیں رہتیں۔ بعض اوقات قائم دین کے سر پر بھی آ کر بیٹھ جاتیں اور چوں چوں کا شور اس قدر بلند کرتیں کہ قائم دین کی پوری توجہ اُدھر ہو جاتی۔ اب وہ سارا سارا دن بیری کی شاخوں پر پھدکتی گلہریوں، رس چوستی شہد کی مکھیوں اور ہرے پتوں کے درمیان چہکتی چڑیوں کو دیکھتا رہتا۔ آہستہ آہستہ اُن سے اتنا مانوس ہو گیا کہ کسی اور طرف توجہ بھی نہ کرتا۔ اب گالی دینا تو الگ بات، اس نے بولنا ہی بند کر دیا۔ بس ٹک ٹک بیری کی شاخوں کو دیکھتا اور چہکتے ہوئے پرندوں میں ہی مگن رہتا۔

غالباً بیس جون 1999 کا دن تھا۔ طفیل اپنی بیوی کے ساتھ حجرہ شاہ مقیم فوتگی پر گیا ہوا تھا۔ وہ قائم دین کی ذمہ داری اپنے پڑوسی نذیرے کو سونپ گیا، کیونکہ اُسے حجرے میں دو چار دن لگ جانے تھے۔ انہی دنوں یہ خبر اُڑی کہ ہندوستان نے ستلج کا پانی چھوڑ دیا ہے۔ خبر اس وقت پہنچی جب پانی بالکل نزدیک پہنچ گیا۔ اس خبر نے سارے ٹھاڑ میں ہراس پھیلا دیا، پھر بھی ٹھاڑ والوں کے پاس بچنے کے لیے کچھ وقت تھا۔ لوگوں کو بتیس سال پہلے کا سیلاب یاد تھا۔ انھوں نے جلدی جلدی اپنے بوریے بستر لپیٹے اور بند کی طرف بھاگے۔ ہر ایک کی یہی کوشش تھی کہ جو وقت ملا ہے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی ہر ایک چیز بچا لے جائیں۔ لہٰذا ہر آدمی کام میں اس قدر مصروف تھا کہ کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔ جسے دیکھو اپنا سامان گڈ[3] اور چھکڑوں پر لادے بند کی طرف بھاگا جاتا ہے۔ مکانوں کی چھتوں سے شہتیر

[3] گڈ لکڑی سے بنی ہوئی ایک قسم کی گاڑی جس کے پہیے بھی لکڑی کے ہوتے ہیں۔

نکال لیے گئے ور ایک ایک چیز سمیٹ لی گئی۔ نذیرے نے بھی جلدی سے اپنا سامان باندھا۔ وقت بہت کم تھا جبکہ پانی تیز رفتاری سے ٹھاڑ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے اپنے تمام مویشی اور سامان دو تین چکر میں بند پر پہنچا دیے۔ اتنے میں پانی گھر میں داخل ہو کر ٹخنوں سے اوپر اُٹھنے لگا۔ طفیل کو جب سیلاب کی خبر ہوئی تو وہ جلدی سے منڈی احمد آباد آنے والی بس پر بیٹھا تا کہ وقت پر پہنچ سکے۔ وہ منڈی احمد آباد پہنچا تو شام کے پانچ بج رہے تھے۔ اگلا رستہ اس نے پیدل طے کرنا تھا، کیونکہ ان علاقوں میں بس یا تانگے وغیرہ نہیں جاتے تھے۔ اُدھر گاؤں میں پانی گھٹنوں سے اوپر آ چکا تھا۔ شام چھ بجے تک دریا نے بچی کچھی دیواریں اور مکان بھی برابر کر دیے۔ قائم دین کی چارپائی پانی میں ڈوب چکی تھی، لیکن وہ بے فکری سے پریشانی میں دوڑتے ہوئے لوگوں کو دیکھنے میں مگن تھا۔ ہر ایک کو اپنی پڑی تھی۔ لوگ قائم دین کو زنجیر سے بندھا ہوا دیکھتے اور گزر جاتے۔

نذیرے نے بند پر پہنچ کر سکھ کا سانس لیا اور سوچا، شکر ہے، ہر چیز سلامت پہنچ گئی۔ مگر اچانک اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اسے خیال آیا کہ طفیل نے قائم دین کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی تھی۔ مگر افراتفری میں کچھ یاد نہ رہا۔ اس نے چاہا کہ واپس گاؤں جائے، مگر پانی کے شور اور اندھیرے سے ڈر گیا۔ سوچنے لگا پانی تو بہت بلند ہو چکا ہے اور زنجیر کی چابی بھی میرے پاس نہیں، لہٰذا اب جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔

پانی جب قائم دین کے گھٹنوں سے اوپر اٹھا تو وہ بیری کے تنے سے لپٹ گیا۔ اور بیری پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن پاؤں میں بندھا زنجیر رکاوٹ بن گیا۔ طفیل ابھی تک آٹھ کلومیٹر اپنے گھر سے دور تھا۔ کبھی بھاگتا اور کبھی چلتا، مگر اتنا فاصلہ چند گھنٹوں میں طے کرنا آسان بات نہ تھی، جبکہ ٹھاڑ میں پانی بھی گھٹنوں سے اوپر ہو چکا ہو۔ رات نو بجے کے قریب پانی جب قائم دین کے کاندھوں تک پہنچا تو اس نے شدت سے اپنے پاؤں جھٹکنے شروع کیے۔ کبھی ہاتھوں سے زنجیر کھینچتا اور زور سے ہاتھ پاؤں مارتا۔ کبھی بیری پر چڑھنے کی کوشش کرتا لیکن پھر زنجیر آڑے آ جاتا۔ آخر ستر سال کا بڈھا پندرہ کلو وزنی لوہے کے زنجیر سے کہاں تک زور آزمائی کرتا۔ نڈھال سا ہو گیا اور جس قدر وہ اُٹھ سکتا تھا، اُٹھ کر بیری کے تنے سے چمٹ گیا۔ مگر پانی تھا کہ تھوڑی دیر بعد مزید بلند ہو جاتا۔ اب قائم دین کوئی پانچ فٹ کی بلندی تک زنجیر سمیت بیری کے تنے سے چمٹا ہوا تھا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں اس

قدر وزنی زنجیر کو اٹھا کر چھپکلی کی طرح مسلسل چمٹے رہنے سے شل ہو گئے۔ اس پر ستم یہ کہ پانی نے اپنی سطح اور بلند کر لی۔ رفتہ رفتہ پانی اتنا بلند ہو گیا کہ قائم دین غوطے کھانے لگا۔ وہ بار بار زنجیر سے پاؤں پٹختا اور غوطے کھاتا رہا۔ مگر سب کچھ بے سود تھا۔ اندھیری رات میں سوائے پانی کے اُسے کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ یہاں تک کہ رات دس بجے اچانک پانی کا پہلا گھونٹ اُس کے منہ میں داخل ہوا۔ پانی اس قدر زیادہ تھا کہ قائم دین سانس نہ لے سکا۔ بے بسی کے عالم میں اُس کے منہ سے ایک زور کی چیخ نکلی جس کی آواز سے پورا ٹھاز سہم گیا۔ پھر پانی کے اندر کچھ دیر تک ایک بھرپور ہلچل ہوئی، پھر ایک خاموشی چھا گئی۔ طفیل ابھی تک اپنے گاؤں سے چار کلومیٹر دور تھا۔

❀❀

علی اکبر ناطق

جودھ پور کی حد

"مردوں پر اونچ نیچ تو آتی ہے، مگر ایسا قہر پہلے کبھی نہیں پڑا۔ الیاسے! جینے کے قابل نہیں رہے۔"

"ابا، اب تو جو ہو گیا سو ہو گیا۔ داغ تو ڈھل نہیں سکتا، چاہے لاکھ صفائیاں دیتے پھریں۔ اب تو کچھ ایسا کرو کہ کسی طرح لوگوں کے منھ بند ہو جائیں،" الیاسے نے منھ اوپر اٹھائے بغیر جواب دیا۔

"بے غیرتا آپ مر گیا اور یہ سوغات چھوڑ گیا ہمارے لیے، تاکہ ساری زندگی سر اُٹھا کے نہ چل سکیں،" حاجی دوبارہ بولا۔ پھر شریف کی طرف منھ کر کے جو ابھی تک چپ بیٹھا تھا: "شریفے، اب تو ہی کوئی حل بتا۔ میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

کچھ دیر ٹھہر کر شریف بولا، "حاجی، میں نے بڑا غور کیا ہے۔ مجھ سے پوچھو تو اب اس کا ایک ہی حل ہے۔" پھر منھ آگے کر کے آہستہ سے حاجی شریف نے لطف اللہ اور الیاسے کو اپنی تجویز پیش کی، جسے سن کر الیاس تو فوراً متفق ہو گیا مگر اس کا باپ لطف اللہ تذبذب پڑ گیا۔ لیکن بالآخر اس نے بھی اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔

جب غفور کی ماں کو طلاق ہوئی تو وہ تین سال کا تھا، لہٰذا جودھ پور گاؤں آتے وقت ماں اسے بھی ساتھ لے آئی۔ یہاں غفورے کا نانا اس کے ناز اٹھانے لگا۔ جب بھی مسجد میں نماز پڑھنے جاتا، واپسی پر شیرینی یا پھل ضرور لے کر آتا۔ کھلونوں اور کپڑوں کے ڈھیر لگ گئے۔ ماں الگ پیار دیتی۔ غرض بچپن ناز و نعمت میں گزرنے لگا۔ پانچ برس کا ہوا تو گاؤں کے سکول میں داخل کروا دیا گیا۔ مگر

قسمت سے غفورے کو ذہن ایسا ملا جو علم کا بوجھ سہارنے سے یکسر عاجز تھا۔ ایک سال سکول جاتے ہو گیا، مجال ہے ایک لفظ حافظے میں داخل ہوا ہو۔ ایک دن استاد نے غفورے کے آگے ہاتھ باندھے کہ حضور، ہم میں اتنی سکت نہیں کہ آپ کے دماغ کا ساتھ دے سکیں جو علم کے لیے بنا ہی نہیں۔ لیکن غفورے کی ماں اسے ہر حالت میں پڑھانے پر مصر تھی، اور شاید مصر رہتی کہ اچانک غفور محمد کا ناتا فوت ہو گیا۔ چالیسواں ہوئے ابھی پانچ دن ہی ہوئے تھے کہ لطف اللہ نے غفورے اور اس کی ماں کو ایک الگ جگہ رہنے کو مختص کر دی۔ اب گھر کے چھوٹے موٹے کام بھی کرنے لگا۔ مگر سیدھا کام مشکل ہی سے اس کے ہاتھ سے انجام پاتا۔ تسلیم کی خو ایسی کہ گھر کا نوکر بھی کوئی کام کہتا تو بھاگ اٹھتا۔ ظاہر ہے کند دماغ تھا اس لیے کام میں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہو جاتی، لہٰذا پھٹکاریں بھی سننی پڑتیں۔ غفورے کی ماں اندر ہی اندر کڑھتی رہتی مگر بیچاری کر کچھ نہیں سکتی تھی کیونکہ باپ مرنے کے بعد بھائی کے دروازے پر اسی طرح گزارا ہوتا ہے۔ دو تین ماہ یونہی گزرے، آخر سکول چھوڑ دیا کہ یہ اس کے بس کا نہیں تھا۔ اب ہر کوئی غفورے ہی کو کام کہنے لگا۔ غفورے، بھاگ کے جاؤ سبزی لا دو؛ غفورے، دوڑو، چکی سے آٹا پسوا لاؤ؛ کوئی کہتا، غفورے بوندھو، لینا ذرا میرے سر سے جوئیں نکالنا، اور کوئی اس سے ٹانگیں دبواتا۔ ماں اسے سب کچھ کرتے دیکھتی مگر بے بس رہتی۔ بعض دفعہ اس نے اسے کام کرنے سے روکا بھی، مگر یہ شاید ایسے کام کرنے میں خوش تھا کہ سکوں سے جان بچی ہوئی ہے۔ رفتہ رفتہ معاملہ چھوٹے چھوٹے کاموں سے بڑھ کر بڑے کاموں تک جا پہنچا۔ لطف اللہ نے زمینداری کی دیکھ بھال اور مویشیوں کا بوجھ بھی اسی کے سر پر ڈال دیا۔ گویا بے دام کا نوکر تھا کہ لطف اللہ کے ہاتھ آ گیا۔ یوں تو لطف اللہ کا ایک بیٹا محمد الیاس بھی تھا، مگر وہ بھی اپنے حصے کا کام غفورے ہی سے لیتا اور رعب الگ ڈالتا۔ بعض اوقات بڑی بے رحمی سے مارتا بھی۔ پندرہ سال کا ہوا تھا کہ ماں فوت ہو گئی، جس کی وجہ سے پندرہ بیس دن تو لوگ شفقت سے پیش آئے پھر اس کے بعد کھل کھیلنے لگے۔ اب غفورے بوندھو کے دو ہی کام رہ گئے تھے کہ ہر کسی کا حکم ماننا اور روٹی کھا کر بھینسوں کے باڑے میں ہی سو جانا۔ نوکر چاکر بھی اپنا کام اسی سے لینے لگے۔ اس قدر تسلیم کی عادت نے اسے بزدل بھی بنا دیا۔ اپنی رائے اور سوچ تو شروع دن سے ہی نہ تھی، یہاں تک کہ روٹی بھی تب کھاتا جب کوئی اُسے کہتا؛ بعض دفعہ تو فاقے ہی سو گیا۔ بھینسوں کا دودھ دوہ کر گھر پہنچاتا، مجال ہے ایک قطرہ بھی کبھی پیا ہو۔ غرض انھی صفات

اور بزدلی کی وجہ سے غفورے کا نام غفورا بوندھو پڑ گیا۔ اپنے ماموں زاد الیاس سے تو ایسے ڈرتا جیسے وہ موت کا فرشتہ ہو۔ اگرچہ یہ دونوں ہم عمر تھے مگر اس کا ہر حکم بے چون و چرا تسلیم کرتا۔ انھی حالات میں پچیس سال کا ہو گیا۔

کریماں گھر سے باہر نکلتی تو گاؤں میں ایک طوفان آ جاتا۔ کم بخت نے ناک نقشہ ایسا نکالا کہ قیامت کر دی۔ سفید کلیوں کے گجرے بالوں میں ٹانکے رکھتی، کلائیاں چوڑیوں سے بھری رہتیں اور ناک کی تھلی تو گویا چاند کے جیسی بڑی تھی۔ تھی تو ابھی کنواری لیکن طور سارے کے سارے سہاگنوں کے۔ ابھی دس سال کی ہو گی کہ باپ آسمانی بجلی گرنے سے جل مرا، لہٰذا بھتیجی کی پرورش بھی لطف اللہ کے ذمے آ پڑی۔ باپ چونکہ پچاس ایکڑ چھوڑ کر مرا تھا اس لیے نخرے سر چڑھ کر بولتے۔ لطف اللہ اور الیاس تو ایک طرف، اس نے کبھی ماں کی بھی نہ سنی۔ کبھی کسی سہیلی کے ہاں جا نکلتی اور کبھی زمینوں پر ساگ لینے۔ یہ کام تو گویا بہانے تھے، اصل میں اپنے حسن کی تشہیر تھی۔ الیاس نے پکڑ کر کئی دفعہ پیٹا بلکہ ایک دن تو مار مار کے ادھ موا کر دیا اور سر بھی پھوڑ ڈالا مگر اُدھر وہی ڈھاک کے تین پات۔ برملا کہتی، میں کسی سے دبنے والی نہیں، جو جی میں آیا کروں گی۔

آخر ایک دن لطف اللہ نے حاجی شریف سے صلاح کر کے کریماں کو غفورے بوندھو سے گانٹھ دیا۔ بیچاری بہت چیخی چلائی کہ میں ہرگز بوندھو سے نکاح نہ کروں گی۔ کریماں کی ماں نے الگ شور مچایا کہ یہ ظلم کیوں کرتے ہو، میری بیٹی کو احمق اور بدھو سے کیوں باندھ رہے ہو۔ لیکن آخر فیصلہ وہی ہوا جو لطف اللہ اور حاجی شریف نے کر دیا۔ اور بالکل اُسی دن الیاس کا نکاح حاجی شریف کی بیٹی ثمینہ سے پڑھا دیا گیا۔ یوں حاجی شریف ور لطف اللہ اور زیادہ قریب ہو گئے، ہم زلف تو پہلے ہی تھے۔

یوں تو کریماں کا اپنے باپ کی زمینوں پر حق تھا لیکن تھا وہ صرف کاغذات کی حد تک: ان پر اصل کنٹرول الیاس اور لطف اللہ ہی کا تھا۔ غفورا بوندھو بظاہر تو اب ان کا داماد تھا، مگر حقیقت میں وہ اب بھی نوکر کی حیثیت رکھتا۔ کریماں نے غفورے کے نکاح میں آنے کے بعد اوّل اوّل تو بہت سرکشی دکھائی اور غفورے کو گالی گلوچ بھی کرتی حتیٰ کہ چھتے اور ڈوئی وغیرہ سے مرمت بھی کی، پھر رفتہ رفتہ اعتدال پر آ گئی اور اسے احساس دلانے کی کوشش کی کہ وہ نوکر نہیں بلکہ اس گھر کا مالک ہے۔ مگر وہ رہا

Scanned with CamScanner

بوندھو کا بوندھو۔ اتنا بڑا ہونے کو ہوا پھر بھی الیاس سے بغیر مزاحمت مار کھاتا۔

کریماں لاکھ چلاتی کہ اپنا الگ کام کرو لیکن یہ اُن کے گھر کا نوکر۔ نکاح ہوئے دو سال ہو گئے مگر بوندھو نے ابھی تک بھینسوں کا باڑا نہ چھوڑا۔ ہاتھ پاؤں ہر وقت گوبر میں لتھڑے رہتے۔ کریماں ہفتے عشرے بعد زبردستی نہلا دیتی۔ جتنی وہ نفیس اور آرائش پسند تھی اتنا ہی یہ بدلباس اور غلیظ تھا۔ کریماں جب بھی الیاسے کو دیکھتی کہ وہ غفورے پر حکم چلا رہا ہے تو جل کے راکھ ہو جاتی اور سوچتی کہ خدا جانے کم بختوں نے کون سے تعویذ پلائے ہیں، اتنا ہٹا کٹا ہو گیا لیکن بیلوں کی طرح حکم مانتا ہے۔ اسی طرح تین سال ہو گئے۔ الیاسے کے ہاں دو بچے ہو گئے۔ ثمینہ چھاتی تان کر کریماں کے پاس سے گزرتی اور بات بات میں کچوکے لگاتی۔ ادھر یہ خالی گودی اندر ہی اندر جلتی رہتی اور غفورے کو کوستی مگر وہ برف کی طرح ٹھنڈا، جیسے کوئی روبوٹ کام کے لیے بنایا گیا ہو۔ کریماں کے پاس آتے سے بھی ڈرتا کہ کوئی کرنٹ نہ لگ جائے۔ بیچاری گاؤں کی عورتوں کے طعنے الگ سنتی۔

پھر ایک رات وہی ہوا جسے آخر ہونا تھا۔ کریماں شاکے کے ساتھ بھاگ گئی جو اسی گھر کا نوکر تھا، اور چوہدریوں کی ناک کٹ گئی۔ گاؤں میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔ حاجی لطف اللہ جو ابھی دو ماہ پہلے ہی حج کر کے آیا تھا۔ مسجد میں جانے سے ڈرنے لگا۔ الیاسے کے پاؤں کے نیچے تو گویا کوئلے آ گئے۔ وہ کبھی غفورے کو پیٹتا اور کبھی کریماں کی ماں کو کوستا کہ اُس نے کیسی ڈائن پیدا کی جو گھر کی عزت کھا گئی۔

اب غفورے نے چپ سادھ لی۔ وہ کام تو اسی طرح ہی کرتا رہا لیکن طبیعت میں ایک بے چینی اور روکھا پن در آیا۔ اب وہ بجائے باڑے میں رہنے کے گھر چلا آتا اور دیر تک چولھے کی سرد راکھ کریدتا۔ اگر کوئی بلاتا تو بالکل جواب نہ دیتا، اُٹھ کر اندر چلا جاتا اور کریماں کے کپڑوں میں منہ چھپا کر رونے لگتا۔ وہ بار بار کریماں کے سامان اور چیزوں کو ٹٹولتا اور پھر گھر سے نکل جاتا۔ اسی حالت میں کافی دن گزر گئے اور عادتیں باؤلے کی سی ہو گئیں۔ بلاوجہ مویشیوں کو مارنا شروع کر دیتا اور آہستہ آہستہ نہ جانے کیا بڑبڑاتا۔

ایک طرف غفورے کی یہ حالت تھی، جبکہ دوسری طرف الیاسے نے اپنے تمام وسائل شاکے اور کریماں کو ڈھونڈنے میں لگا دیے۔ اسے ایک ہی دکھ تھا کہ ایک تیلی اُن کی عزت کو کیسے لے گیا۔

آخر تین ماہ کی بھاگ دوڑ کے بعد دونوں کا کھوج لگ گیا۔ حویلی لکھا کے ایک گاؤں دیوا سنگھ میں جو ضلع قصور سے ڈیڑھ سو میل دور تھا، ایک چودھری کے ہاں پناہ لے رکھی تھی۔ چھاپہ مارا تو شاکا تیلی تو بھاگ گیا مگر کریماں پکڑی گئی۔ وہ اُسے گھر لے آئے۔ ماں نے کوسا، الیاسے نے مار مار کے بازو توڑ دیا۔ حاجی لطف اللہ اور حاجی شریف نے الگ سر پر عصاؤں کے وار کیے۔ رات کو کمرے میں بند کر کے تالا لگا دیا، جس کی چابی الیاسے نے اپنے پاس رکھ لی اور کریماں کے بارے میں حتمی فیصلہ کرنے لگے کہ اب اس کا کیا کیا جائے۔ پورے گاؤں میں سناٹے کا سا عالم تھا، کسی شخص کی جرأت نہیں تھی کہ کوئی بات کرے۔ الیاسے کا رعب اور دبدبہ نہ صرف سارے گھر پر تھا بلکہ گاؤں کا ہر فرد اُس سے ڈرتا۔ ہر کسی کو پتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔

اب جبکہ فیصلہ کرنے بیٹھے تو بھی حاجی شریف، حاجی لطف اللہ اور الیاس کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ نہ کسی کو اجازت تھی کہ انھیں کوئی مشورہ دے۔ کریماں کی ماں نے دو تین دفعہ اندر آنے کی کوشش کی مگر الیاس کی نظروں سے خوف کھا کر پیچھے ہٹ گئی۔

رات ایک بجے الیاس نے غفورے بوندھو کو بلایا اور کریماں کو کمرے سے باہر لا کر چل دیے۔ حاجی شریف بھی ساتھ تھا۔ کریماں کی ماں دو ہتڑ پیٹنے لگی کہ میری بیٹی کو نہ مارو، تمھیں خدا کا واسطہ ہے، اور اسے الیاس کے ہاتھ سے چھیننے لگی۔ اسی چھینا جھپٹی میں اس نے الیاس کے بازو پر کاٹ بھی لیا۔ الیاس نے دو تین تھپڑ اپنی تائی کریماں کی ماں کے بھی جڑ دیے۔ بچاری منہ کے بل زمین پر گر پڑی۔ جب کریماں کی ماں نے شور بلند کیا تو الیاس نے اسے پکڑ کر اُسی کمرے میں بند کر دیا جہاں کریماں کو بند کیا تھا، اور کریماں کو لے کر باہر ویرانے میں آ گئے۔ ایک کلہاڑی اور ایک کسّی ساتھ تھی۔ الیاس نے کریماں کے منہ پر کپڑا ٹھونس کر اور ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک طرف لٹا دیا اور غفورے کو ساتھ لے کر گڑھا کھودنے لگا۔ حاجی شریف بیٹھا دیکھتا رہا۔ جب گڑھا چھ فٹ تک گہرا کھد گیا تو الیاسے نے پکڑ کر کریماں کو اندر پھینک دیا اور غفورے کو حکم دیا کہ کسّی سے اوپر مٹی پھینکے۔ حاجی شریف بھی ہاتھوں سے مٹی پھینکنے لگا۔ کریماں کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا مگر وہ بار بار کبھی الیاسے اور کبھی حاجی شریف کو رحم طلب نظروں سے دیکھتی رہی، جس کا اُن پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا، بلکہ حاجی شریف نے اور تیزی سے مٹی پھینکنا شروع کر دی۔ غفورا بھی آہستہ آہستہ مٹی ڈالنے لگا لیکن الیاسے نے غفورے کے ہاتھ

Scanned with CamScanner

سے کسی پکڑ کر جلدی جلدی مٹی ڈالنی شروع کر دی۔ کریماں کا چہرہ مٹی میں چھپنے لگا تو اُس نے آخری رحم طلب نظروں سے غفورے بوندھو کی طرف دیکھا۔ اُسی لمحے غفورے کا ہاتھ کلھاڑی پر جا پڑا اور ایک دم الیاسے کے سر پر لوہے کا پہاڑ گر پڑا۔ اُس کے بعد حاجی شریف دو قدم بھی بھاگ نہ سکا۔ بوندھو اور کریماں نے مل کر الیاسے اور حاجی شریف کو گڑھے میں دفن کر دیا اور رات چار بجے سے پہلے جودھ پور گاؤں کی حد پار کر گئے۔

❀ ❀

شاعری

پریم وانی	میرا بائی	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کبیر بانی	کبیر	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کلیات اختر الایمان	اختر الایمان	ترتیب: سلطانہ ایمان و بیدار بخت	Rs.350
مٹی کی کان	افضال احمد سید	(کلیات)	Rs.500
رد کو کو اور دوسری دنیائیں	افضال احمد سید		Rs.50
آدمی کی زندگی	فہمیدہ ریاض		Rs.70
ساری نظمیں	ذی شان ساحل	(کلیات)	(زیر طبع)
جنگ کے دنوں میں	ذی شان ساحل		Rs.125
ای میل اور دوسری نظمیں	ذی شان ساحل		Rs.150
نیم تاریک محبت	ذی شان ساحل		Rs.100
رات	سعید الدین		Rs.50
سائے چراغ کے	احمد عظیم		Rs.150
مٹی کا مضمون	فرخ یار		Rs.150
سویرے کا سیاہ دودھ	پاکل سیلان	ترجمہ: آفتاب حسین	Rs.150
بارہ ہندوستانی شاعر	(انتخاب)	ترتیب: اجمل کمال	(زیر طبع)
خودکشی کے موسم	زاہد امروز		Rs.120

آج کے اس حصے میں ہندی کہانی کار اور ڈراما نگار اصغر وجاہت کی تین منتخب کہانیاں پیش کی جارہی ہیں۔ اصغر وجاہت 1946 میں اتر پردیش کے شہر فتح پور میں پیدا ہوئے۔ ہائی اسکول کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور پھر جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی، میں تعلیم پائی۔ 1971 میں دہلی کی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ہندی ادب کے شعبے سے وابستہ ہوئے اور شعبے کے سربراہ کے درجے تک پہنچے۔ اصغر وجاہت نے کہانیاں لکھنا اپنی طالب علمی کے دنوں سے شروع کر دیا تھا۔ ان کی کہانیوں کے انھوں نے اپنی کہانیوں کے مجموعے کا جو تعارف لکھا اس کی درج ذیل سطریں ان کے ادبی نقطۂ نظر کی اچھی وضاحت کرتی ہیں۔

''سب سے پہلے آپ سے معافی مانگ لوں کیونکہ میری کہانیاں چکنی چپڑی، سڈول، خوبصورت اور دلآویز جذبات سے شرابور نہیں ہیں۔ یہ کھردری، اوبڑ کھابڑ، الٹی سیدھی اور کبھی کبھی بھیانک نامیدی پیدا کرنے والی کہانیاں ہیں۔ اگر آپ صرف خوبصورت کہانیاں پڑھتے ہوں تو انھیں نہ پڑھیں، آپ کو مایوسی ہوگی اور مجھے بھی۔ میرے اس بیان سے یہ مطلب ہرگز نہ نکالیں کہ میں اپنی تعریف آپ کر رہا ہوں۔ ایک زمانہ تھا جب میں نے رشتوں، صرف رشتوں اور جذبات کے ٹوٹنے کی کہانیاں لکھی تھیں لیکن جلد ہی اس دور سے باہر نکل آیا۔ افراد کے باہمی رشتوں پر میری ایک کہانی 1968 میں رسالے دھرم یُگ میں چھپی تھی اور اس وقت دھرم یُگ کے مدیر دھرم ویر بھارتی نے اسے پسند کیا تھا۔ دوسری کہانی جو انھیں بھیجی وہ زمینی حقیقت کی کہانی تھی۔ بھارتی جی کا جواب آیا تھا کہ اس نئی کہانی میں پرانی کہانی جیسی خوشبو نہیں ہے۔ یہ اشارہ تھا کہ میں 'خوشبودار' کہانیاں لکھا کروں۔ پر پتا نہیں کیا تھا اور ہے میرے اندر کہ میں 'خوشبودار' کہانیاں لکھ ہی نہیں، پڑھ بھی نہیں سکتا۔ اگر مجبوری میں 'خوشبودار' کہانی سننی پڑتی ہے تو میرا دماغ اپنے آپ بند ہو جاتا ہے اور اپنے اوپر شرم آتی ہے۔''

اصغر وجاہت کی ایک معروف اور نہایت عمدہ کہانی ''کیک'' ہندی کہانیوں کے اس انتخاب میں شامل تھی جسے شمارہ 18 میں پیش کیا گیا اور بعد میں کتاب کی صورت میں شائع کیا گیا۔ ان کی جو کہانیاں موجودہ انتخاب میں شامل ہیں ان میں بھی کرداروں کے سماجی اور نفسیاتی خدوخال کا ویسا ہی سفاک لیکن ہمدردانہ بیان ملتا ہے۔ یہ اسلوب اس سماجی اور سیاسی نقطۂ نظر کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا جو کسی معاشرے میں رہتے بستے انسانوں کی زندگیوں سے وابستگی کو مرکزی اہمیت دیتا ہے۔

اصغر وجاہت

ہندی سے ترجمہ: رحمٰن مصور

اُوسر میں ببول

آدھی رات کے بعد نکلی پیلی اور مٹیالی چاندنی میں پیپل کے پیڑ کی چھایا بہت ڈراونی لگ رہی تھی۔ چاندنی میں پتے ہوا کے ہلنے کے ساتھ چمکتے تھے اور ڈالوں کے ایک دوسرے سے رگڑنے سے سرسراہٹ جیسی آواز آتی تھی، جیسی سانپوں کی بانبی سے آیا کرتی تھی۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی، لیکن بیرو کو پیپل کی پھنگی پر بیٹھا ہوا دل ہی دل میں نمبری کو گالیاں دے رہا تھا۔ اس وقت اسے پیپل کے اس پیڑ سے وہ ڈر بھی نہیں لگ رہا تھا جو شام کے وقت سے ہی اس کے پاس سے نکلنے میں لگا کرتا تھا۔ کسی نے کبھی کچھ دیکھا تو نہیں تھا، لیکن گاؤں کے سب ہی لوگ کہتے رہتے تھے کہ اس پیپل کے پیڑ پر براج بابا لگتے ہیں۔ براج پہلے بابا نہیں تھے، صرف ایک آدمی تھے اور اسی گاؤں میں ان کی دو بیگھے زمین تھی۔ نمبری کے باپ نے آج سے تیس سال پہلے پتا نہیں کیا چال چلی، کاغذوں کو کس طرح سے، کتنا وزنی بنا کر اور کس ہنر سے گھمایا کہ براج کے دو بیگھے کھیت نمبردار کے ہو گئے اور سات سال تک کچہریوں کے چکر کاٹ کاٹ کر ایک دن اپنے مقدمے کا فیصلہ سن، جب براج گاؤں لوٹے تو اگلے دن صبح اسی پیپل کی ایک ڈال سے گاؤں والوں نے ان کی لاش جھولتی ہوئی دیکھی۔ اسی دن سے ایسا مانا جانے لگا کہ اس پیپل پر براج لگتے ہیں۔ مگر براج کو براج بابا بننے میں کوئی زیادہ دیر نہیں لگی۔ یہ اس لیے کہ براج نے کسی کو کبھی ستایا نہیں۔ ہاں، اکثر لوگوں سے، انھیں کے مطابق، چلم مانگ لیا کرتے تھے۔

گاؤں کے لونڈے اور انھی کی دیکھا دیکھی سڑکو بھی اس پیپل کے پیڑ کے نیچے سے شام کو نہیں گزرتا تھا۔ رات میں تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ لیکن آج وہ نمبری کی مار کھانے کے بعد چھپتا ہوا آیا اور اس پیڑ پر چڑھ گیا۔ شام کا جھٹپٹا ہو گیا تھا اس لیے کوئی چڑھتے نہ دیکھ سکا۔ لیکن گاؤں بھر میں اس کے نام کی پکار کافی رات تک لگتی رہی۔ اس کا باپ کئی بار ''سڑکو! سڑکو!'' چلاتا ہوا اس پیڑ کے نیچے سے گزر گیا۔ کئی بار اس نے گاؤں کے دوسرے لوگوں کی آواز سنی۔ لالٹین کی روشنی اور لاٹھیوں کی کھٹ کھٹ بھی سنی، لیکن کچھ بولا نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ اسی کو کھوج رہے ہیں، لیکن چپ رہا اور لگاتار دھیرے دھیرے نمبری کو گالیاں دیتا رہا، کوستا کاٹتا رہا۔ جب گالیاں ختم ہونے لگتیں تو وہ ان کو پھر دہرانے لگتا اور جب گالیاں بکتے بکتے تھک جاتا تو اپنے سوجے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرتا اور نمبری کے جوتے سے کٹے اپنے ہونٹ کو چھوتا تو ایک سہرن سی اندر تک دوڑ جاتی۔ کچھ دیر کے بعد پھر گالیاں بکنا شروع کر دیتا۔ اسے سب سے زیادہ غصہ اسی بات پر تھا کہ غلطی اس کی نہیں تھی، لیکن نمبری نے اسے سینکڑوں گالیاں دے ڈالیں اور پھر کئی بار سر سے اونچا اٹھا اٹھا کر پٹکا، اس کے سر پر آٹھ دس جوتے مارے اور پھر گالیاں دیتا ہوا اپنے گھر چلا گیا۔

گاؤں کے بہت سے لوگ کھڑے دیکھ رہے تھے: ان میں وہ لونڈے بھی تھے جو سڑکو کے ساتھ جانور چرایا کرتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد سڑکو کا باپ بھی آ گیا تھا لیکن اس کے آ جانے کی وجہ سے نمبری کے ہاتھ اور زبان اور تیزی سے چلنے لگی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس کا باپ بھی سالا حرامی ہے اور یہ بھی حرامی ہے۔ سالا آج پھر جانوروں کو اُدھر میں ہانک لے گیا تھا۔ ایسی اور اسی طرح کی دوسری باتیں سن سن کر سڑکو کا بابو بے شرمی سے اس طرح ہنس رہا تھا جیسے نمبری کی بات کو صحیح بتا رہا ہو۔ سڑکو کو ہمیشہ اپنے بابو پر غصہ آتا ہے، لیکن اس وقت اتنا غصہ آ رہا تھا کہ وہ بتا نہیں سکتا تھا۔

''کیوں بے سالے مادر چود، حرام کے جانور ہیں جن کو اپنی لتاں کی اُس میں لے جا کے کھڑا کر دیتا ہے؟ ابے حرامی کی اولاد، ادھر میں ایک تنکا تو ہوتا نہیں۔ وہاں کیوں لے جاتا ہے جانور؟ سالوں کو بھوکا مارنے کے لیے؟ لے بے سالے، اور لے!''

دکھو اور رموا اس کی پٹائی ہوتے دیکھ کر ہنس رہے تھے، کیونکہ آج وہ ان سے گولی جیت گیا تھا۔ گھاس کا بوجھ اٹھائے رمئی کا کا آیا اور نمبری سے بولا، ''اور دو ئی چار ہاتھ لگا دیو سالے کا نمبری۔ آج

Scanned with CamScanner

کل کے لونڈے سالے سوہدا ہیں سوہدا۔"

نمبری اس کی کٹائی کرتا رہا، لیکن اس نے سسکی تک نہیں لی۔ اس کا بابو دور کھڑا کھیسیں نپورتا رہا۔ نمبری جب سڑکو کو مار کر گھر کی طرف چلا تو سڑکو کا باپ اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔

سورج نکلنے والا تھا۔ سڑکو نیچے اتر آیا۔ گھر میں گھسا تو کوئی نہیں تھا۔ وہ سیدھا روٹی کی ڈلیا کے پاس گیا اور رات کی بچی ایک روٹی کو جلدی جلدی کھانے لگا۔ پانی پیا اور گز مڑیا کے سو گیا۔ اٹھا جب اس کا بابو گھر میں گھسا۔

"کیسے سالے پڑے سووت ہو۔ آج نمبری کے چہ پاندھے کے بند ھےدو گے۔"

اس نے بابو کی طرف نفرت اور بے پروائی سے دیکھا۔ دبلا پتلا کالا جسم، دھنسی ہوئی آنکھیں، پتلے پتلے ہونٹ اور چپٹی ناک، بچی اونچی بندھی دھوتی اور سلوکا۔

وہ ڈھیرے سے اٹھا اور بابو کی بات کا جواب دیے بغیر باہر نکل گیا۔

بابو کیا نمبری سے کچھ نہ کہہ سکتا تھا؟ روک تو نہ سکتا تھا، پر کیا اور کچھ نہ کہہ سکتا تھا؟ ٹوکتا نہ تو کیا ہو جاتا؟ یہ سب باتیں اس کے من میں اٹھ رہی تھیں اور وہ بابو سے اور زیادہ نفرت کرنے لگا۔

شروع سے ہی بابو ایسا ہے — جیسے گوبر کا چھوت۔ دو تین سال ہوئے، جاڑے کی رات تھی۔ بابو کے پاس وہ سو رہا تھا۔ دوسری طرف اماں لیٹی تھی۔ اچانک رات میں اس کی آنکھ کھلی تو وہ ڈر گیا۔ ڈھیرے ڈھیرے دیکھا تو کچھ سمجھ میں نہ آیا نمبری اس کے گھر میں کیسے آ گیا، اور بابو کہاں چلا گیا۔ اس نے دیکھا نمبری اس کی اماں کا گلا دبائے دے رہا ہے۔ اماں نیچے پڑی کسمسا رہی تھی۔ دیے کی روشنی میں نمبری کا چہرہ لال ہو رہا تھا۔ نیچے پوال بچھا تھا۔ پوال چر چرا رہا تھا۔ اماں ہاتھ پیر پھینک کے تھک گئی اور نمبری ویسے ہی اس کا گلا گھونٹتا رہا۔ سڑکو چپکے سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔ باہر چھپر کے نیچے بابو سو رہا تھا۔

"بابو، ہے بابو!" بابو ہڑبڑا کے اٹھ گیا تھا۔

"کیا ہے بے؟"

"نمبری اماں کا مارے ڈال رہا ہے۔"

بابو نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ "سو جا بے، اول فول نہ بکا کر۔"

Scanned with CamScanner

"کسی کہت ہن بابو۔ دیکھ لیو اندر۔۔۔"

"سو جا بے۔" بابو نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس گھسیٹ لیا اور پیر کے نیچے اسے دبا لیا۔ پھر اس نے بابو کے خراٹے سنے۔ دھیرے دھیرے سڑکو نے بابو کا پیر کھسکایا اور اٹھ کر دروازے کی جھری میں آنکھیں لگا دیں۔ اماں گلاس نبری کو دے رہی تھی۔ اچھا تو نبری ہمارے ہاتھ کا کھا لیتا ہے؟ اسے یہ دیکھ کر بہت زیادہ خوشی ہوئی تھی۔۔۔ وہ چاہتا تھا کہ بابو کو جگا کے دکھا دے۔ لیکن پھر اس نے سوچا نہیں، بابو نہ جانے کیا کہے، اور وہ بابو کے پاس آ کر پھر سو گیا۔ صبح روٹی کھاتے وقت اس نے بابو سے کہا، "بابو، نبری ہم چھمن کے ہاتھ کا کھا لیتا ہے۔ رات میں اماں اُوکا گلاس۔۔۔" اس کی اماں نے گھونگھٹ کاڑھ لیا اور بابو نے اسے ایسا تھپڑ مارا کہ روٹی اس کے ہاتھ سے دور جا گری۔ وہ چلا چلا کر رونے لگا۔

"سالا حرامی، سسر کم جات!" بابو اسے گالیاں دینے لگا۔ "لاگت ہے سالا جوکن مروائی۔ سالے کھوتو سے کہہ دیہو، جوتا مار مار کے لست کر ڈالبے۔"

یہ تو کئی سال پرانی بات ہے۔ اس زمانے میں تو روز ہی رات کو وہ اپنی اماں کی سسکیاں اور نبری کی ہنسی کی آواز سنا کرتا تھا، لیکن اس کے بعد اس نے یہ بات کسی سے نہیں کہی۔ جس رات یہ سب ہوتا اس صبح وہ اپنی اماں کے چہرے پر دانتوں کے نشان اور ناخن کے کھرونچے بھی دیکھنے کا عادی ہو گیا۔

نبری جب بھی رات میں اس کے گھر میں گھستا تو پورا گھر تیکھی تیکھی بو سے مہک جاتا۔ گوبر اور چکنی مٹی سے لپی پتی کوٹھری کے چھوٹے سے دروازے میں نبری کا پورا جسم پھنس جایا کرتا تھا۔ وہ ٹیڑھا ہو کر اندر چلا آتا۔ سڑکو کا بابو اسے دیکھ کر ایسا چپ ہو جایا کرتا تھا اور اس طرح کھیں کھیں کرنے لگتا تھا جیسے آدمی نہیں آٹے کا پیڑا ہو۔ سڑکو کی اماں گھونگھٹ نیچے تک کھینچ لیا کرتی تھی۔ نبری کو دیکھتے ہی سڑکو کا باپ سڑکو کا ہاتھ کھینچتا باہر چھپر کے نیچے آ بیٹھتا تھا اور سڑکو کو ٹانگوں کے بیچ داب کر سلا لیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی اندر سے نبری کی آواز آتی: "اے سڑکو، بیڑی لے آ۔" سڑکو کا باپ تیر کی طرح اٹھتا تو سڑکو بھی چپکے سے اس کے پیچھے پیچھے ہو لیتا۔ چھپر تلے اندھیرا ہونے کی وجہ سے سڑکوا سے دیکھ نہ پاتا تھا۔ کوٹھری کا کواڑ کھلتا۔ اندر سے روشنی کی ایک چھوٹی سی لکیر باہر آتی۔ نبری ایک روپے کا نوٹ سڑکو

کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ سڑکو دیکھتا، اندر اس کی اماں دروازہ کی طرف پیٹھ کیے پڑی ہے اور کوٹھری سے تیکھی تیکھی بدبو آ رہی ہے۔ پھر کوٹھری کا دروازہ چرچرا کے بند ہو جاتا اور اندر سے ایسی آوازیں آنے لگتیں جیسے نمبری سڑکو کی اماں کی گڑی گڑی توڑے دئے رہا ہو۔ بیچ بیچ میں چوڑیاں کھنک جاتیں یا کوئی دبی دبی سی سسکی اور نمبری کی ہنسی سنائی دے جاتی۔

اسے رات میں دیر تک نیند نہ آتی، جبکہ بابو جلدی ہی خراٹے لینے لگتا تھا۔ وہ سوچتا کہ نمبری اس کے گھر کیوں آتا ہے؟ بابو کچھ کیوں نہیں بولتا۔ نمبری اماں کو کاہے مارتا ہے؟ کام تو اماں جی توڑ کر کرتی ہے۔ دن بھر دوگلا اُلجھاتی ہے۔ اناج ہناتی ہے نمبری کا۔ کاٹتی، گوڑتی، نراتی، اوساتی ہے۔ پھر کاہے نمبری اسے مارتا ہے؟ اس نے ایک دن اماں سے پوچھا "نمبری کاہے کو آوت ہے؟"

اس کی اماں کے چہرے پر گھبراہٹ آ گئی۔ وہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔ سڑکو جانتا ہے، یہ بات اگر اس نے بابو سے پوچھی ہوتی تو تھپڑ پڑ جاتا۔

"تمھارا بابو اُد کا ہلواہا ہے۔ اُد کے پاس سے کھانے کا ملتا ہے۔" اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گئی تھی۔

اس کی ماں کم بولنے اور اس کے بابو کی بات ماننے والی ایک ناٹے قد اور بھرے بھرے جسم والی عورت ہے۔ سب کام سر جھکا کر اور بنا کچھ بولے کرتی رہتی ہے۔ اس کی چھوٹی سی ناک کچھ پھولی ہوئی ہے۔ آنکھیں کچھ اندر کو دھنسی ہیں۔ رنگ بالکل گیہوں کے رنگ جیسا ہے اور بال چکنے رہتے ہیں۔ سڑکو اماں ہی کو مانتا ہے، اسی کو چاہتا ہے اور اسی کے کام میں ہاتھ لگواتا ہے۔ بابو تو اسے جب دیکھو دھڑام سے جھاپڑ مار دیتا ہے۔

وہ سب باتیں جو سڑکو کی سمجھ میں دو تین سال پہلے نہیں آتی تھیں اب آنے لگی ہیں۔ جب سے اس نے نمبری کے جانور چرانا شروع کیے ہیں وہ چرواہوں سے سب پوچھتا ہے اور وہ اسے بتاتے ہیں۔

شروع شروع میں اسے شرم آتی تھی۔ پھر اسے غصہ آنے لگا۔ سب سے زیادہ اپنے بابو پر، پھر نمبری پر اور پھر گاؤں والوں پر۔ وہ لڑنے لگا اور پٹنے لگا۔ لیکن اس نے لڑنا نہیں چھوڑا۔ جب بھی اسے کوئی پیٹتا، وہ رات میں جا کر اس کا کھیت اجاڑ ڈالتا۔ وہ زہر دینے کی بھی سوچا کرتا تھا۔ پر زہر ملے کہاں؟

ایک دن جبرو سے اس کی خوب لڑائی ہوئی۔ جبرو اس سے بڑا ہے۔ وہ بھی اپنے جانور چرانے

Scanned with CamScanner

آتا ہے۔ جمرو نے گولی کھیلتے کھیلتے سڑکو سے کہا، "ابے، توری اماں تو نمبری کی رکھیل ہے رے۔" سب لونڈے چیخنے لگے۔ سڑکو جمرو سے بھڑ گیا۔ جمرو نے اسے ہرا دیا، لیکن وہ بھی آخری دم تک لڑتا رہا۔ اس واقعے کے بعد کسی لونڈے نے اس کی ماں کے بارے میں یہ نہیں کہا تھا۔ ہاں، گاؤں کے دوسرے لوگ اکثر چھیڑ دیتے اور اسے غصہ آ جاتا، پر وہ ان سے لڑ نہیں سکتا تھا۔ ایک دن وہ اپنی اماں کو آواز دے رہا تھا تو بڑکو نے ہنس کر کہا، "ابے وہ نمبری کے گھر میں ہوگی۔"

اسی طرح کی اور بھی باتیں سن سن کر اسے اپنے بابو پر غصہ آتا تھا۔ کیوں نہیں روکتا اماں کو، کیوں نہیں روکتا نمبری کو؟ سالا چھوت کا چھوت! اور وہ اونگی لے کر جھاڑی کو بری طرح پیٹنے لگتا۔

اُدسر میں جانور چر رہے ہیں۔ اُدسر میں ایک تنکا نہیں اُگتا۔ جو گھاس برسات میں نکلتی ہے وہ گرمی میں جل جاتی ہے۔ تین سو بیگھے کے اودسر میں اکا دکا ببول کے پیڑ کھڑے ہیں۔ رحمت کہتا ہے، "ابے یہ ببول تو ہوتا ہی اُدسر میں۔ بڑی مضبوط لکڑی ہوتی ہے اس کی۔ بڑی ہی مضبوط۔ اس کی چھال بڑے کام آتی ہے۔ چمڑا رنگا جاتا ہے۔ اور ببول کبھی آندھی میں نہیں گرتا۔ ابے کانٹے ہوتے ہیں، پھل پھول بیکار ہوتا ہے تو کیا، اور کام تو آتا ہے۔ ابے کم سے کم ہرا ہا چرانے والے اس کی چھاؤں میں سستا تو لیتے ہیں۔"

گرمی میں لو ایسی چلتی ہے کہ پورا اُدسر سفید ہو جاتا ہے۔ سن سن کی آواز بھر سنائی دیتی ہے۔ مٹی اور دھول کے ساتھ چھوٹی چھوٹی پتیاں ہوا کی نچوئی میں دیر تک ناچتی رہتی ہیں۔ رحمت بابا کہتا ہے، "دیکھو، بھتنی جا رہی ہے۔"

"کاکا، بھتنی دوپہر کا کاہے نکلتی ہیں؟"

"اکیلے دُکیلے آدمی کا ڈرانے کے لیے۔" سب چرواہے لونڈے ببول کے پیڑ کے نیچے جمع ہو کر گولی کھیلنے لگتے ہیں۔ رحمت بابا اپنے سر کے نیچے اینٹ رکھ کر سو جاتا ہے۔ اس کی ایک مونچھ ٹیڑھی ہو کر منہ میں گھس جاتی ہے۔

رمسوا اور سڑکو نہر پر پانی پینے جاتے ہیں۔ رمسوا جانتا ہے کہ سڑکو نمبری سے چڑتا ہے۔ دونوں نے کئی بار مل کر نمبری کی شکر قند اکھاڑی ہے، کبھی مٹر کی پھلیاں کھا گئے ہیں۔

"چلو نمبری کی اوکھ اکھاڑی جائے۔"

"آؤ۔" دونوں نبسری کے کھیتوں کی طرف گئے۔ لو اتنی گرمی چل رہی ہے کہ کسی کے باہر نکلنے کی ہمت نہیں ہے۔ چٹاک چٹاک کی آوازوں کے ساتھ اوکھیں ٹوٹنے لگیں۔ "پورا بوجھ نہ بناؤ،" رموا نے سڑکو سے کہا۔

پر سڑکو رکا نہیں۔ وہ ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری اوکھ توڑتا گیا۔ اسے بڑا مزہ آرہا تھا۔ کھیت نبسری کا ہے نا۔ لے سالے، اور مار! اس نے چار چھ اوکھیں اور توڑ ڈالیں۔

"اب بیا شاوت نہ بنی،" رموا نے اس سے کہا۔

"تو کا بھوا، تمھار گاڑے کا کھلا دیے۔"

"بس کر بے بس!" لیکن سڑکو نہیں رکا۔ اسے اوکھ اکھاڑنے میں بڑا مزہ آرہا تھا۔ وہ ہنس رہا تھا، خوش ہو رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر پسینہ تھا، ہاتھ بھی کٹ گیا تھا، لیکن وہ خوش تھا۔ دونوں اوکھیں لے کر کھیت سے باہر بھاگ آئے۔

اسی طرح سڑکو نے نبسری کی شکرقندی اجاڑی تھی اور آلو تو وہ نبسری کے کھیتوں سے کھایا ہی کرتا تھا۔ اسے معلوم تھا جب بھی کبھی وہ پکڑا جائے گا نبسری اس کی ہڈی پسلی ایک کر ڈالے گا۔

دونوں پھر ببول کے پیڑ کے نیچے آکر بیٹھ گئے۔ رحمت بابا جاگ گئے تھے۔ رحمت بابا سے سڑکو نے پوچھا، "بابا، کوئو آدمی دھتورا کھالے تو پاگل ہوئی جائی؟"

بابا نے کہا، "اب لنگو اہیر نہیں پگلا گوا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کوئو ڈشنی میں دھتورا کے بیج پیس کے کھلا دیس رہے۔"

لنگو اہیر گاؤں کا اکیلا پاگل ہے۔ دھتورے والی بات بھی سب کو معلوم ہے۔ لنگو اہیر دن بھر کھیت کی میڑوں پر "لپام لپیٹ، لپام لپیٹ" کہتا گھومتا رہتا ہے۔

"اچھا کاکا، دھتورا کے بیج بئل کا کھلا دیو تو بئل پاگل ہوئی سکت ہے؟"

"ہو۔"

سڑکو کی آنکھیں چمک آئیں۔ وہ دو دن سے یہی سوچ رہا تھا کہ نبسری کے بیلوں کو دھتورے کے بیج کھلا دے۔ اسے معلوم ہے، گاؤں کے تالاب کے پاس دھتورے کے پیڑ کھڑے ہیں۔ لیکن توڑنا پڑے گا چھپ کے، ایسا نہ ہوئے کہ کوئی دیکھ لے اور... دھتورے کے بیج پیس کے آٹے کے

ساتھ... نہیں، گڑ کے ساتھ ملا کر کھلا دیا جائے بیلوں کو۔ مزہ آ جائی۔ نبری سسرا دو ہزار کی لاد ا ہے جوڑی۔ دونوں پاگل ہوئی جائیں، پھر علاج کو ہوئی؟ جب للو ہیر "لہام لپیٹ" کہتا گھومتا رہتا ہے اور آج تک ٹھیک نہ ہو سکا تو بیل کیا ٹھیک ہوں گے۔ اس نے دل میں طے کر لیا کہ رات میں دھتورا توڑے گا۔

شام کو جانور گاؤں کی طرف لے جاتے ہوئے اس نے دیکھا بھی کہ تالاب کے پاس دھتورا خوب لگا ہے۔ وہ خوش ہو گیا اور اس نے گانے کی تان ماری: "کہب بھورا ما، جلم بھورے... "

سڑکو گھر آیا تو بابو کھرپی کا بینٹ ٹھیک کر رہا تھا۔ اماں چولھا جلا رہی تھی۔ سڑکو نے بابو کو نظر انداز کیا نفرت سے دیکھا اور کوٹھری کے اندر ساونگی رکھنے چلا گیا۔

"پیسہ نہیں دِہس نبری؟" سڑکو کی اماں بولی۔

"نہیں، کہت رہا ابھی نہیں ہے۔" بابو نے جواب دیا۔

"پیسہ نہ دِہس تو ہمار دوائی نہ آ پائی۔"

"نہ آ پائی تو نہ آ پاوے۔"

سڑکو اپنے بابو کو گھورتا ہوا باہر نکل گیا۔ پیسہ، پیسہ — کہاں سے لے آوے پیسہ۔ کہیں چوری کرے؟ چوری؟ پر وہ تالاب کی طرف نکل گیا اور دھتورے کے بیج جمع کرنے لگا۔ وہاں سے لوٹ کر آیا تو سب سو چکے تھے۔

سڑکو کا باپ نبری کی ہلواہی کرتا ہے۔ سڑکو نبری کے جانور چراتا ہے۔ وہ سڑکو کی اماں کو کئی بار سمجھا چکا ہے: "سالا بھوکھا مر جائی۔ اتی عمر میں ہم جوتنا سیکھ لیا رہے۔ یہ سسر کا سیکھت ہے؟ کچھ نہیں۔"

"اے وہ دیکھو وہ... نبری کے بیل۔" رموا نے سڑکو کو دکھایا۔ سڑکو نے دیکھا، نبری کے گاڑی میں جتے بیل اوسر میں گاڑی لے کے بھاگ رہے ہیں، کبھی ادھر، کبھی اُدھر۔ لمبا چکر کاٹ رہے ہیں۔ خوب گرد اڑ رہی ہے۔ گاڑی میں گڑ بھرا ہے۔ نبری گاڑی ہانک رہا ہے۔ بیل ناتھ تڑا لیے ہیں، بھاگ رہے ہیں اوسر میں۔ نبری گاڑی میں کھڑا ہو گیا ہے۔ بیلوں کو جتنا پچکارتا ہے، وہ اتنی تیزی سے بھاگتے ہیں۔ اوسر کے چکر کاٹ کے بیل گاڑی سمیت نبری کی چری میں گھس گئے۔ پورا کھیت

روندڈالا۔

سرکوا اچھل پڑا۔ "رموا دیکھ، نمبری کے بیل بورا گئے۔"

"کسے؟"

"ہم ان کا دستورا کا ج کھلوا رہے، پرسوں!" سرکو خوشی میں اپنی لاٹھی بھانجنے لگا۔

بیل ابھی بھی اُدھر میں دوڑ رہے ہیں۔ پھر وہ گاڑی کو لے کے تلیا کی طرف سیدھے بھاگے چلے آئے۔ "ہوئے ہوئے! بچ بچ!" نمبری روک رہا ہے، پر بیل گاڑی لیے تلیا کے پانی میں اترتے چلے گئے۔

"گز کوا سالے کا مادر چود!" سرکو پھر لاٹھی بھانجنے لگا۔ رحمت کاکا کے ساتھ سب چرواہے لونڈے تلیا گئے۔ پوری گاڑی پانی کے اندر چلی گئی تھی۔ نمبری پانی سے باہر نکل رہا تھا۔

"کا بھوا نمبردار؟" رحمت کاکا نے پوچھا۔

"کا جانے کا بھوا۔ سسر بیل بچکیا گئے۔ بازار جائے کے کھاتر گاڑی ما گُور رکھا رہے۔" نمبری پانی میں بھیگ گیا ہے۔ بیل پانی پی رہے ہیں۔

"پیاسے رہیں کا؟"

"ناہیں، سبیرے سے مڑھکو پانی پلا دہس رہے۔"

"پھر کا بات ہے؟"

"جا بے، مڑھکو کا بلا لا۔ ہزار روپئی ہزار گئے۔ بیل نہ ٹھیک بھئے تو اور ہانی۔"

سرکوا اچھلتا کودتا اپنے باپ کو بلانے چلا گیا۔ گاؤں کے اندر وہ چلاتا ہوا گھسا۔ "بابو رے، بابو، اے بابو، جلدی چلو رے۔ نمبری کے بیل بورا گئے۔"

کئی لوگوں نے اس سے راستے میں پوری بات پوچھی اور اس نے مزہ لے لے کر سب کو بتایا۔ بہت سے لوگ تماشا دیکھنے ادھر کی طرف نکل گئے۔ گاؤں کے لونڈے تو پہلے ہی دوڑ لیے۔

سرکوا دھر کے پاس والی تلیا میں آیا تو بھیڑ لگ گئی تھی۔

"مڑھکو پہلے تو بیل کھول دے۔ او کے بعد گاڑی باہر نکالے کے لیے گاؤں سے دوئی جوڑ بھینسا لے آ۔"

مرهکو نے گاڑی کو تالاب میں دیکھ کر کہا: "بڑی ہانی ہوئی گئی نمبردار۔"

سڑکو کو اپنے بابو پر پھر غصہ آیا۔ "کا ہے کی ہانی؟ کون تمہارا مال ہے؟ پر اکی آدت پڑ گئی ہے بڑ بڑ کرے کی!"

"دیکھ مرهکو، بیل نکالے سے پہلے گاڑی ما کو نے تھونی لگا دیو۔ نہیں تو جون گھڑو بچا ہے وہو ہاتھ سے جائی۔"

"ہوؤ مالک، ہوؤ۔"

اتنا کہہ کر نمبری گاؤں چلا گیا۔ تماشے والوں کی بھیڑ تھوڑا چھٹ گئی۔ سڑکو نے تان ماری،

"کجب بھورا را...."

"چپ رہ بے" مرهکو نے سڑکو کو ایک جھاپڑ مارا۔ "جب دیکھو سسرا آوارن کی طرح تان مارتا ہے۔ جا ایک ٹھو تھونی لے آ۔"

"ہم نہ جائی بے!" سڑکو اکڑ گیا۔

مرهکو نے اس کے دو تین جھاپڑ مارے۔ سڑکو کو غصہ تو بہت آیا پر دبا گیا۔

تھونی لا کر مرهکو نے گاڑی میں لگائی اور بیل کو کھول دیا۔ بیل تالاب سے نکل کر پھر ادھر میں دوڑنے لگے۔ رحمت کا کا نے کہا: "ابے مرهکو، بیلوں کو گرمی چڑھ گئی ہے۔ ان کی دوا دارو کرواؤ، نہیں تو مرجئی ہیں۔"

"ہوؤ دادا، ہوؤ۔" مرهکو نے سڑکو سے کہا: "دیکھ بے، گاڑی کے پاس کھڑا رہ۔ ہم گاؤں جات ہن ڈاگر لائے۔"

بھیڑ چھٹ گئی تھی۔ سڑکو اور رموا گاڑی کے پاس رہ گئے۔

سورج ڈوب رہا تھا اور ہوا رک گئی تھی۔ سڑکو نے زور کی تان ماری "... جلم بھورے..."

پھر اچانک اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"رموا۔"

"ہوؤ۔"

"تھونی ہٹا دی جائے تو پوری گاڑی تالاب میں ڈوب جائی،" سڑکو بولا۔

Scanned with CamScanner

"ہوئی۔ پڑنہ گیا۔ نبری ماری۔"

"کسی دیے اپنے سے گرگئی۔" مڑکو پانی میں گھس گیا اور زور لگا کے تھونی گرادی۔ تھونی کے گرتے ہی پوری گاڑی پانی کے اندر چلی گئی۔ بڑے بڑے بلبلے اٹھنے لگے۔ مڑکو باہر نکل آیا۔ رسوا ڈر کر بھاگ گیا۔ مڑکو تالاب کے کنارے بیٹھ گیا۔

"کا ہے، یہ کا کہس؟" مڑھکو نے دیکھا گاڑی پانی میں پوری ڈوب چکی ہے۔ ایک ایک بچا ڈنڈا ابھر دکھائی دے رہے ہیں۔

"کا کیا؟ کچھ نہیں۔"

"گاڑی کسے ڈوب گئی؟"

"ہم کا کا مالوم؟ تھونی کھسک گئی ہوئی۔"

مڑھکو اس کے پاس آگیا۔ گھور کر دیکھنے لگا۔

"سسر حرامی کے پلے، ستیاناش کر دیو۔ تمھیں ہٹائے ہو تھونی۔"

"نہیں ہم نہیں ہٹاوا۔" مڑکو پیچھے ہٹنے لگا۔

"تورنج گیلی ہے پیچھے سے... گسار ہے پانی ما؟"

"ناہیں۔"

مڑھکو نے اسے ایک زور کا جھاپڑ مارا۔ وہ سیدھا زمین پر گر پڑا۔ اس نے مڑھکو کی طرف دیکھا پھر جلدی سے اٹھ پڑا۔ اپنی لاٹھی سنبھالی اور مڑھکو کے سر پر دے ماری۔ "ہچاک!" پھر لاٹھی اٹھائی اور "ہچاک"، پھر "ہچاک"۔ مڑھکو کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ مڑھکو کے پیر کانپ گئے۔ خون بہہ رہا تھا۔ مڑکو بھاگا۔ تین سو بیگھے کے اُدھر کا چکر کاٹ کر وہ گاؤں میں گھس گیا۔

مڑھکو بیٹھ گیا۔ خون اس کے چہرے پر پھیل گیا تھا۔ سورج ڈوب رہا تھا اور اس کی روشنی میں تالاب کا پانی پیلا پیلا ہو گیا تھا۔

❀❀

اصغر وجاہت

ہندی سے ترجمہ: رحمٰن مسعود

ساری تعلیمات

ہر تین چار سال کے بعد شہر میں فساد ہو جاتا ہے۔ ڈھاٹے باندھے ہوئے، "ہر ہر مہادیو" کا نعرہ لگاتے ہوئے ہندوؤں کے گروہ مسلمانوں کے محلے پر حملہ کرتے ہیں اور مسلمان ہندوؤں پر جہاد بول دیتے ہیں۔ آگ لگائی جاتی ہے جو ہولی، عید ملن، ایکتا کے اصولوں اور فرقہ واریت مخالف کمیٹیوں کی کاغذی دیوار کو بھسم کر دیتی ہے۔ دو چار دن تک گروہ حرکت میں رہتے ہیں، تیزاب، چاقو، لاٹھیاں، بلّمے اور ایک آدھ بندوق، دیسی کٹّے لیے دشمن کی کھوج میں۔ صرف ایک آدھ آدمی، عورت یا دکان ہی نظر پڑتی ہے جس کا فوراً فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ قاسم پورے میں افواہوں کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ "آج رات دو ہزار ہندو حملہ کرنے والے ہیں۔" محلے کے لڑکے اپنی اپنی چھتوں پر اینٹیں جمع کرنے لگتے ہیں۔ "آج پولیس نے ماسٹر رحمت علی کا گھر جلا دیا۔" "جھوٹ؟ کیا بکتے ہو؟" "خود نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔" "یہی تو گڑبڑ ہے میاں، پولیس بھی ان کا ساتھ دیتی ہے، نہیں تو ان دھوتی باندھے والوں کو تو ایک گھنٹے میں ٹھیک کر دیں۔ لیکن سرکار سے کون لڑ سکتا ہے؟" قاسم پورہ، نواب گنج، رحمت آباد میں مسلمانوں کی سو فیصدی آبادی ہے۔ لیکن پورے شہر میں پھر بھی ہندو زیادہ ہیں۔ اگر بلّہ بول دیا تو کیا ہوگا؟ موت کا ڈر محلے کی رگ رگ میں چٹک جاتا ہے۔

سڑکیں اوسر کی طرح سنسان ہو جاتی ہیں۔ پولیس کے جوتوں اور سیٹیوں کی آوازوں کے سوا کچھ نہیں سنائی دیتا: کبھی کبھی پولیس جیپ کی آواز آتی ہے اور پھر سناٹا چھا جاتا ہے... "بڑے پل کے

پاس مسلمان کی لاش ملی ہے۔''... ''آج پولیس کی گشت نہیں ہو رہی ہے، ضرور حملہ ہوگا۔'' پورا محلہ ایک ٹھنڈے بھیانک تناؤ اور ڈر میں ڈوب جاتا ہے۔ چار پانچ دن کے بعد چھٹ پٹ چاقو زنی کی وارداتیں شروع ہو جاتی ہیں۔ پتلی تنگ گلی کے کونے پر تین چار آدمی مل کر راشن کی تلاش میں نکلے کسی جھلی والے یا رکشے والے کو چاقو مار دیتے ہیں۔ گھٹی گھٹی سی بھیانک چیخ، بھاگتے ہوئے پیروں کی آوازیں، کھڑکیاں کھلنے کا شور اور پھر ''اللہ اکبر'' کے نعرے سنائی پڑتے ہیں۔

ہر فساد کے بعد ہندوؤں کے محلے کے آس پاس رہنے والے مسلمان کسی مسلمانی محلے میں آجاتے ہیں اور مسلمانوں کی بستی کے پاس رہنے والے ہندو رستوگی گنج یا رگھوبیر پورہ چلے جاتے ہیں۔

مسلمانی محلے میں داڑھیوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ مسجد میں نمازی زیادہ آنے لگتے ہیں۔ لوگ دیر تک گڑگڑا کر دعائیں مانگنے لگتے ہیں۔ غنڈہ پارٹی لوٹ کے مال کو اِدھر اُدھر کرنے میں لگ جاتی ہے۔ ہتھیار جمع کرنے کا چندہ وصول کرتی ہے۔ پتا نہیں اگلے فساد میں صرف گولیاں ہی چلیں۔ شہر میں کتنے ہندوؤں کے پاس بندوقیں ہیں اور کتنے مسلمانوں کے پاس؟ دس اور ایک کا بھی تو اوسط نہیں پڑتا۔ کارتوس جمع کیے جاتے ہیں، لیکن پولیس کا خیال آتے ہی سب کی ہوا بگڑ جاتی ہے۔ جگن، رحمت کے ہوٹل کے سامنے بہتی نالی میں بلغم تھوک کر کہتا ہے، ''یہی تو گڑبڑ ہے جگر۔ پولیس اگر کسی طرف سے...''

''ابے سالے، حاجی جی سے چندہ کیوں نہیں لیتے؟ کارخانہ چلاتے ہیں حرام میں؟''

حاجی جی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتے ہیں، ''اس بار تو ماشاء اللہ تم لوگوں نے بھی کچھ کیا۔''

''حاجی جی، آپ ہاتھ رکھ دیں تو دیکھیے کیا نہیں کر دکھاتے۔''

حاجی جی ایک ہزار روپیہ چندہ دیتے ہیں اور جگن کی پارٹی چلی جاتی ہے۔ ویسے حاجی جی کو ایک ہزار چندہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ ان کا کارخانہ قاسم پورے کے بیچوں بیچ ہے۔ کاریگر بھی سو فیصدی مسلمان ہیں۔ حاجی جی ہندوؤں کو رکھتے بھی نہیں۔ کہتے ہیں کہ قوم کی خدمت

کرنے کا خدا نے موقع دیا ہے تو اسے کیوں چھوڑوں؟ مسلمان کاریگر بھی حاجی جی کے کارخانے میں کام کرنا چاہتے ہیں۔ جان پیاری ہے، پیسہ نہیں۔

شہر تین حصوں میں بنا ہوا ہے۔ اسٹیشن سے شمال کی طرف چلے جایئے تو سول لائنز کا علاقہ ہے۔ چوڑی سڑک پر دور تک کوٹھیاں بنی ہوئی ہیں۔ ڈی ایم کی کوٹھی سے سڑک شروع ہوتی ہے اور انجینئر صاحب کی کوٹھی کے پاس مڑ جاتی ہے۔ یہاں پر حاجی کریم اور ویریندر بابو کی کوٹھیاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی بنی ہیں۔ رفیق منزل، جہاں کبھی محمد علی جناح ٹھہرا کرتے تھے، اس کے برابر میں جن سنگھ کے صدر پنڈت سوم دت گوڑ کا بنگلہ ہے۔ نواب عبدالمجید خاں، جو انگریزی راج میں بڑے اونچے عہدوں پر کام کر چکے تھے، ان کی کوٹھی کے بالکل سامنے ضلع کانگریس کے نیتاجی کا وسیع "سوراج نواس" ہے۔

اسٹیشن سے جنوب کی طرف جایئے تو چمکتا ہوا صاف بازار ملے گا جس کی بڑی بڑی دکانوں میں اتنا سامان بھرا ہوا ہے کہ اگر ہر ایک گھر میں ایک ایک چیز پہنچا دی جائے تب بھی کسی چیز کی کمی نہ پڑے۔ اس سڑک پر رکشوں، موٹروں، سائیکلوں کی بھیڑ میں چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی سڑک پر شہر کے بڑے ریستوران بھی ہیں اور سنیما گھر بھی، شراب کی دکانیں بھی اور جوہریوں کی گدیاں بھی۔ یہاں رات میں جگمگاتی ہوئی راڈوں کی روشنی ہوتی ہے اور کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ اس سڑک کے دونوں طرف گلیاں ہیں۔ کچھ حد تک صاف ستھری اور پکی گلیوں میں پکے مکان بنے ہوئے ہیں جن میں ہندو رہتے ہیں۔ ان محلوں میں مکان لینے کوئی مسلمان نہیں جاتا، جیسے ان کو معلوم ہے کہ شہر کا یہ حصہ دوسری طرح کے لوگوں کے لیے بنا ہے اور وہ دوسری طرح کے لوگ ہیں — دفتروں کے بابو، اسکول کے ماسٹر، چھوٹے دکان دار، الگ الگ نوکریوں اور دھندوں میں لگے ہوئے وہ سب ہندو ہیں۔ اسی سڑک پر اور بڑھتے چلے جایئے تو بڑے چوراہے کے بعد چمکیلی دکانیں ختم ہو جائیں گی۔ کچھ پھل بیچنے والوں کی چھوٹی چھوٹی دکانیں ہیں۔ اس کے بعد مانڈ بیچنے والوں کی چھوٹی چھوٹی اور پرانی دکانیں ہیں جن میں بیٹھے دکاندار صورت ہی سے مسلمان لگتے ہیں۔ جوانوں کے چہروں پر کالی خشخشی داڑھی اور آنکھوں میں سختی دکھائی پڑتی ہے؛ بوڑھوں کے چہروں پر سفید لمبی داڑھیاں، ماتھے پر سجدے کا

نشان۔ وہ اپنی دکانوں پر اس طرح بیٹھتے ہیں جیسے گھر میں آرام سے بیٹھے ہوں۔ بیٹھے بیٹھے "نہیں" کہہ دینے میں ان کا کوئی جواب نہیں ہے۔ گراہکوں کو دیکھ کر نہ ہنستے ہیں اور نہ مسکراتے ہیں۔ شاید گراہکوں کا آنا ان کو اچھا نہیں لگتا۔ نہ ان کی پوری بات سننے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ اپنی پوری بات ان کو بتاتے ہیں۔

بانڈوالوں کی دکانوں کے بعد سے بازار کی چہل پہل اپنا رنگ ڈھنگ بدل لیتی ہے۔ اب بائیں طرف ایک لائن سے بسکٹ بنانے والوں کی دکانیں ہیں جہاں دکاندار لنگی باندھے، بنیان پہنے، بسکٹوں کے لیے میدہ پھینٹتے دکھائی پڑتے ہیں۔ آٹھ نو سال کے بچے بڑے بڑے برتنوں کو دھوتے، گندی گندی گالیاں بکتے رہتے ہیں۔ ہر دکان پر ایک آدھ آدمی بیکار بیٹھا دکھائی پڑتا ہے۔ بسکٹ بنانے والوں کی گندی دکانوں کے سامنے لائن سے دور تک کھانے کے ہوٹل ہیں۔ کبھی کبھی یہ سوچ کر تعجب ہو سکتا ہے کہ اس بستی میں رہنے والے لوگوں نے کھانے کے علاوہ اور کسی چیز کی دکان کھولنے کی بات کیوں نہیں سوچی۔ صرف چائے کے ہوٹل، بسکٹ کی دکانیں، کھانے کے ہوٹل، کباب کی دکانیں ہی دور تک دکھائی دیتی ہیں۔ پہلا لیسین ٹی اسٹال ہے۔ اندر سفید پتھر کی میزوں پر لگاتار مکھیاں بھنکتی رہتی ہیں۔ اردو کے ایک دو اخبار، جن پر بہت چائے گر چکی ہوتی ہے، بلند آواز میں پڑھے جاتے ہیں۔ لیسین دکان کے سامنے والے در سے بھٹی کے سامنے کھڑا چائے بناتا رہتا ہے یا اوپر لگے ریڈیو کے کان اُمیٹھا کرتا ہے جس پر جالی دار غلاف چڑھا ہوا ہے۔ بھٹی کے داہنی طرف شیشے کے گندے مرتبانوں میں بسکٹ بھرے رہتے ہیں جن سے لیسین بالکل غیر جانب دار دکھائی دیتا ہے۔ ان بسکٹوں کو جب کوئی گراہک مانگتا ہے تو لیسین بڑی بیزاری سے ایک بسکٹ اس طرح میز پر رکھ دیتا ہے جیسے گالی دے رہا ہو۔ یہ پرانے بسکٹ صرف اونٹی ہوئی چائے میں ڈبو کر ہی کھائے جا سکتے ہیں۔ لیسین ٹی اسٹال کے بعد ایک کباب والے کی چھوٹی سی دکان ہے جو بھینس کے قیمے کی سیخ لگاتا ہے۔ اس دکان کے سامنے کھڑے ہونے پر آگ کی چنگاریوں کے ساتھ بھنے گوشت کی خوشبو ناک میں گھس جاتی ہے۔ ساتھ ہی لگا ہوا کھانے کا ایک اور ہوٹل ہے جس کے نام کا بڑا بورڈ دسیوں برساتوں کو نہ سہہ پانے کی وجہ سے زنگ لگا ٹین بن چکا ہے۔ ایک بہت بڑے تھال میں رکھی بریانی کے پیچھے موٹا عبدالغفور بیٹھا گوشت نکالا کرتا ہے۔ اس کے چاروں طرف بڑی پتیلیوں میں قیمہ، کلیجی، بھیجا، چھوٹے

کا اور بڑے کا گوشت سجا رہتا ہے۔ کھچے کتے ہوٹل کے اندر آ کر میز کے نیچے سے ہڈیاں اٹھا لے جاتے ہیں۔ ہوٹل میں کام کرنے والے لڑکے گندے اور چیکٹ کپڑے پہنے گراہکوں کے سامنے بڑے گوشت کی رکابیاں اور روٹیاں پٹک دیتے ہیں۔ ہڈی کو چبا کر نیچے فرش پر پھینک دینے یا کھانا کھانے کی کرسی پر بیٹھے ہی بیٹھے گلاس کے اندر ہاتھ ڈال کر ہاتھ دھو لینے پر کسی کو اعتراض نہیں ہوتا۔ دیواروں پر اسلامی کیلنڈروں میں مکے مدینے کی تصویریں یا قرآن کی آیتیں آنے جانے والوں کو دیکھتی ہیں۔ ہوٹل کے بیرے سے، جسے کسی بھی طرح آپ بیرا نہیں کہہ سکتے، اگر کھانے کے بارے میں پوچھیں تو وہ ایک ہی سانس میں دس کھانوں کے نام گنوا کر آپ کی طرف اس طرح دیکھے گا جیسے احسان کیا ہو۔ اس کے بعد بسم اللہ ہوٹل ہے جو اور بھی گندہ اور سستا ہے۔

ان دکانوں اور ہوٹلوں سے یہ تو پتا چل ہی جاتا ہے کہ اس محلے میں رہنے والوں کو کھانے اور خاص طور سے گوشت کھانے میں بڑی دلچسپی ہے۔ گندے اور پھٹے چیتھڑے لگائے، کھانسی سے بے طرح پریشان، چھوٹے چھوٹے لڑکے ہاتھ میں کئی جگہ سے چپٹا المونیم کا پیالہ لیے آتے ہیں، "قیمہ دے دو قیمہ، ایک پلیٹ!" اور قیمہ لے کر گلی میں بھاگ جاتے ہیں۔ ان گلیوں میں اتنی جگہ بھی نہیں ہے کہ تین چار آدمی ایک ساتھ چل سکیں۔ دونوں طرف نالیاں اور ان میں پڑے پاخانے اور پیشاب کی تیز کھاری بدبو ہر وقت گلی میں تیرتی رہتی ہے۔ جہاں کہیں بھی گلی ذرا سی چوڑی ہے وہاں جمعدار کی ٹوکری رکھی دکھائی پڑتی ہے۔ گلی کے فرش پر لگائی گئی اینٹیں بری طرح گھس کر اوبڑ کھابڑ ہو گئی ہیں۔ دونوں طرف کی اونچی دیواروں کی وجہ سے گلی میں ہلکا سا اندھیرا اور سیلن رہتی ہے۔ اینٹ سے بنی دیواروں پر مردانگی بڑھانے والی دواؤں کے اشتہار یا اردو میں لکھے پوسٹر دکھائی پڑتے ہیں جو کسی "میلاد شریف" یا "اردو کے قتل" اور "قوم پر مصیبت" کی اطلاع دیتے ہیں۔ عام طور پر گھروں کے نابدان گلی میں کھلتے ہیں جس کے اوپر لگا ٹین گل کر غائب ہو چکا ہوتا ہے۔ اوپر کوٹھوں سے ریڈیو کی تیز آواز یا چیخ پکار سنائی دیتی رہتی ہے۔ ٹین کے گلے پائپوں سے اوپر کا گندا پانی گلی میں گرتا ہے تو اس کے چھینٹے پوری گلی میں پھیل جاتے ہیں۔ گلی میں کھلنے والے پرانے اور برساتی پانی میں گلے ہوئے دروازوں پر ٹاٹ کا چیتھڑا پردہ کسی بھی وجہ سے کبھی ہٹ جاتا ہے تو دھواں نیا ہوا دالان دکھائی پڑ جاتا ہے۔ صبح اور شام کوئلے کی انگیٹھیاں جب گلی میں آ جاتی ہیں تو پوری گلی نیچے دھوئیں سے گھر جاتی

ہے۔ کسی پردے کے پیچھے سے کوئی پیلے یا پتلے چہرے والی لڑکی جھانکتی ہے اور دو ننگے بچے، جن کے پیٹ پھولے ہوتے ہیں، اندر گھس جاتے ہیں۔

یہ شہر کا تیسرا حصہ ہے جہاں سو فیصدی مسلمان رہتے ہیں۔ ان محلوں میں شاید ہی کبھی کوئی ہندو آتا ہو۔ آنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اور مکان لینے یا رہنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ہاں، ان محلوں کے پیچھے کچھ چمار، پاسی یا کچھ اسی طرح کے لوگ جھونپڑوں میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ بھی اسی طرح کی ذلیل اور بھک مری والی زندگی جیتے ہیں جیسا کہ محلے کے دوسرے لوگ۔

اس محلے سے میونسپلٹی میں مسلمان ہی الیکشن جیتتے ہیں۔ ہندو کھڑے ہی نہیں ہوتے۔ اسکول کے ماسٹر مسلمان ہیں، ڈاکٹر مسلمان ہیں، دکاندار مسلمان ہیں، چھوٹے موٹے دوسرے کام کرنے والے مسلمان ہیں۔

اس نیم کے پاس والی گلی کے اندر چلے جایئے تو آگے چل کر ایک بڑا سا پرانا مکان دکھائی پڑے گا، جس کے دروازے پر چھوٹی سی تختی میں "حاجی کریم اینڈ کو" لکھا دکھائی دے گا۔ یہی حاجی جی کا کارخانہ ہے۔

"حاجی عبدالکریم اینڈ کو" کے تالے ہی ہندوستان کے مشہور تالے ہیں۔ آج کل تو کوئی بھی ایرا غیرا نتھو خیرا تالا بنانے کا کام شروع کر دیتا ہے، نہیں تو سنہ تیس میں صرف حاجی جی کا ایک کارخانہ تھا۔

ایک ہزار روپے دینا حاجی جی کو کھل گیا تھا لیکن اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ یہی لوگ وقت پر کام آتے ہیں۔ کامریڈ تھان سنگھ نے جس زمانے میں مزدوروں سے دوستی کرنی شروع کی تو حاجی جی نے جگن ہی سے کہا تھا اور جگن نے سب ٹھیک کر دیا تھا۔

حاجی جی نے ٹوپی اتاری، سر پر ہاتھ پھیرا اور "اللہ! اللہ!" کر کے تخت پر لیٹ گئے۔ اندر کارخانے میں کام ہو رہا تھا۔ حاجی جی نے لیٹے ہی لیٹے ایک انگڑائی لی اور زور سے بولے، "رحمت، مجھے ایک کٹورا پانی پلا دے۔"

اندر لوہا پیٹنے اور چھوٹے بڑے ہتھوڑے چلنے کی آوازوں میں حاجی جی کی آواز دب گئی۔ وہ

پھر زور سے چلائے۔ ''کہاں رہتے ہو؟ تمھیں گھنٹوں سے بلا رہا تھا۔'' حاجی جی رحمت کو دیکھ کر بولے۔ وہ اندر سے نکل کر آیا تھا۔ ''مجھے ایک کٹورا پانی پلا دو۔ اور وہ آرڈر والا خط لکھا یا نہیں؟ آج اسٹیشن سے بلٹی بھی چھڑانی ہے۔ اور لیور، کمانی، اسکرو کا کام جو محلے میں بٹا تھا، واپس ہو گیا؟'' وہ پاؤں تکیے سے لگا کر بیٹھ گئے۔ ان کی بڑی توند ایک چھوٹا سا ٹیلا لگنے لگی۔ آٹھویں پاس رحمت حاجی جی کا منیجر ہے۔ دفتر میں جھاڑو دینے سے لے کر لکھا پڑھی تک کا کام کرتا ہے۔ حاجی جی اس سے بڑا خوش رہتے ہیں، لیکن کبھی ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ سو روپے میں ایسا منیجر آج کل کہاں ملے گا؟

''رحمن ہی کا کام ابھی تک نہیں آیا ہے۔ فساد میں اس کا گھر جل گیا تھا نا۔ اس وجہ سے۔''

''کتنے کا مال تھا؟''

''تین سو کا۔''

''ٹھیک ہے۔ مزدوری میں دھیرے دھیرے کاٹ لو۔ آئے تو اور مال بنانے کو دے دینا۔ اللہ اللہ، قوم پر کیا مصیبت آئی ہے!'' وہ پانی پی کر پھر لیٹ گئے۔

لیور، کمانی، اسکرو، رپٹ اور کور بنانے کا کام حاجی جی محلے میں بٹوا دیتے ہیں، بلکہ عورتیں خود ہی آ کر لے جاتی ہیں۔ یہ چھوٹے موٹے کام عورتیں بچے مل کر کر لیتے ہیں۔ دن بھر عورتیں، لڑکیاں اور بچے کام کر کے شام کو کارخانے میں آ کر دے جاتے ہیں اور مہینے میں حساب ہو جاتا ہے۔ حاجی جی بڑے فخر سے کہتے ہیں، ''اسی لیے تو میں بڑی مشینیں نہیں لگاتا۔ غریبوں کی روٹی ماری جائے گی۔ ابھی کم سے کم پیٹ بھر کھانا تو مل جاتا ہے۔''

حاجی جی پڑھے کم لیکن کڑھے زیادہ ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ بڑی مشینیں لگانے سے وہ مٹ سکتے ہیں۔ وہ گھاٹے کا کام ہے۔ ابھی تو فیکٹری ایکٹ ہی نہیں لاگو ہوتا ''حاجی کریم اینڈ کو'' پر؛ جو کام کم سے کم تین سو آدمی کرتے، محلے کی عورتیں کر دیتی ہیں۔ لیبر انسپکٹر کے آنے سے پہلے ہی چندو کا لونڈا، جو لیبر آفس میں چپراسی ہے، آ کر حاجی جی کو بتا دیتا ہے۔ حاجی جی آدھے سے زیادہ مزدوروں اور کاریگروں کو پچھلی کھڑکی سے باہر کر دیتے ہیں۔ ایسی بات نہیں ہے کہ لیبر انسپکٹر نہیں جانتا۔ حاجی کو منھ بند کرنے کے طریقے معلوم ہیں۔ اب جب فیکٹری ایکٹ ہی نہیں لاگو ہو پاتا تو چھٹیاں، بونس، آئی ایس کا جھگڑا ہی ختم ہو جاتا ہے۔ حاجی جی اتوار کی چھٹی بھی نہیں دیتے۔ کہتے ہیں، ''وہی ہوگا جو

ہوتا چلا آیا ہے۔ جسے نہ کرنا ہو وہ ویریندر بابو کے کارخانے میں چلا جائے۔'' ویریندر بابو کے کارخانے کا نام آتے ہی سب کے چہرے سُست جاتے ہیں۔ سینکڑوں ہندوؤں کے بیچ ایک آدھ مسلمان کیسے کام کرسکتا ہے؟ اگر کسی دن فساد ہوگیا تو...؟

حاجی جی گرو پڑنے کے بعد ملائم لہجے میں سمجھاتے ہیں، ''اسلام تمھیں یہی سکھاتا ہے کہ ایک مسلمان کے کارخانے میں کام چھوڑ کر تھوڑے سے لالچ میں ہندو کے کارخانے میں چلے جاؤ؟ ویریندر بابو سے تمھارا کیا رشتہ ہے؟ میں نے مانا کہ تم کو یہاں تکلیف ہے تھوڑی، لیکن آرام بھی تو ہے۔ عید بقرعید کی چھٹی دیتا ہوں۔ تمہارے روزے میں تمھارے ساتھ ہوں۔ ارے بھائی، میں تو یہاں سے وہاں تک تمھارے ساتھ ہوں۔ کوئی زیادتی کروں تو اللہ کے یہاں دامن تھام سکتے ہو۔ لیکن ویریندر بابو کے یہاں کیا کرو گے؟ اگر کبھی فساد ہوگیا تو مار ہی تو دیے جاؤ گے نا؟ اسلام کی ساری تعلیمات کو بھول گئے ہو؟ یہی تو قوم میں سب سے بڑی خرابی ہے کہ ایک مسلمان کسی دوسرے بھائی کا فائدہ نہیں دیکھ سکتا۔ جاؤ بھائی جاؤ، جسے جانا ہو جاؤ۔ میں تو وہی کروں گا جو کرتا آیا ہوں۔'' وہ اپنی لال آنکھوں سے مزدوروں کی طرف دیکھتے ہیں، ''جاؤ ویریندر بابو کے کارخانے! اپنے مسلمان بھائی کے مٹ جانے کی پروا کیوں کرتے ہو؟'' ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ ''اللہ اللہ!''

کوئی نہیں جاتا۔ سب سچے مسلمان ہیں۔ پاور پریس چلنے لگتی ہے، لوہا گلایا جانے لگتا ہے اور پرانا بڑا مکان دھوئیں اور اس کی بدبو سے بھر جاتا ہے۔ سیٹھ حاجی کریم باہری کمرے یعنی آفس میں گاؤ تکیے سے لگ کر لیٹ جاتے ہیں۔ سوچتے ہیں، اللہ کی بڑی مہربانی ہے ان پر۔ دوسرے کارخانوں میں کبھی پی ایف کے لیے ہڑتال ہوتی ہے تو کبھی کمپنسیشن گریجوٹی کے لیے دھرنا ہوتا ہے۔ لے آف اور لاک آؤٹ کے چکروں میں کہاں کام ہوسکتا ہے؟ انکم ٹیکس، پروفیشنل ٹیکس اور پتا نہیں کیسے کیسے ٹیکس لگے ہوئے ہیں۔ کسی مزدور کو نکال نہیں سکتے، کسی کو رکھ نہیں سکتے، تو پھر مالک کاہے کے؟ حاجی جی ''اللہ! اللہ!'' کرکے پھر لیٹ گئے۔ کارخانے میں کام ہو رہا تھا۔

❁❁

اصغر وجاہت

ہندی سے ترجمہ: رحمٰن مصور

بچوں والی گاڑی

اگلے دن صبح ہی صبح رات انکو کے مر جانے کی خبر کالج میں پھیل گئی۔ کالج کے اسٹاف روم میں ڈاکٹر حمید جان بوجھ کر یہ بات نکال بیٹھے کہ مرنے کے بعد آدمی کا چہرہ کیسا ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ہوتا ہے، بات بڑھتے بڑھتے کافی بڑھ گئی۔ بات بڑھانے والے جانتے تھے کہ تیواری جی موت سے بہت ڈرتے ہیں۔ تیواری جی واقعی ڈر رہے تھے اور انھوں نے کئی بار کامن دلچسپی کے ٹاپک، جیسے ٹیلی ویژن کی خرابیوں یا فرج کے پرابلمز کی طرف لوگوں کا دھیان کھینچنا چاہا، لیکن سب ان کو ڈرائے پر تلے ہوئے تھے، اور آخر کار تیواری جی ایک بڑا سا پان منھ میں دبا کر اٹھ لیے۔ چپراسیوں کی یونین نے ایک کنڈولینس میٹنگ بلائی جس میں اس بات پر کافی جھگڑا ہوا کہ یونین کے اگلے چناؤ اب تک نہیں ہوئے ہیں۔ کالج کے پرنسپل جو ہمیشہ ایک سے رہتے تھے، اس خبر کو سن کر بھی ویسے ہی رہے جیسے تھے۔

کالج کے جو لڑکے انکو کو جانتے تھے، یعنی جو کئی سال سے فیل ہو رہے تھے — مطلب انکو پانچ سال ہوئے کالج کے چپراسی کے عہدے سے ریٹائر ہو چکے تھے اور نئے لڑکے انھیں نہیں جانتے تھے — تو فیلیر لونڈوں نے کہا، ''گھنٹے بجانے میں ماہر تھا بڈھا۔'' فزکس کے لیکچرر جو سکون کی بہت بات چیت کیا کرتے اور ڈسٹربنس سے سخت نفرت کرتے تھے، بولے، ''چلو تھوڑا سکون رہے گا۔''

انکو نے درجہ تین کی کتاب میں پڑھا تھا، ''محنت اور ایمانداری سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔'' انکو درجہ چار میں پڑھتے تھے کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ انکو کی فیس کون دیتا، نام کٹ گیا۔ انکو خراد کا

کام سیکھنے لگے، اس لیے وجہ تین میں پڑھی بات کو گانٹھ سے باندھے رہے۔ خراد کا کام اس لیے چھوڑنا پڑا کہ وہاں سے پیسہ نہ ملتا تھا۔ پھر دو چار جگہ چھوٹے موٹے اور کام کیے اور آخر کار کالج میں چپراسی لگ گئے۔ تیس سال تک محنت اور ایمانداری سے گھنٹے بجاتے رہے۔ پہلا آٹھ پندرہ پر، دوسرا نو بیچے، تیسرا پونے دس پر... اور اسی طرح سال گزرتے گئے۔ پورے تیس سال کبھی کوئی گھنٹہ غلط نہیں بجا، کبھی کوئی بھول چوک نہیں ہوئی۔ انکو نے تیس سال کام کیا اور ریٹائر ہو گئے۔ چپراسیوں کی یونین نے، ٹیچرز کی ایسوسی ایشن نے، یعنی سب نے، اس بات کو مانا کہ انکو بہت ایماندار اور محنتی رہے ہیں۔ ویسے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ان کے کام کو دیکھ کر اکثر کالج کے لیکچرر کہا کرتے تھے، "کالج میں اگر کسی کو پدم شری ملنی چاہیے تو انکو کو۔" کہنے والے اس لیے کہتے بھی نہیں تھے کہ انکو کو پدم شری مل جائے اور ایسی بات کہہ دینے میں وہ کوئی حرج بھی نہیں سمجھتے تھے جو نہ ہونے والی ہو۔ تیس بار کالج کھلا اور بند ہوا۔ جن لوگوں کی ترقیاں ہونی تھیں ہوئیں، جن کو صرف زندہ رہنا تھا رہے، اور جن کو مر جانا تھا مرے۔

انکو کی آنکھوں کے کنارے بھیگے رہتے تھے۔ وجہ پوچھی جانے پر وہ اپنی پھٹی پھٹی اور بھرائی آواز میں یہی جواب دیتے تھے، "بچپن سے خراب ہیں،" اور یہ کہہ کر اپنی قمیض کے دامن سے آنکھیں رگڑتے، تھیلوں کو لے کر چل دیتے۔ ایک پیر زمین پر اس طرح سے رگڑتا جیسے زمین انھیں چھوڑ ہی نہ رہی ہو۔ کسی کے دیے پرانے بوٹ، جن کی ڈوریاں ندارد ہوتیں، ان کے پیروں میں پھٹ پھٹ کرتے۔ جوتوں کی ایڑیاں رگڑتی رہتیں، یہاں تک کہ گھس کر ترچھی ہو جاتیں اور اس سے ان کی چال بدل جاتی۔ ان کے چہرے پر خاص بات ان کی سفید بڑھی ہوئی داڑھی تھی، جو نہ تو ٹیگور کی داڑھی کی طرح رئیسی اور ذہانت دکھاتی تھی اور نہ اس میں ملاؤں کی داڑھی جیسی کٹرتا تھی۔ ان کی داڑھی اپنے قدرتی طریقے اور جیسے نہ ہونے کی وجہ یا اس کی پروانہ کرنے سے کافی نمایاں لگتی تھی۔ سر پر وہ سولو ہیٹ لگاتے تھے جو پتا نہیں کس زمانے میں ان کو کس نے دیا ہوگا۔ کپڑوں کے معاملے میں ان کا داڑھی والا حال تھا، یعنی جو جس نے دے دیا پہن لیا۔ جب نوکری سے شروع شروع میں ریٹائر ہوئے تو چپراسیوں والی وردی پہنے رہتے تھے اور جب وہ پھٹ گئی تو کبھی بنا بٹن کی سفید قمیض یا بنا قمیض کا کالا کوٹ — یعنی کچھ بھی جو مل جائے۔ داڑھی اور سولو ہیٹ کے بیچ اگر کچھ دکھائی دیتا تھا تو ان کے

چہرے پر پڑی بے تحاشا جھریاں اور دھوپ میں تپا تانبے جیسا رنگ جو اگر کسی جوان آدمی کے چہرے پر ہوتا تو ضرور اچھا لگتا۔

انکو جب ریٹائر ہوئے تو کالج میں ایک چھوٹا سا فیئر ویل دیا گیا۔ صدارت پروفیسر سارنگ نے کی اور اپنے صدارتی خطبہ کو اکیڈمک ٹچ دیتے ہوئے 'ڈپارٹمنٹ پالٹکس' پر چھینٹا کشی کی، جس کے نتیجے میں ان کے مخالف ڈاکٹر لال نے فیئر ویل کا خاموش بائیکاٹ کر دیا۔ انکو کو اس بات کا پتا ہی نہیں چلا؛ وہ سر جھکائے اپنے فیئر ویل میں بیٹھے تھے۔ ان سے جب بولنے کو کہا گیا تو ان کی آواز حلق میں پھنس گئی اور صرف اتنا ہی کہہ سکے کہ "آپ سب کا شکریہ۔ ہمیں بڑی عزت دی۔" فیئر ویل کے بعد جو چائے ہوئی اس میں ماحول بڑا خوشگوار ہو گیا۔ پروفیسر سارنگ نے خود چائے بنا کر انکو کو دی اور اس خوشگوار حرکت کو پچاس ساٹھ آدمیوں نے دیکھا اور تعریف کی۔

ریٹائر ہونے کے بعد عام طور پر لوگوں کا مورال ڈاؤن ہوتا ہے، لیکن انکو کو کوئی پروا نہیں تھی۔ ایسا نہیں کہ ان کے اوپر ذمے داریاں نہیں تھیں — تین بھتیجوں کی شادی کرنی تھی، بھتیجے کی فیس لگاتار دینی تھی، بھابھی کو کھلانا پلانا تھا — یعنی پورا گھر چلانا تھا۔ انکو نے بھائی کے جلدی مر جانے کے بعد شادی نہیں کی تھی۔ بھابھی اور بھتیجوں کی پرورش کی تھی۔ ان کو جب فنڈ کا پیسہ ملا تو بھتیجیاں جوان تھیں، ان کی شادی کر دی۔ پھر ڈاک خانے کی کتاب کو اپنی چندھی آنکھوں سے ملا کر بیٹھ گئے۔ کافی دیر دیکھتے رہے۔ کالی سیاہی سے تین سو اڑتالیس روپے چالیس پیسے لکھا تھا۔

"اب کیا کرو گے؟" انکو کی بھوجائی نے ڈرتے ڈرتے ان سے پوچھا۔

"کیا کریں گے، کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔ ارے تو فکر کیوں کرتی ہے؟ ابھی ہاتھ پیر چلتے ہیں۔ ایمانداری سے محنت کا کمایا کھائیں گے۔" اس جواب کو سن کر بھوجائی کی پریشانی تھوڑی کم ہوئی اور بکری کو لوکی کے چھلکے پھینکنے چلی گئی۔ انکو نے پھر پاس بک آنکھوں سے سٹا کر دیکھنا شروع کر دیا۔ "کوئی کام دھندا کریں گے۔ محنت سے کام ہوگا، نیت میں ایمانداری ہوگی تو کیوں نہیں چلے گا، ضرور چلے گا۔" دھندے کی بات سوچتے سوچتے وہ سو گئے۔ رال ان کے منھ سے بہہ کر چٹائی تک پھیل گئی۔

پوری بستی میں انکو کے دو دوست تھے، ایک رجو مالی اور دوسرے انصاری صاحب، جنھوں

نے انکو کے چار سال بعد کالج جوائن کیا تھا اور اب ان کے چہرے پر بھی ریٹائر ہونے کا ڈر دکھائی دیتا تھا۔ انکو اور انصاری صاحب کی دوستی پرانی تھی اور رجو مالی تو انکو کے گاؤں کا آدمی تھا جو کسی قتل میں پھنس گیا تھا اور بھاگ کھڑا ہوا تھا اور آج تک بہرائچ کی پولیس کو اس کی تلاش ہے۔ وہ اکثر رات میں سوتے سوتے ڈر جاتا تھا اور اگلے دن انکو سے رات کا پورا خواب بتاتا تھا۔ انکو چپ چاپ اس کی بات سنتے تھے کیونکہ ان کے علاوہ رجو کسی سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہے۔

ایسے موقعے پر وہ پہلے رجو کے پاس گئے۔ اس نے انھیں چائے کا گلاس تھما دیا جسے وہ پینے جا رہا تھا۔ آنکو نے سوسو کر کے چائے پینا شروع کر دیا۔ رجو جانتا تھا کہ انکو کیا بات کرنے آئے ہیں، اور وہ اس بات کو شروع کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔ آخر جب رجو کچھ نہ بولا تو انکو ہی نے کہا: "سوچا ہے کوئی کاروبار کریں۔"

"کون سا کاروبار کرو گے؟"

"ارے محنت اور ایمانداری سے جو کچھ کریں گے اسی میں برکت ہوگی۔"

رجو ان کی اس بات سے متفق نہیں تھا لیکن پھر بھی کچھ بولا نہیں۔

"سوچا ہے دکان کر لیں۔ ابھی پاس بک میں قریب تین سو روپے پڑے ہیں۔"

"دکان؟"

"ہاں دکان۔"

"سو روپے میں کیا ملے گی۔ سو روپے دے کے دو سو بیچے گا۔" رجو نے یہ نہیں کہا کہ دو سو روپے میں کون سا سامان لا کر دکان میں رکھیں گے لیکن انکو اس کی بات سمجھ گئے۔ کچھ دیر کے بعد انکو بولے: "پھیری کر لیں گے۔"

"بڑھاپے میں؟"

"بڑھاپا جوانی سب برابر ہے۔ محنت سے سال دو سال بھی کام کیا تو دکان بھی ہو جائے گی اور..."

"ہاں جی، محنت تو بڑی چیز ہے۔" رجو نے یہ بات انکو کو خوش کرنے کے لیے کہی۔

انکو خوش ہو گئے، دھنسی ہوئی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''دو بڑے تھیلے لے لیں گے۔ چھوٹا موٹا سامان بھر لیں گے۔ محلے میں پھیری لگا کر بیچیں گے۔ سامان اچھا دیں گے، محنت سے بیچیں گے، لوگ کیوں نہ لیں گے؟''

''لیں گے بیٹا، ضرور لیں گے۔''

کسی کو یہ امید نہیں تھی کہ انکو چلتی پھرتی دکان لگا لیں گے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ کسی ماسٹر کے گھر کا سامان لایا کریں گے یا ان کی بھابھی کسی کے گھر کھانا پکایا کرے گی یا انکو اپنے گاؤں چلے جائیں گے۔ یا جلدی ہی مر جائیں گے۔

انکو نے پہلے بھی کسی کی پروا نہیں کی تھی، اب بھی نہیں کرتے تھے۔ وہ چھوٹا موٹا راشن کا سامان اپنے تھیلوں میں بھرے اور تھیلوں کو کندھوں سے لٹکائے پوری بستی کا چکر لگاتے رہتے۔ اشاف کوارٹروں کے سامنے رکتے، پوچھتے، سامان کی ضرورت ہوتی تو دیتے اور اپنے پیر گھسیٹتے آگے بڑھ جاتے۔ قمیض پسینے سے بھیگ جاتی، داڑھی میں پسینے کی بوندیں گرتیں، سر پر جون کا سورج تمتما تا رہتا، لو چلتی، لیکن انکو محلے کے چکر لگاتے رہتے۔ وہ صبح پانچ بجے اپنے گھر سے نکل پڑتے۔ نکلنے سے پہلے وہ ڈبل روٹی جو انھوں نے دکان کے لیے خریدی تھی لیکن کئی دنوں تک رکھے رکھے خراب ہو جاتی، چائے کے ساتھ کھاتے اور تھیلوں کو اپنے جھکے جھکے کمزور کندھوں پر ٹانگ کر باہر نکل جاتے۔

انھیں دیکھ کر محلے کے لوگ کہا کرتے تھے، ''کیے جاؤ محنت، ایک دن پھل پاؤ گے۔'' چودھری عبدالغفور کا لڑکا جو چوبیس گھنٹے اسکول گول کر کے چائے کی دکان پر بیٹھا رہتا تھا، اس کا باپ اسے پکڑتا تھا اور بری طرح دھن دیا کرتا تھا اور ہر جوتے پر انکو کا نام لیتا تھا، ''دیکھ سالے، بوڑھا آدمی ہے، رات دن محنت کرتا ہے۔ تجھ سے، حرامی کی اولاد، پنکھے کی ہوا میں بیٹھ کر پڑھا نہیں جاتا۔ یہاں چائے کی دکان پر تمھاری نال گڑی ہے کیا؟'' چائے کی دکان پر جو لونڈا کام کرتا تھا اس کو بھی ہر وقت ''فینسی ٹی اسٹال'' کے پروپرائٹر دیپ بابو یہی سنایا کرتے تھے، ''ابے ماں کے... ہاتھوں کو لقوہ مار گیا ہے کیا؟ سالے، چار گھنٹے سے ایک برتن نہیں دھل رہا۔ ابے، انکو کو دیکھ، بڑھاپے میں پہاڑ کاٹے دے رہا ہے۔ دیکھ لینا ایک دن لکھ پتی ہو جائے گا، اور تو سالا ہمیشہ ہوٹل میں برتن گھسے گا... وہ بھی ٹھیک سے نہیں، گالی کھا کے... صبح پانچ بجے اٹھ جایا کر۔ کل جب میں سوا پانچ بجے آیا تو بھٹی ٹھنڈی پڑی

تھی اور تو ٹانگ اٹھائے خراٹے لے رہا تھا۔"

محلے کے کام چور لونڈے چونکہ کام چور تھے، اس لیے انکو کی صورت سے جلنے لگے۔ چودھری کے لونڈے نے تو ایک دن رات میں انکو کو پیڑ کے اوپر چڑھ کر کتا بھی مار دیا جو انکو کے سر پر جا کر پڑا تھا اور رات میں انکو کی بھاری آواز اور چیخ چلاہٹ سنائی پڑی تھی۔ انکو کہہ رہے تھے: "لوگ جلتے ہیں جی... اپنے آپ محنت تو کر نہیں سکتے۔ تو محنتی آدمی سے کیوں نہیں جلیں گے؟"

جلنے والوں کو اور جلانے کے لیے انکو نے دگنی محنت شروع کر دی اور محلے والوں سے ناتا توڑ لیا۔ وہ صبح ساڑھے پانچ کے قریب نکلتے اور دن بھر تھیلے لیے گھومتے رہتے۔ رات کوئی آٹھ نو بجے لوٹتے اور سو جاتے۔ دھیرے دھیرے تھیلوں کا وزن بڑھ رہا تھا۔ لوگ جو جو جیسا سامان ان سے مانگتے جو ان کے پاس نہ ہوتا، اسے انکو خرید کر تھیلوں میں ڈال لیتے۔ جیسے کہ ایک دن مسز تیواری نے پوچھا: "چائے ہے تمہارے پاس؟"

"ہے جی۔" انکو نے لپٹن کا پیکٹ نکالا۔

"نہیں نہیں، تاج محل برانڈ۔"

"تاج محل؟"

تاج محل نہیں تاج محل چھاپ چائے۔"

"وہ تو نہیں ہے۔"

"رکھا کرو، اچھی چائے ہوتی ہے۔" انکو نے دو پیکٹ تاج محل چھاپ چائے کے بھی خرید لیے۔ اسی طرح ان کو روز دو چار نئی چیزیں جیسے سنسل ٹوتھ پیسٹ یا لرل صابن جیسی چیزیں خریدنی پڑتیں۔ ایک تھیلے میں انھوں نے راشن کا سامان رکھ چھوڑا تھا اور دوسرے میں چائے، صابن اور بساطی کا دوسرا سامان۔ چھوٹا چھوٹا سامان اتنا ہو گیا تھا اور کاغذ میں بندھی پڑیاں ایک دوسرے کے اوپر اس طرح آ گئی تھیں کہ اکثر کھل جاتیں اور ارہر کی دال میں شکر مل جاتی یا آٹے کے تھیلے میں سوراخ ہو جاتا، یا کبھی کوئی ان سے ماش کی ایک کلو دال مانگتا تو ان کے پاس آدھا کلو ہی نکلتی۔ ایسے موقعے پر لوگ جھنجھلا جاتے ضرورت ایک کلو کی ہے اور دکان میں صرف آدھا کلو دال ہے۔ وہ لوگ انکو کو ڈانٹتے،

''کام کرنا ہے تو قاعدے سے کرو... نہیں تو بند کرو... اپنے آپ بھی پریشان ہوتے ہو اور دوسروں کو بھی پریشان کرتے ہو۔''

''سب تھیلے بڑے بھاری ہو جاتے ہیں، زیادہ سامان بھی خراب ہوتا ہے، اس لیے کم کم رکھتے ہیں۔'' انکو کو سامان نکالنے اور دینے میں کافی دیر بھی لگتی تھی۔ اب مان لیجیے کسی نے کالی مرچ مانگ لی۔ کالی مرچ جھولے میں سب سے نیچے پڑی ہے تو انکو کو سب سامان نکالنا پڑتا اور اس کے بعد ہی کالی مرچ نکل پاتی۔ ٹوٹنے پھوٹنے والی چیزوں جیسے انڈوں وغیرہ کے ساتھ اور بڑی مشکل تھی۔

''انڈے ہیں انکو تمھارے پاس؟'' ایک دن ڈاکٹر داس نے اس سے انڈے مانگے۔

''ہاں، ہیں صاب۔''

انکو نے اپنے کرتے کی جیب سے دو انڈے نکال لیے۔ ڈاکٹر داس ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔ کالج میں ان جیسا صفائی پسند کوئی اور نہیں تھا۔ جیب سے دو انڈے نکال کر جب ان کے سامنے آئے تو ان کی بھنویں چڑھ گئیں۔ ''رکھو جی، تمھیں کسی کام کو کرنے کے میز نہیں ہیں۔'' ڈاکٹر داس کے سامنے لالا ہردیال داس اینڈ کو کی دکان میں رکھے سو درجن گھوم گئے۔ ''اونہہ، لے کے چلے آئے دو انڈے!''

دھیرے دھیرے انکو کا سب پیسہ دکان میں لگ گیا تھا۔ نئی نئی چیزیں اتنی زیادہ لوگ مانگتے تھے کہ انکو پریشان ہو گئے — کیا مصیبت ہے۔ ایک گھر میں باپ الگ صابن لگاتا ہے، ماں کا الگ قسم کا صابن ہے، بچے کسی اور صابن سے نہاتے ہیں۔ اگر ان کے گھر پہنچا ہے تو سبھی صابن ہوں۔ اور جو ایک ہی ہوا تو کہتے ہیں، ''ارے جاؤ، ایک صابن تم سے لے لیں بھی تو دوسرے کے لیے لالا ہردیال کے یہاں جانا پڑے گا۔''

انکو کو یہ بھی معلوم تھا کہ گاہک سے کبھی 'نہیں' نہیں کرتے ہیں۔ روز ان سے کوئی نہ کوئی کہتا، ''انکو کل کلوز اپ ٹوتھ پیسٹ لے آنا۔'' انکو رات آٹھ بجے جب گھر لوٹتے تو دن بھر کی بکری کے پیسے گنتے، صبح لالا کی دکان جاتے، دو کلوز اپ ٹوتھ پیسٹ لیتے اور گاہک کو پہنچا دیتے۔ پورے محلے میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ انکو سے اس نے کسی چیز کے لیے کہا ہو اور انکو نے لا کر نہ دی ہو۔ لیکن

Scanned with CamScanner

ایسے لوگ کم ہی تھے جو اگلے دن تک انتظار کر سکتے تھے۔

انکو کو یہ بھی معلوم تھا کہ کاروبار میں شروع شروع میں تو گھاٹا ہوتا ہے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جتنا گڑ ڈالو اتنا ہی میٹھا ہوتا ہے۔ گھاٹا وہ برداشت کرتے رہے اور پاس بک سے پیسہ نکال نکال کر سامان لاتے رہے۔ تھیلوں کا وزن بڑھتا رہا۔ رجو نے ایک دن ان سے کہا، "انکو دادا، آواز بھی لگایا کرو۔ تم سامنے سے نکل جاتے ہو، آدمی ڈھونڈا کرتے ہیں۔" تو انھوں نے لگاتار آوازیں لگانا شروع کر دیں۔ صبح صبح وہ اپنی پھٹی پھٹی آواز میں چیختے، تھیلے لادے اپنے پیر کو گھسیٹتے گزر جاتے۔ وہ کہتے تھے، "بازار سے سستا سامان ہے ہماری دکان میں۔۔۔" اور واقعی کچھ سامان تو وہ بازار بھاؤ سے سستا بیچا کرتے تھے، گاہک بنانے کے لیے۔ جیسے ماچس کا وہ ایک بڑا بنڈل لے آتے اور کھلی ماچس بیچنے پر جو ایک پیسے یا دو پیسے کا فائدہ ہوتا اسے نہ لیتے، خوشی خوشی خریدوالے دام پر ماچس بیچ دیتے۔ ماچسیں یا اور ایسی ہی دوسری چھوٹی موٹی چیزیں، جن پر منافع نہ لینا انکو برداشت کر سکتے تھے، آسانی سے بک جاتی تھیں۔ وہ انھیں پھر لے آتے۔

کسی کو ان سے یہ شکایت بھی نہیں تھی کہ ان کو انھوں نے خراب سڑا گلا سامان دے دیا ہو۔ بلکہ وہ تو خود ہی کہہ دیا کرتے، "ہاں صاب، بر ٹیڈیا بسکٹ ہے ضرور، پر پچھلے مہینے کا خریدا ہوا ہے۔" اور خریدنے والا اگر لے لیتا تو ٹھیک، نہیں تو انکو خوشی خوشی واپس لوٹتے۔ دل میں کہیں یہ بھی ہوتا کہ دیکھو، ہم ایماندار ہیں، ایمانداری کا نتیجہ اچھا ہوتا ہے۔ بسکٹ کا ڈبہ نہ بکا تو کیا ہوا، ایک گاہک تو پکا ہو گیا۔ انڈے اور ڈبل روٹی چونکہ خراب ہو جانے کا ڈر رہتا تھا اس لیے بھی، اور پیسے زیادہ نہ ہونے کی وجہ سے بھی، وہ کم خریدا کرتے تھے۔ کم خریدنے پر لالہ ان کو اسی بھاؤ پر بیچتا تھا جو پھٹکر کا بھاؤ ہوتا تھا۔ اور اس طرح انکو چاہے دو ڈبل روٹی اور چھ انڈے ہی کیوں نہ بیچ ڈالیں، انھیں ایک پیسے کا فائدہ نہیں ہوتا تھا، اور اگر کسی دن ڈبل روٹی رہ گئی تو اگلے دن گھر میں بیٹھ کر وہ بھابھی، سب سے چھوٹی بھتیجی اور بھانجے کے ساتھ کھا لیا کرتے تھے۔

محلے میں لوگ کہتے تھے، دیکھو، یہ بھی کچھ دنوں کا تماشا ہے، کچھ دنوں میں راستے پر آ جائے گا۔ انھی سب باتوں کو سن سن کر انکو کی ناک بن گئی تھی۔ سارا پیسہ دکان میں لگا کر بھی جب کوئی آمدنی نہ

ہوتی دکھائی دی تو انکو کو لگا کہ وہ محنت کم کرتے ہیں اور وہ ساٹھ سال کی عمر میں تھیلوں کو تانگے اور تیزی سے محلے میں گھومنے لگے۔ بازار جا جا کر لوگوں کی فرمائش کا سامان لاتے رہے۔ ان کے کندھے جھکنے لگے اور پیر اور زیادہ گھسٹنے لگا، سولہ ہیٹ ماتھے پر زیادہ جھک آیا، رنگ اور زیادہ تانبے جیسا ہو گیا، دن بھر چیخنے چیخنے ان کی آواز اور بھاری ہو گئی۔ رجو نے آخر ایک دن ان سے کہہ ہی دیا، "دادا، اپنا بھی دھیان رکھا کرو۔"

"محنت میں تو یہی سب ہوتا ہے بھائی۔"

اگلے دن رات میں آٹھ بجے وہ آوازیں لگاتے انصاری صاحب کے گھر کے سامنے سے گزرے تو انھوں نے کڑک دار آواز میں انکو کو بلایا، "ادھر آؤ ذرا..." انکو نے ان کے برآمدے میں تھیلے رکھ دیے۔ انصاری صاحب آرام کرسی پر سیدھے ہو گئے اور انکو اسٹول پر بیٹھ گئے۔

"یہ تمھیں کیا ہوتا جا رہا ہے؟"

"کیا ماس صاب؟"

"مرو گے کیا؟"

"کیا کریں ماس صاب... کوئی..."

"کیا عمر ہے تمھاری؟ چلو اندر آؤ..." انصاری صاحب انھیں لے کر اندر آ گئے۔ پھر آنگن کی لائٹ جلائی اور ایک کونے میں پڑی پرانی بچوں والی گاڑی کی طرف اشارہ کر کے بولے، "اسے لے لو۔"

"جی؟" انکو چکر میں پڑ گئے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

"چلو اٹھاؤ اسے یہاں سے۔" انصاری صاحب کی آواز میں غصہ تھا اور اس سے زیادہ محبت۔ انکو نے گاڑی باہر نکال لی۔

"اس پر سامان رکھ لو، اور رات دن نہ گھوما کرو۔"

انکو کی سمجھ میں سارا معاملہ آ گیا۔ انھوں نے دونوں تھیلے بچوں والی گاڑی پر رکھے اور ہینڈل پکڑ کر ہلکا سا دھکا دیا تو بچوں والی گاڑی چوں چر کر کے پھول جیسی آگے بڑھ گئی۔ انکو کو لگا وہ ہوا جیسے ہلکے ہیں۔ انھوں نے انصاری صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ برآمدے میں کھڑے انکو کو دیکھ رہے تھے۔

اگلے دن صبح انکو بچوں والی گاڑی کو ہینڈ پمپ پر لے گئے۔ جن لوگوں نے دیکھا، انکو سے سینکڑوں سوال کر ڈالے۔ پھر سب دھیرے دھیرے مسکرانے لگے اور پھر ہنسنے لگے۔ انکو نے جلنے والوں کی پروا نہیں کی، گاڑی کو ٹھیک سے صاف کیا، پہیوں میں تیل ڈالا اور اپنے دونوں تھیلوں کے سامان کو گاڑی پر جما دیا۔

اب صبح صبح اسٹاف کوارٹروں کے سامنے انکو کی پھٹی پھٹی آواز کہ "بازار سے سستا سامان ہے ہمارے پاس" کے ساتھ بچوں والی گاڑی کی چوں چر بھی سنائی دیتی تھی۔ کچھ لوگ دیکھ کر ہنستے اور مذاق میں کہتے، "ارے کسی کا لونڈا اکھلانا شروع کر دیا ہے کیا؟"

"ہاں دیکھ لینا، جوان ہوگا ایک دن۔" انکو گاڑی پر ہاتھ پھیرتے اور آگے بڑھ جاتے۔

ان میں کوئی شک نہیں کہ وہ سوو ہیٹ، گریبان سے پھٹی قمیض اور میلا پاجامہ پہنے، سفید داڑھی لٹکائے، اس گاڑی کو کھینچتے کافی عجیب لگتے تھے۔ لیکن وہ خوش تھے، اب وہ اور زیادہ محنت کر سکتے تھے۔

گاڑی آنے کے بعد پھر وہی سب کچھ شروع ہو گیا۔ انھوں نے جان توڑ محنت شروع کر دی تھی، لیکن پتا نہیں ایک دن کیا ہوا کہ لوگوں نے ان کے چہرے پر عجیب طرح کی مجبوری اور چال میں کافی لڑکھڑاہٹ دیکھی۔ اب ان کی آواز بھی اسٹاف کوارٹروں کے سامنے اتنی نہیں سنائی پڑتی تھی۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے گاڑی کھینچتے گزر جاتے۔ لیکن ان کے گھر سے باہر نکلنے اور لوٹنے کا وہی پرانا وقت تھا۔

انکو میں آئی اس تبدیلی کو ان کی بھوجائی ہی جانتی تھی، کیونکہ اسی کے سامنے ایک دن انکو نے اپنی دن بھر کی کمائی گنی تھی — ساڑھے سات روپے، جس میں روپے سے زیادہ کا منافع نہیں تھا۔ ساڑھے سات روپے ان کے سامنے رکھے تھے اور کٹورے میں دال اور دو روٹیاں رکھی تھیں۔ وہ کسی بھی چیز کو نہیں دیکھ رہے تھے۔ آج کاروبار کرتے ہوئے ان کو دو سال ہو گئے تھے۔ وہ کافی دیر تک کچھ سوچتے رہے۔ پھر پاس بک اٹھا لائے۔ اس میں اب صرف ایک روپیہ پڑا تھا۔ ایک کی گنتی کبھی پھیل کر ایک لاکھ لگنے لگتی، کبھی ایک، صرف ایک پیسہ لگنے لگتا۔ لیکن وہ ایک تھا ایک روپیہ ہی۔ اسے بھی وہ کافی دیر تک دیکھتے رہے۔ بھوجائی نے اس بیچ کئی بار کہا کہ کھانا کھا لو، لیکن انھوں نے ان سنا کر دیا۔

وہ دھیرے دھیرے اٹھے، بچوں والی گاڑی کے پاس آئے اور سامان کی پڑیاں نکال نکال کر دیکھنے لگے۔ سارا سامان زمین پر ڈھیر کر لیا اور پھر قاعدے سے دوبارہ سامان گاڑی میں لگایا۔ گاڑی کو صاف کیا۔ پھر آکر چولھے کے پاس بیٹھ گئے اور کھانا کھایا۔

اسی واقعے کے بعد سے ان کی چال ڈھیلی پڑ گئی اور ان کا چہرہ اور زیادہ جھک گیا۔ انھوں نے صبح کا کھانا ٹال دیا تھا۔ دن میں ایک ہی سے کھاتے اور دن بھر پھیری لگاتے رہتے۔ بھوک اور دھوپ میں کبھی کبھی انھیں غصہ بھی آجاتا۔ ایک دن غفور نے ان سے نمک مانگا۔ انھوں نے پسے نمک کا پیکٹ دے دیا۔ غفور نے کہا: "نہیں، ٹاٹا کا نمک دو۔" انگنو بگڑ گئے: "کیا فرق ہے اس میں اور ٹاٹا کے نمک میں؟ دونوں نمک ہیں۔ لینا ہے لو، نہیں تو واپس کر دو۔" غفور نے نمک کا پیکٹ لوٹا دیا اور انگنو بڑبڑاتے گاڑی آگے گھسیٹ لے گئے۔ ان کا بڑبڑانا جاری رہا۔ "کیسے کیسے لوگ ہیں، نمک نمک میں فرق پیدا کرتے ہیں۔ ارے یہ بھی نمک ہے، وہ بھی نمک ہے۔ دونوں کو کھانے میں ڈالو تو نمکین ہو جائے گا... کیا زمانہ آگیا ہے۔ ارے ہمارے زمانے میں یہ سب خرافات نہیں تھی۔ سیدھا سادھا کام ہوتا تھا اور سیدھی سادی چیزیں تھیں... عجیب لوگ... ارے تمھارے گھر کے سامنے آکر سامان بیچ رہے ہیں۔ اگر دکان تک جاتے تو ٹائم لگتا کہ نہ لگتا؟ لیکن کیسے کیسے منھ بناتے ہیں۔ اسی دن کی تو بات ہے... تیواری کہنے لگے... ایک تو ڈبل روٹی ہے تمھارے پاس، کیا لیں... جیسے سو پچاس خریدنی ہوں گی انھیں۔ عادت تو یہ پڑ گئی ہے کہ سامان کا ڈھیر لگا ہو اور ٹھونک بجا کر اس میں سے ایک چیز لے لیں۔ اب ہم تو اتنا سامان گاڑی پر نہیں رکھ سکتے... کیوں ہے نا؟" انھوں نے بچوں والی گاڑی سے پوچھا۔ گاڑی دھیرے دھیرے آگے کھسکتی رہی۔ انگنو گاڑی کے ہینڈل پر کافی جھک آئے تھے۔ اب ان کا آدھا بوجھ گاڑی اٹھایا کرتی تھی۔

اکتوبر کی ایک بہت پیاری شام تھی اور انگنو اسٹاف کوارٹر کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ انصاری صاحب کے برآمدے میں، جہاں گرمیوں میں وہ اکثر بیٹھ کر ستایا کرتے تھے، وہ بیٹھ گئے۔ آنکھیں دھیرے دھیرے بند ہونے لگیں۔ ان کے جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا تھا۔ وہ بیٹھے رہے۔ انصاری صاحب لوٹے تو انگنو برآمدے کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور بچوں والی گاڑی نیچے

Scanned with CamScanner

کھڑی تھی۔ انکو کو انھوں نے کئی آوازیں دیں تو انکو نے آنکھیں کھول دیں۔

"کیا بات ہے، کیسے ہو؟"

"ٹھیک ماس صاب۔" انکو نے اٹھنے کی کوشش کی اور ان کا سولو ہیٹ سر سے گر گیا۔

"بیٹھے رہو، بیٹھے رہو۔" انصاری صاحب پوری بات سمجھ چکے تھے۔ وہ اندر چلے گئے اور دن کی بچی روٹی اور آلو کی ترکاری انکو کے سامنے رکھ دی۔ انکو نے روٹی اور آلو کی ترکاری کی طرف دیکھا۔

"نہیں ماس صاحب، بھوک نہیں ہے۔"

"بکواس مت کرو۔ کھانا ٹھکراتے نہیں ہیں۔ اللہ کو برا لگتا ہے۔"

انکو نے کھانا شروع کر دیا۔ دانت سب نہیں تھے۔ دھیرے دھیرے وہ نوالے نگلنے لگے۔ انصاری صاحب نے ایک گلاس میں چائے سامنے رکھ دی۔ انکو نے کھا کر چائے پی تو تھوڑی دیر کے لیے پیٹ میں میٹھا میٹھا درد ہونے لگا۔ پھر ان کی آنکھیں بڑی ہو گئیں۔ ہاتھوں پیروں میں جان آ گئی اور وہ گاڑی کو ٹھیلتے ہوئے گھر آ گئے۔

اس واقعے کے بعد انھوں نے گھر میں بھوجائی سے بولنا کم کر دیا اور انصاری صاحب کے گھر کے سامنے والا راستہ چھوڑ دیا۔ اب وہ تیواری کے گھر کے سامنے تک آتے اور بائیں ہاتھ والی گلی سے نکل جاتے۔ دکان کا سامان دھیرے دھیرے ختم ہو رہا تھا۔ رجو کہتا تھا، "انکو دادا، لگے رہو، ایک نہ ایک دن کامیابی ہوگی۔ ارے یہی منو جو ہمارے تمھارے سامنے گدھوں پر ریتا لاد کر بیچا کرتا تھا، آج پورے گھاٹ کا ٹھیکہ لیتا ہے۔ اب اسے کوئی منو تھوڑی کہہ سکتا ہے — کہلاتا ہے حاجی منیر الدین۔" انکو ماتھے کا پسینہ پونچھتے سب سنا کرتے تھے۔ رجو یہ جو کچھ انکو سے کہتا تھا اس پر اس کا کوئی یقین نہیں تھا، کیونکہ وہ انکو کے مقابلے میں زیادہ پریکٹیکل یعنی جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ رہ چکا تھا۔ اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ حاجی منیر الدین عرف حاجی منوندی کے اس پار سے شراب کا ناجائز کاروبار کرتے ہیں۔

انکو اپنی نئی عادت کے مطابق انصاری صاحب کے گھر کے سامنے والا راستہ کاٹ کر نکل رہے تھے کہ انصاری صاحب نے انھیں دیکھ لیا۔ آواز دے کر بلایا۔ انکو ان کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ان کو لگا جیسے پوری دنیا میں انصاری صاحب ہی ان کے راز کو، ان کی کمزوری اور کامیابی کو

جانتے ہیں۔

"سنو، کدھر جا رہے ہو؟" انصاری صاحب نے پوچھا۔

"کالج جا رہے ہیں۔"

"اسکول سے اجو کو لیتے آنا۔ چھٹی ہو گئی ہو گی۔ کیا بتائیں، یہ بیچ والی سڑک نہ ہوتی تو بچوں کو آنے میں کوئی مشکل نہ ہوتی۔"

انکو بچوں کے اسکول گئے اور اجو کو گھر پہنچا دیا۔

"انکو میاں، تم تو اسکول کی طرف سے ہی آیا جایا کرتے ہو۔ میرے خیال سے دن میں سینکڑوں چکر لگاتے ہو گے۔"

"جی ماس صاب۔"

"تو اجو کو صبح اسکول چھوڑ دیا کرو۔ دوپہر کو یہاں واپس پہنچا دیا کرو۔"

اگلے دن سے انکو اجو کو اسکول چھوڑنے جانے لگے۔ اجو کے کئی دوست جو آس پاس کے کوارٹروں میں رہتے تھے، کبھی کبھی ساتھ ہو جاتے۔ انکو بچوں کو اسکول چھوڑتے اور دوپہر کو اسکول سے گھر پہنچا دیتے۔ بچے اکثر ان سے کمپٹ، ٹافی، کھٹی مٹھی ٹکیاں بھی خرید لیتے تھے۔ لائن سے بنے اسٹاف کوارٹروں میں بچوں کو چھوڑتے آگے بڑھ جاتے۔ اسٹاف کوارٹروں میں رہنے والے لوگ اتنے گرے ہوئے نہیں تھے کہ وہ انکو کے اس احسان کا اُتارا نہ کرتے۔ وہ لوگ کبھی انکو کو چائے پلا دیتے، گرمی ہوتی تو فرج کا ٹھنڈا پانی دے دیتے، ایک آدھ قمیض دے دیتے، کبھی کوئی سامان خرید لیتے۔ لیکن انکو اس سب سے خوش نہیں تھے۔ ان کے پاس اب جو چیزیں بچی تھیں وہ کافی پہلے کی خریدی ہوئی تھیں اور ان پر مکھیوں کے بیٹھنے کے داغ پڑ چکے تھے اور زیادہ یا نیا سامان خریدنے کے پیسے نہ تھے، لیکن پھر بھی ان کی بچوں والی گاڑی کی چوں چر چوں اسٹاف کوارٹروں کے سامنے صبح سے لے کر رات آٹھ بجے تک سنائی دیتی تھی۔

دوپہر کو وہ تیواری جی کے کوارٹر کے سامنے سے گزر رہے تھے کہ تیواری جی نے اپنی کھڑکی سے

انھیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ انکو سائے میں گاڑی کھڑی کر کے اندر گھسے۔ قمیض کے دامن سے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور سولو ہیٹ کو برآمدے میں چھوڑ کر کمرے میں چلے آئے۔

''تمھارے پاس لیکو جن پاؤڈر ملک ہے؟'' تیواری جی نے ان سے پوچھا۔ انکو ہی کو نہیں، تیواری جی کو بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ چلتی پھرتی دکان میں لیکو جن ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ تیواری جی کو یہ بھی معلوم تھا کہ انکو کبھی کسی سامان کے لیے انکار نہیں کرتے۔ اگر ان کے پاس نہیں ہوتا تو لالہ کی دکان سے لا دیتے ہیں تاکہ گاہک ٹوٹ نہ جائیں۔ پیسے بھی وہی لیتے ہیں جو لالہ لیتا ہے۔

''ہے تو نہیں ماس صاحب، لیکن مل جائے گا۔'' تیواری کے چہرے پر سکوت طاری ہو گیا لیکن انکو پھر بھی کھڑے ہی رہے تو تیواری بھانپ گئے۔

''پیسے دے دوں۔'' تیواری جی نے بیس کا نوٹ انکو کی طرف بڑھا دیا۔ انکو لالہ کی دکان گئے، لیکو جن اور باقی پیسے لا کر تیواری جی کو دے دیے۔

تیواری جی نے پچیس پیسے کا سکہ انکو کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا، ''تمھارا منافع۔''

''نہیں جی، منافع کیسا۔ ہماری دکان میں سامان نہیں تھا تو آپ کو لا دیا۔'' انکو پیسے لیے بنا آگے بڑھ گئے۔

محلے کے لوگوں کا رویہ اب انکو کی طرف بدل گیا تھا۔ یا تو وہ انکو کے سامنے ان کی خوب تعریف کرتے یا ان سے ہمدردی جتلاتے۔ کچھ لوگ اکثر انھیں دیکھ کر ایک دوسرے سے ایسی باتیں کرتے جو انھیں تیر کی طرح لگتیں۔ دن بھر دھوپ اور گرمی میں گاڑی چلاتے چلاتے وہ ان باتوں کو ہنسی میں نہیں اڑا سکتے تھے۔ رحمت انھیں دیکھ کر کہتا تھا، ''اوپری کام کچھ اور...'' پھر وہ بڑی تیکھی ہنسی ہنستا تھا۔ انکو جلدی جلدی آگے بڑھ جاتے۔ تارا چند، جو جانوروں کی دلالی کرتا تھا، کہتا، ''بھگوان سب کرا لے، بھیک نہ منگوائے۔'' انکو جانتے تھے یہ سب باتیں یہ لوگ انھی کے بارے میں کہتے ہیں، لیکن پھر بھی وہ کسی کو جواب نہ دے سکتے تھے، لڑ نہیں سکتے تھے۔ وہ چپ چاپ سنتے اور جلدی جلدی محلے والی گلی سے گزر جانے کی کوشش کرتے۔ آج وہ گلی کے موڑ پر پہنچے ہی تھے کہ سامنے سے رحمت آتا دکھائی دیا۔ ''اب ناٹک کرو بند، کسی کے گھر برتن مانجھا کرو۔'' اس نے یہ بات اس طرح کہی

تھی جیسے انکو سے اس کا کوئی مطلب نہیں ہے، لیکن تھا اس کا مطلب انکو ہی سے۔ انکو کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ انھوں نے سوچا، جب تک چپ رہو گے، یہی ہوگا۔ وہ گاڑی روک کر کھڑے ہو گئے اور رحمت سے بولے، "سالے، مر بھی جاؤں تو تیرے باپ کے برتن نہیں مانجھ سکتا۔"

"کیا بے؟ کیا بک رہا ہے؟ تجھ سے کیا کسی نے کہا؟"

انکو کو جھنجھلاہٹ سوار ہو گئی۔ "خون پی لوں گا سالے!" وہ رحمت کی طرف بڑھے۔

"ابے ہٹ بڑھے — ہوا سے لڑتا ہے سالا! تجھ سے کوئی کچھ بولا بھی نہیں اور ہونے لگا کلا بتو۔"

محلے کے چار چھ لوگ اور جمع ہو گئے۔ سب انکو کو سمجھانے لگے کہ رحمت نے ان سے نہیں کہا۔ انکو غصے میں کھڑے کانپ رہے تھے اور وہ سب ہنس رہے تھے۔ انکو نے کہا، "اچھا، تو اب ہم جو کہتے ہیں، کسی کو نہیں کہتے۔" پھر وہ آسمان کی طرف منہ اٹھا کر زور زور سے چیخنے لگے، "سالو، حرامیو، گدھے کی اولادو، اپنی اپنی اماں کے خصمو..." وہ گالیاں بکنے لگے۔ محلے والے غصہ کے لگا کر ہنسنے لگے۔ لونڈے تالیاں پیٹنے لگے اور جمع ہو گئے۔ دو ایک نے انکو کو سمجھایا تو وہ گاڑی لے کر اسٹاف کوارٹروں کی طرف چلے گئے۔

اس واقعے کے بعد انکو اور محلے کے ان لوگوں کے بیچ جو وہاں کے سماجی جیون کو چلایا کرتے تھے، ایک نفرت بھرا مقابلہ شروع ہو گیا تھا۔ چودھری کا لڑکا انکو کو سامنے سے آتے دیکھ کر "لولو، لولو!" کہہ کر ہنستا۔ انکو چپ چاپ نفرت اپنے دل میں دبائے آگے بڑھ جاتے۔ رحمت تو اب روز ہی ان کو سامنے سے گزرتا دیکھ کر "برتن مانجھ، برتن مانجھ!" چلایا کرتا تھا۔ غفور اس ڈھنگ سے ہمدردی دکھاتا کہ انکو جلدی ہی سمجھ جاتے کہ وہ ان کو ذلیل کر رہا ہے۔ وہ غفور کی باتوں کو بھی پی جاتے۔

کالج کے اسٹاف روم میں ایک دن تیواری جی نے بات نکل آنے پر انکو کی بڑی تعریف کی اور اشارتاً یہ بھی بتا دیا کہ انکو سے آپ ایڈوانس پیسے دے کر وہ سامان بھی منگا سکتے ہیں جو اس کی دکان میں نہیں، لالہ ہردیال کی دکان میں ملتا ہے۔ انکو کی یہ خوبی معلوم ہوتے ہی ان کی قدر اسٹاف کوارٹروں میں بڑھ گئی۔ پہلے ایسا سامان منگایا جانے لگا جو لالہ ہردیال کی دکان میں ملتا تھا، پھر ایسا

سامان بھی لوگ ان سے مانگنے لگے جو دوسری دکانوں میں ملتا۔ کوئی چٹ پٹ کے بٹن مانگتا، کوئی بکری کا گوشت، کوئی پاؤ بھر آلو، کوئی مٹی کا تیل۔ انکو انکار نہ کر پاتے۔ چائے پینے کے بعد یا ایسا ہی کوئی دوسرا کرم کرنے کے بعد کوئی انکار کیسے کر سکتا ہے؟ اور پھر پھیری تو لگاتے ہی رہتے ہیں، اگر کسی کا سامان لا دیا تو کون سے پیر گھس جائیں گے۔

اور آج وہ سب کر کے آگے بڑھے ہی تھے کہ سامنے سے ملا جی آتے دکھائی پڑے۔ ملا جی کے ایک ہاتھ میں تسبیح تھی اور دوسرے ہاتھ میں اپنی بکری کی زنجیر پکڑے ہوئے تھے۔ بکری ممیا رہی تھی اور ملا جی کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ شاید کوئی دعا پڑھ رہے تھے۔ ملا جی محلے کی مسجد میں نماز قرآن پڑھاتے تھے۔ ہر گھر سے چار آنے مہینہ ملتا تھا۔ انکو ملا جی کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے تو انھوں نے سوچا، شاید پچھلے اور اس مہینے کی چونی دینا چاہتا ہے، اس لیے تسبیح پر ان کے ہاتھ تیزی سے چلنے لگے اور ہونٹوں کے ہلنے کی رفتار تیز ہو گئی۔ ان کے سامنے سولہ ہیٹ، ماتھا پسینے سے بھیگا اور بے ترتیب سفید داڑھی، بجھی ہوئی آنکھوں اور چاک گریبان کی قمیض پہنے انکو کئی منٹ تک چپ چاپ کھڑے رہے۔ وہ ملا جی کی دعا ختم ہو جانے کا انتظار کر رہے تھے۔

"سلام علیکم،" ملا جی چہرے پر دونوں ہاتھ پھیر کر بولے۔

"والیکم۔"

"کیا ہے انکو، تم سے پچھلے مہینے کے پیسے بھی نہیں ملے۔"

"آپ ہمارے لیے دعا نہیں کرتے ملا جی؟"

"دعا؟ دعا تو میں پورے محلے کے لیے کرتا ہوں۔"

"تو ہمارے اوپر نہیں لگتی..."

"لاحول ولا قوۃ، کیا کفر بک رہے ہو! اللہ رحیم ہے۔ سب کے سروں پر اس کا ہاتھ ہے۔"

ملا جی کی یہ بات سن کر انکو نے سولہ ہیٹ سر سے اتار لیا۔

"کچھ کام بنا نہیں ملا جی،" انکو بولے۔

"بنے گا، بنے گا، ہمت نہ ہارو۔ ہمتِ مرداں مدد خدا۔ یعنی مطلب یہ ہوا کہ مردوں جیسی ہمت رکھو، خدا مدد کرے گا۔"

''تو ہماری مردوں جیسی ہمت نہیں ہے ملا جی؟'' انکو کے اس سوال پر ملا جی نے پیسے مانگنے والا خیال چھوڑ دیا اور بولے: ''اچھا کل صبح مسجد آ جانا۔ ایک تعویذ بنا دیں گے۔ پھر دیکھنا۔ اللہ نے چاہا تو سب تکلیفیں...'' اور ملا جی میاں کی بکری کو گھسیٹتے راستہ کاٹ کر آگے بڑھ گئے۔

انکو اگلے دن صبح مسجد گئے اور تعویذ لے آئے۔ پھر اپنے کام پر نکل گئے۔ ڈاکٹر داس نے کل ہی ان سے کہہ دیا تھا کہ ان کی میم ساب اور بچے چھٹی میں گھر جا رہے ہیں، کچھ سامان کی ضرورت ہے۔ وہ بچوں کو اسکول چھوڑ کر ڈاکٹر داس کے گھر جا رہے تھے کہ انصاری صاحب کی بیوی نے انھیں آواز دے دی۔ وہ اندر گئے۔ وہ انصاری صاحب کے ناشتے دان میں کھانا رکھ رہی تھیں۔

''انکو میاں، آج انصاری صاحب گھر نہیں آئیں گے۔ یہ ان کا کھانا ہے۔ کالج میں انھیں دے دیجیے گا۔'' انکو نے ناشتے دان بچوں والی گاڑی پر رکھ لیا۔ ڈاکٹر داس کا سامان خرید کر ان کو پہنچایا۔ لوٹتے ہوئے کالج میں انصاری صاحب کا کھانا دے دیا۔ وہاں تیواری جی بھی بیٹھے تھے۔ انھوں نے کہا: ''انکو میاں، پلیز کل سے ہمارا بھی کھانا آپ ہی لیتے آیئے گا۔''

متین صاحب نے کہا: ''انکو میاں، جب آپ دو کھانے لایئے گا تو میں نے کیا غلطی کی ہے۔ میرے اوپر بھی احسان کیجیے گا۔''

انکو ان دنوں پریشان تھے۔ کارن صاف تھے۔ صبح صبح جب وہ بچوں والی گاڑی گھسیٹتے محلے سے نکلتے تو کوئی ان کی تاک میں تو نہ بیٹھا ہوتا، لیکن روز ہی ایسا آدمی مل جاتا جو ''برتن ما نجھو!'' یا ''لولو، لولو!'' کہہ کر ان کو چھیڑ دیتا۔ وہ بڑبڑانے لگتے۔ پھر یہ بڑبڑانا دن بھر جاری رہتا۔ ان کا بڑبڑانا دھیرے دھیرے تیز ہوتا گیا، اور اس میں گالیوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ ایسا لگنے لگا جیسے وہ سب کو گالیاں دیتے ہیں۔ لیکن اس سے ان کے کام پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ دوپہر کو کالج کے لوگوں کو کھانا پہنچاتے اور پھر پھیری پر نکل جاتے۔ اسٹاف کوارٹروں والے انکو کی شخصیت میں چھپی خوبیوں کی تلاش میں لگے رہے۔ وہ لاوارث گائے ہو کر رہ گئے تھے جس کا مالک کوئی نہیں تھا، پھر بھی بہت سے تھے۔

ایک دن ڈاکٹر داس کے گھر کے سامنے سے انکو نکل رہے تھے تو ڈاکٹر داس نے انھیں پکار لیا۔ انھیں کچھ حیرت ہوئی، کیونکہ ڈاکٹر داس نے اس سے پہلے انھیں کبھی نہیں بلایا تھا، بلکہ وہ تو انکو کو دیکھ کر بڑا برا منھ بناتے تھے۔ انکو برآمدے میں چڑھے تو ڈاکٹر داس نے ان سے کہا: ''تم آج رات ہمارے

Scanned with CamScanner

ساتھ کھانا کھاؤ۔ آٹھ بجے آجانا۔" انکو کی چھاتی پھول گئی۔ نہ سہی پیسہ ان کے پاس، عزت تو ہے۔ وہ رات آٹھ بجے ڈاکٹر داس کے گھر پہنچے تو ڈاکٹر داس کھانا کھا چکے تھے انکو کا کھانا کچن میں رکھا تھا۔ ڈاکٹر داس کے بچے چھٹیوں پر گھر جا چکے تھے۔ انکو نے کچن میں بیٹھ کر کھانا کھایا اور اپنی جوٹھی پلیٹوں کو صاف کرنے لگے تو ڈاکٹر داس نے آکر ان سے کہا، "انکو کچھ برتن اور بھی ہیں۔" انکو نے سارے برتن صاف کر دیے۔

دھیرے دھیرے وہ جھاڑو بھی لگانے لگے۔ دوسرے ٹیچروں کو ڈاکٹر داس پر غصہ آیا۔ خاص طور پر انصاری صاحب کو، کیونکہ وہ اپنے آپ کو انکو میاں کا 'گارجین' قسم کی چیز سمجھتے تھے۔ انھوں نے انکو سے کہا، "تم دن کا کھانا ہمارے ساتھ کھایا کرو۔" پھر تو انکو کی آؤ بھگت ہونے لگی۔ کسی نے روز صبح کی چائے پینے کی دعوت دے ڈالی تو کسی نے روز شام چار بجے بلانا شروع کر دیا۔ پھر آپس میں مقابلہ شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر داس نے ایک دن انکو کو کھانا ہی نہیں کھلایا، گھر لے جانے کو روٹی بھی دے دی۔

یہ سب ہوتا رہا، لیکن بچوں والی گاڑی ان سے نہیں چھوٹی اور انھوں نے کاروبار بند بھی نہیں کیا۔ ہاں، اب ان کی گاڑی میں سامان سے زیادہ ناشتے دان ہوتے تھے۔ لالہ کی دکان سے لایا ہوا نوکوں کا سامان ہوا کرتا تھا۔ اور جب ان کے ساتھ کوئی نہ ہوتا تو اپنی نئی عادت کے مطابق بچوں والی گاڑی سے بات چیت کرتے گھومتے رہتے۔

رات کے نو بجے وہ ڈاکٹر داس کے یہاں 'کھانا کھا کر' لوٹ رہے تھے۔ ستمبر کے آخری دنوں کی رات تھی۔ انھوں نے اسٹاف کوارٹروں سے 'محلے جانے والا شارٹ کٹ والا راستہ پکڑ لیا۔ گاڑی سے وہ باتیں کر رہے تھے، "دیکھو میں نے بڑی دنیا دیکھی ہے۔ چار سال کا تھا تو باپ مر گیا۔ بھائی، کہاں سے پڑھتا؟ کھانے کو نہیں تھا! پھر میں اِدھر اُدھر کام کرتا رہا۔ پھر اسکول کی نوکری مل گئی... تم نے میرا ساتھ بھی خوب دیا۔" انکو بچوں والی گاڑی کے ہینڈل پر لدے ہوئے تھے۔ ان کے بوڑھے پیر گھسٹ رہے تھے۔ سولو ہیٹ وہ رات میں بھی نہیں اتارتے تھے۔ کچی سی پگڈنڈی پر بجلی کے کھمبے کسی چناؤ میں لگے تھے، لیکن اب ان میں سے ایک ہی دو میں بلب تھے۔ راستہ کافی سنسان تھا۔ بچوں والی گاڑی آگے بڑھتے بڑھتے رک گئی۔ شاید سامنے والے پہیے کے سامنے کوئی اسٹف آ گئی تھی۔ "کیوں،

Scanned with CamScanner

رک کیوں گئی ہو؟ گھر نہیں چلو گی کیا؟ کل تمہاری صفائی بھی کر دیں گے۔" انھوں نے ہینڈل پر زور ڈالا۔ پہیہ اینٹ پر چڑھ گیا اور بچوں والی گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ آگے ڈھلان تھا۔ ہینڈل انکو کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ اپنے ہی زور سے آگے گرے۔ سولو ہیٹ اندھیرے میں گر پڑا اور ان کا سر بجلی کے کھمبے سے ٹکرایا۔ گنجے سر سے خون رسنے لگا۔ انکو نے دونوں ہاتھ اور پیر چلائے لیکن اٹھ نہ سکے۔ ان کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ دھیرے دھیرے گاڑھا خون ان کی ماتھے کی لکیروں میں آڑا ترچھا بہنے لگا، پھر سفید داڑھی تک آ گیا۔ کچھ ہی فاصلے پر گاڑی الٹی پڑی تھی۔ بچا کھچا سامان بکھر گیا تھا اور الٹی پڑی بچوں والی گاڑی کا ایک پہیہ گھوم رہا تھا۔ دیر اتنی ہو چکی تھی کہ اب اس راستے سے کسی کے گزرنے کا امکان نہیں تھا۔

❁❁

٦٥

قیمت
۱۴۰ روپے

آج کی کتابیں

۳۱۶ مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ،
صدر، کراچی ۷۴۴۰۰

Scanned with CamScanner